یکے از مطبوعاتِ بزمِ اقبال لاہور

ذکرِ اقبال

عبدالمجید سالک

بزمِ اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

یکے از مطبوعات بزمِ اقبال لاہور

ذکرِ اقبال

عبدالمجید سالک

بزمِ اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

ذکرِ اقبال

طبع دوم : مئی ۱۹۸۳ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
اعزازی سیکریٹری بزم اقبال ، لاہور

مطبع : مکتبۂ جدید پریس ، شارع فاطمہ جناح ، لاہور

طابع : رشید احمد چودھری

قیمت : ۳۰ روپے

فہرس

عرضِ حال

انسانوں نے اپنی محبوب شخصیّتوں کے حالات و کوائف کی یاد کو محفوظ رکھنے میں ھمیشه اهتمام کیا ہے - ان کی ھمیشه یه کوشش رھی ہے که پیشوایانِ مذاھب ، اولیاء الله ، سلاطین و فاتحین ، قائدین و مصلحین ، آدباء و شعراء اور جلیل القدر اہلِ علم کے متعلق زیاده سے زیاده معلومات فراهم کریں تا که آن نسلوں کی تشنگیٔ معلومات فرو هو جنهیں آن اکابر کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا - انسان کا یه ایک فطری خاصّه ہے که وه گزرے ہوئے اکابر کا ذکر سن کر بے اختیار که اٹھتا ہے که کاش میں بھی آن کے زمانے میں ہوتا ! یہی معیت و رفاقت کی خواهش ہے جس نے سوانح عمری کو جنم دیا اور وهی سوانح عمری سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحبِ سوانح کی شخصیّت کے متعلق زیاده سے زیاده تفصیل درج هو اور آن تمام جزئیات کا تذکره کیا جائے جن کو پڑھ کر اس شخصیّت کا بولتا چالتا تصوّر پڑھنے والے کے ذهن میں آجائے - بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے که دنیا بھر میں صرف پیغمبرِ اسلام صلّی الله علیه و سلم کی شخصیت هی ایسی ہے جو کروڑوں نہیں بلکه اربوں انسانوں کی قلبی محبت کا مرکز رهی ہے اور اب تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں هوا جس کی محبوبیت کا دائره اتنا وسیع هو - اس کائنات میں بڑے بڑے انبیاء ، اولیاء ، اوتار ، رشی اور دوسرے بڑے آدمی گزرے هیں ، لیکن آنحضرت صلعم کا مقامِ محبوبیت ان سب سے بلند تر ہے اور یہی وجه ہے که مسلمانوں نے آن کے اقوال و افعال کے تذکروں کی فراهمی میں صدیوں تک محنت کی ہے جس کا نتیجه یه هوا ہے که آن کی حیات طیّبه کے ایک ایک لمحے کا ریکارڈ محفوظ اور مدوّن هو چکا ہے - دنیا کی کوئی شخصیّت اس اعتبار سے آنحضرت پر فوقیت لے جانا تو در کنار، آن کے قریب تک بھی نہیں پہنچ سکی - اس امتیاز کی ایک وجه تو شخصیّت کی

محبوبیت ہے اور ہر مسلمان کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ تاسف پیدا ہوتا ہے کہ افسوس! ہم آنحضرت کے زمانۂ اقدس میں نہ ہوئے۔ چناں چہ سیرت نگاروں اور محدّثوں نے اسی عام تشنگی کو بجھانے کے لیے آنحضرت صلعم کے زیادہ سے زیادہ ذاتی و شخصی حالات فراہم کردیے تاکہ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں اس محبوب شخصیت کا ایک پسندیدہ تصوّر قائم ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مومنوں کو بار بار ہدایت فرمائی ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب بننا چاہو تو رسول اللہ صلعم کا اتّباع کرو اور انھیں کی زندگی تمھارے لیے اسوۂ حسنہ ہے، یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و کوائف کی فراہمی صرف سوانح عمری کی تسوید کے تقاضے ہی سے نہیں کی گئی بلکہ اس کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ مسلمان ان احوال پر اطلاع پا کر اپنی زندگیوں کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ چوں کہ اتباعِ سنّت کا حق اُس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک سنّت کامل و مکمل طور پر محفوظ نہ ہو جاتی لہٰذا حضرت صلعم کے سوانح حیات کی ترتیب میں وہ اہتمام کیا گیا جو پوری تاریخِ عالم میں اب تک بےمثال ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو مخصوص ہے، ان کے حالات تو جذباتِ محبت کی تسکین، فقدانِ معیت و رفاقت کی تلافی اور اتباعِ سنّت کے ساز و سامان کی فراہمی کی غرض سے جمع کیے گئے لیکن عمومی حیثیت کے بڑے انسانوں کی سوانح عمریاں زیادہ تر حصولِ معلومات کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ بلا شبہ بعض شخصیتوں کے ساتھ بےشمار انسانوں کو کسی قدر روحانی وابستگی بھی ہوتی ہے لیکن عام طور پر گزرے ہوئے بڑے آدمیوں کے حالات محض دلچسپی اور معلومات کی غرض سے سنے جاتے ہیں۔ جب کوئی زیادہ عمر کا آدمی نوجوانوں کے کسی مجمع میں کسی ایسے بڑے آدمی کے حالات و عادات کی کہانی سناتا ہے جس کے ساتھ اس کی عمر کا کچھ حصہ گزرا ہے تو نوجوان نہایت ذوق و شوق سے اس کہانی کو سنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ

اس کہانی کے بعض مخصوص اور مؤثر حصے نوجوانوں کے دماغوں میں نہایت گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں جس کا اثر اُن کے اخلاق واحوال پر ضرور پڑتا ہے، خواہ وہ غیر شعوری ہی کیوں نہ ہو۔

جب ”بزمِ اقبال“ نے مجھے حکم دیا کہ میں علامہ اقبال کے سوانح حیات مرتّب کروں تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ جس شخص کی زندگی علی العموم گوشہ نشینی اور خلوت گزینی میں بسر ہوئی اور جو دنیا و مافیہا سے بےپروا آغاز سے انجام تک اپنے فکر ہی کی دنیا میں سرگرداں رہا، اُس کی زندگی کے واقعات ایک مقالے کی صورت میں مرتّب ہو سکیں تو ہو سکیں، ایک پوری کتاب کا مواد کیوں کر مہیّا ہوگا، لیکن چوں کہ مجھے خود بھی چوتھائی صدی تک براہِ راست علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا ہے اور علامہ کے احباب، اعزّہ، مداحین اور ملاقاتیوں سے بھی شناسائی رہی ہے اس لیے رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ علامہ کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر اب تک کما حقہٗ روشنی نہیں ڈالی گئی، لیکن وہ پہلو یقیناً ایسے ہیں جو اہلِ عالم کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہنے چاہئیں۔ چناں چہ میں نے کتاب لکھنے کی ہامی بھرلی لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ میری کتاب علامہ اقبال کی محض سوانح عمری ہوگی، ان کی شاعری، ان کے فلسفے اور ان کی تعلیمات پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور مزید لکھی جائیں گی لیکن سوانح حیات گزشتہ سترہ سال کے دوران میں کسی نے بھی مرتّب نہیں کیے۔ میں اپنی اہلیت و استطاعت کے مطابق اس کام کو انجام دے دوں گا؛ فلسفے وغیرہ پر تبصرے کے لیے کوئی اور انتظام کر لیجیے۔ قارئینِ کرام کو یہ دیکھ کر وحشت نہ ہونی چاہیے کہ اقبال پر یہ کیسی کتاب ہے جس میں ان کے فکر کا کوئی تذکرہ ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ میرا دائرۂ کار صرف سوانح نگاری تھا اور میں نے اسی دائرے کے اندر رہ کر یہ کتاب لکھی ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں ایک خوش خبری بھی عرض کر دوں کہ ڈاکٹر

خلیفه عبدالحکیم جو ایک اعلیٰ درجے کے فلسفی اور نقاد سخن ہونے کے علاوہ علامه کے مدۃ العمر کے عقیدت مند احباب میں سے ہیں ، علامه کے شعر و فلسفه پر ایک کتاب مرتّب کر رہے ہیں جو عنقریب شائع ہونے والی ہے ۔

اس کتاب کی ترتیب میں مجھے جن ذرائع و وسائل سے امداد ملی، ان کا ذکر نه کرنا پرلے درجے کی ناشکرگزاری ہوگی ۔ مولانا مہر اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے علامه کے احباب اور ملنے والوں سے ملاقات کر کے جو معلومات فراہم کیں، اُن سے میں نے بڑا کام لیا ۔ ڈاکٹر خلیفه عبدالحکیم اور جسٹس ایس ۔ اے رحمان نے نہایت قیمتی مشورے دیے اور بعض بیانات کی ذمه دارانه تصحیح کی تکلیف گوارا فرمائی ۔ میں ان حضرات کا تہِ دل سے ممنونِ احسان ہوں ۔ کتابوں میں سے مجھے "حیاتِ اقبال" (تاج کمپنی) ، "مکاتیبِ اقبال" (شیخ عطاءاللہ) ، "ملفوظاتِ اقبال" (محمود نظامی) ، "اقبال کا سیاسی کار نامه" (محمد احمد) ، "روزگارِ فقیر" (سید وحیدالدین) ، "سیرت اقبال" (طاہر فاروق) "حرفِ اقبال"، "خطوطِ اقبال بنام جناح"، "خطوطِ اقبال بنام عطیه فیضی"، "اقبال کا مطالعه" (سید نذیر نیازی) اور بعض دوسری مطبوعات سے استفادہ کا موقع ملا ۔ ان سب کا ذکر بطور اظہارِ امتنان ضروری سمجھتا ہوں ۔

ہو سکتا ہے که علامه اقبال کے سوانح حیات کی ترتیب میں مجھ سے بے شمار فروگزاشتیں سرزد ہوئی ہوں اور بعض احباب کرام کو مزید معلومات بھی حاصل ہوں کیوں که کوئی ایک شخص کسی شخصیت کے پورے حالات کا احاطه واستقصا نہیں کر سکتا ۔ میں ان فرو گزاشتوں کے لیے معافی کا طالب ہوں اور مستدعی ہوں که جن حضرات کو اس کتاب میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس ہو ، وہ میری رہنائی فرمائیں تاکه آئنده ایڈیشن میں مناسب اضافے اور ترمیمیں کر دی جائیں ۔

مسلم ٹاؤن لاہور

یکم جون ۱۹۵۵ء — عبدالمجید سالک

پہلا باب

اقبال کی تعلیم و تربیت

حضرت شیخ نور محمد (والد علامہ رحم)

بہ شکریہ ڈاکٹر جاوید اقبال

پہلی فصل

سیال کوٹ میں

پنجاب کا مشہور اور قدیم قصبہ سیال کوٹ جو ہمیشہ فضلائے روزگار کی علمی جولانیوں کا مرکز رہا ہے، ہمارے دور میں ایک ایسے آفتابِ عالم تاب کا مطلع بنا جس نے مشرق و مغرب کی پہنائیوں کو منوّر کر دیا؛ ترجمانِ حقیقت، لسانِ اسلام، حکیم الامّۃ علاّمہ اقبال کا مولد و منشا ہونے کا فخر اِسی مقام کو حاصل ہے۔

آبا و اجداد

علاّمہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے جو آج سے کوئی ڈھائی سو سال پیش تر سترھویں صدی عیسوی میں مشرّف بہ اسلام ہوا۔ یہ خاندان برھمن تھا، اس کی گوت سپرو تھی، یہ لوگ سری نگر میں رہتے تھے اور اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے ہمچشموں میں معزز و ممتاز تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سیّد بزرگ کہیں باہر سے سری نگر تشریف لائے، علامہ کے جدِ اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث ان کے گرویدہ ہو گئے۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا۔ برھمن نے سیّد کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، صالح نام پایا۔ سیّد صاحب نے اپنے دوست کی صالحیت کو دیکھ کر اپنی دختر نیک سے اس کی شادی کر دی۔ اسلام لانے کے بعد صلاح و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کر کے مشہور ہو گئے۔ رجوع عام ہوا، مزار کشمیر میں ہے لیکن مقام معلوم نہیں ہوسکا[1]۔

سن ۵۷ء کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد بابا صالح رح کی اولاد کشمیر

۱۔ روایت محمد نذیر صوفی۔

کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بےشمار کشمیری خاندانوں کی طرح ہجرت کرکے سیال کوٹ میں مقیم ہوئی ۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ پہلے پہل علامہ اقبال کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی ۔ ان کا نام شیخ محمد رفیق تھا لیکن عام کشمیری رواج کے مطابق جس میں رحمانا اور غفارا جیسے عرف مروج ہیں ، شیخ رفیقا کہلاتے تھے ۔ کشمیری دھسّوں کی تجارت کرتے تھے ۔ ان کے دو صاحب‌زادے ہوئے ، ایک شیخ نور محمد (والدِ علامہ) ، دوسرے شیخ غلام قادر جو نہر کے محکمے میں ملازم تھے اور جن کا انتقال روپڑ (ضلع انبالہ) میں ہوا ۔

خاندان

شیخ نور محمد کی شادی جس خاتون سے ہوئی ، اُن کا نام امام بی‌بی تھا ۔ اگرچہ علم سے بہرہ نہ پایا تھا لیکن نہایت دانش‌مند اور اپنے محلے اور برادری میں بےحد محترم اور ہر دل‌عزیز تھیں ۔ خود شیخ نور محمد بھی پڑھے لکھے نہ تھے لیکن چونکہ ابتدا ہی سے علما و صلحا کی صحبت میں رہے اور غور و فکر کی عادت کے علاوہ تصوّف میں درخور وافی رکھتے تھے اس لیے بعض ہم عصر اکابر علم ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ شیخ نور محمد ان پڑھ فلسفی ہیں ۔ بعض لوگ تصوف کی کتابیں پڑھ کر ان کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے شیخ صاحب کی طرف رجوع کرتے تھے ۔[1]

شیخ نور محمد نہایت وجیہ و شکیل بزرگ تھے ۔ رنگ سرخ ، ڈاڑھی سفید ، لباس سادہ ، بہت کم گو تھے ، چھڑی ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے ، نظر ہر وقت سامنے رکھتے ، اِدھر اُدھر نہ دیکھتے ؛ نہایت متین ، ذی عقل ، سنجیدہ مزاج بزرگ تھے اور قصبے میں خاص عزّت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔[2]

سیال کوٹ میں ایک صاحب ڈپٹی وزیر علی بلگرامی مدتوں مقیم رہے ، ان کے نام سے ایک محلہ بھی موسوم ہوا ، انھوں نے ایک باغ لگایا جو

---

۱ - روایت سیّد ذکی شاہ خلف مولانا میر حسن ۔

۲ - روایات سیّد ذکی شاہ و مولانا ابراہیم میر سیال کوٹی ۔
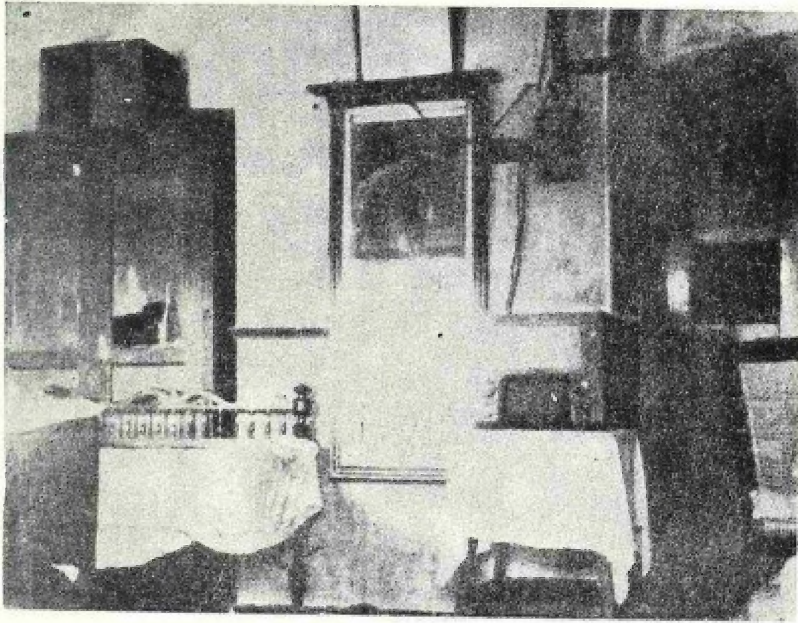
کمرۂ ولادت حضرت علامہ رحمہ

ڈپٹی کے باغ کے نام سے مشہور ہوا ۔ رفاہِ عام کے لیے ایک حوض بھی بنوایا ۔ بسنت کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ میلا بھی ڈپٹی وزیر علی ھی نے جاری کیا تھا ۔ شیخ نور محمد کو سب سے پہلے انھیں ڈپٹی صاحب نے اپنے ہاں پارچہ دوزی پر ملازم رکھا تھا اور سنگر سینے کی مشین منگوا کر دی تھی جو اُس زمانے میں نادر چیز تھی ۔ معتبر حضرات کا بیان ھے کہ شیخ نور محمد کی اہلیہ (والدۂ علامہ) اُن کی تنخواہ میں سے ایک حبّہ نہیں لیتی تھیں کیوں کہ ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا غالب حصہ شرعاً جائز نہ تھا ۔ چناں چہ تھوڑی مدت کے بعد شیخ نور محمد نے ملازمت ترک کر دی اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے ۔ یہ ٹوپیاں اس قدر خوش نما اور مضبوط ہوتی تھیں کہ قلیل مدت کے اندر بے حد مقبولِ عام ہوگئیں، یہاں تک کہ شیخ صاحب کو متعدد خیاط ملازم رکھنے پڑے ۔ شیخ صاحب کے ضعیف ہو جانے پر یہ دکان ان کے داماد غلام محمد نے سنبھالی لیکن کچھ مدت بعد وہ بھی الگ ہوگئے اور دکان بند ہوگئی ۔

شیخ نور محمد کے ہاں دو لڑکے ہوئے، بڑے صاحب زادے شیخ عطا محمد اور چھوٹے شیخ محمد اقبال (یعنی حضرتِ علامہ) ، ان کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں[1]۔

علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد نے معمولی سی تعلیم پائی ، راٹھوروں کے خاندان میں ان کی شادی ہوئی ، سسرال والے فوجی پنشنر تھے ، انھوں نے کوشش کر کے شیخ عطا محمد کو رسالے میں بھرتی کرا دیا ۔ کچھ مدت بعد شیخ عطا محمد ملازمت ترک کر کے رڑکی انجینیرنگ سکول میں داخل ہوگئے اور امتحان پاس کر کے ایم۔ای۔ایس میں اوورسیر ہوگئے، کافی روپیہ کمایا ، علامہ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی ، یورپ بھیجا ۔ حضرت علامہ بھی اپنے بڑے بھائی کے بے حد مداح اور فریفتہ تھے۔ شیخ عطا محمد کے دو صاحب زادے ہیں : اعجاز احمد اور مختار احمد ۔ شیخ اعجاز احمد حکومتِ پاکستان میں

١ - سید ذکی شاہ خلف الرشید مولانا میر حسن کے بیان کے مطابق علامہ کی بہنوں کی تعداد ٣ اور منظور احمد صاحب ہمشیر زادۂ علامہ کے قول مطابق ٣ ھے ۔

بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے ۔ شیخ عطا محمد نے بیاسی سال کی عمر پائی ، ١٩٤٠ء میں انتقال کیا ، امام صاحب (امام علی الحق رح) کے قبرستان میں دفن کیے گئے[1]۔ شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے ۔

علامہ اقبال کے والد محترم تقریباً نوے سال کی عمر پا کر ١٩٢٩ء میں واصل بحق ہوئے ، والدۂ محترمہ اس سے پندرہ سال قبل رحلت فرما چکی تھیں ۔ دونوں کے مزار امام صاحب (سیال کوٹ) کے مقبرے کے پاس واقع ہیں ۔

ولادت اور بچپن

علامہ اقبال کی ولادت ٢٣ ذوالحجہ ١٢٨٩ھ مطابق ٢٢ فروری ١٨٧٣ء کو ہوئی[2]، والد نے محمد اقبال نام تجویز کیا ۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے پاک نفس والدِ محترم نے جو خواب دیکھا ، وہ انھوں نے خود ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے یوں بیان کیا : "میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں ، اوپر فضا میں ایک نہایت خوب صورت رنگا رنگ کے پروں والا پرندہ اڑ رہا ہے ، اس کی دل کشی و دل فریبی کا یہ عالم ھے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اٹھا اٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں ۔ آخر وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اترا اور میری گود میں آن گرا ۔ آپ نے اس کی تعبیر خود ھی بیان کی کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمتِ اسلام میں ناموری حاصل کرے گا ۔"

علامہ کا بچپن اسی طرح کا تھا جیسا غریب اور متوسط الحال شرفاء کے بچوں کا ہوتا ھے ، لیکن روایاتِ متواترہ سے یہ ثابت ھے کہ وہ ذہانت و متانت میں دوسرے بچوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے اور طفلانہ آوارہ گردی سے طبعاً نفور تھے ۔

مولانا ابراہیم میر سیال کوٹی کا بیان ھے کہ اس زمانے میں سیال کوٹ کے مراکزِ درس و تدریس چار تھے :

١ - روایت سید ذکی شاہ ۔
٢ - تصدیق ڈپٹی کمشنر سیال کوٹ بحوالہ رجسٹر پیدائش و اموات ۔

۱ - مولوی غلام مرتضیٰ کا مکتب -
۲ - مولانا ابو عبداللہ غلام حسن کی درس گاہ -
۳ - مولانا سید میر حسن -
۴ - مولوی مزمّل -

پہلی ، دوسری اور چوتھی تین درس گاہوں میں صرف عربیات و دینیات کی تدریس کا اہتمام ہوتا تھا اور مولانا سید میر حسن کے ہاں عربی و فارسی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی -

مولوی میر حسن شاہ

چوں کہ علامہ اقبال رح کے والدِ محترم اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں معارفِ دین کی سماعت کے لیے جایا کرتے تھے اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں اس لیے انھوں نے اقبال رح کو مولانا ہی کے ہاں پڑھنے بٹھا دیا - مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے ؛ ایک دن اقبال رح کو وہاں دیکھ کر پوچھا : "یہ کس کا بچہ ہے ؟" جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے تو آپ نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ ، اسے میں پڑھاؤں گا - چناں چہ اقبال رح مولانا سید میر حسن کے سپرد ہوگئے اور وہ تعلق پیدا ہوا جو مدۃ العمر قائم رہا[1]

اقبال کی بھاوج یعنی شیخ عطا محمد کی اہلیۂ محترمہ کا بیان ہے کہ اقبال رح بہت چھوٹی ہی عمر میں بے حد ذہین تھے اور شعروں سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی - بارہا ایسا ہوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کے وقت ازار بند بُنا کرتی تھی اور اقبال بازار سے منظوم قصّے لا کر ہمیں لحن سے سنایا کرتے تھے ، ان کی آواز بہت شیریں تھی -

۱ - مولانا سید میر حسن کو علامہ اقبال رح کی تعلیم و تربیت میں جو مقام حاصل ہے ، اس کے تقاضے سے اس کتاب میں مولانا کے حالات کے متعلق ایک مستقل باب باندھا گیا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہاں مولانا کے صرف سرسری ذکر پر اکتفا کیا ہے ، ملاحظہ ہو باب ۶ -

اقبال رح کے والدین کا مکان جس بازار میں ہے ، اس کا نام پہلے صدر تھا ، پھر اسے ”دو دروازے والا بازار“ کہنے لگے ؛ آج کل اس کا نام ”اقبال سٹریٹ“ ہے - اس بازار ہی کے ایک کوچے میں مولانا سید میر حسن کا مکان ہے ؛ اس کوچے کو کوچہ میر حسام الدین کہتے ہیں - میر حسام الدین مولانا میر حسن کے چچیرے بھائی تھے -

بٹیریں پالنا

بچپن میں اقبال رح کو بٹیریں پالنے ، کبوتر اڑانے ، اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا - مولانا میر حسن کے صاحب زادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ہیں اور ایک ہاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے ؛ آپ نے فرمایا - کم بخت! اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے؟ تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت ذرا اسے پکڑ کر دیکھیے - لال پہوان (لالو) جو اقبال کے بچپن کے دوست ہیں ، ان کی کبوتر بازی کے قصّے سناتے ہیں -

تصوّف کے متعلق علمی اعتبار سے اقبال کے ذہن میں جو کشمکش پیدا ہوئی اس کا ذکر تو اپنے مقام پر آئے گا لیکن جہاں تک وجدان کا تعلق ہے ، اقبال لطائفِ وجدانی کو مانتے بھی تھے اور ان کے ورود کا ذاتی تجربہ بھی رکھتے تھے - ان کے والد نہایت پرہیزگار اور صوفی آدمی تھے اور بعض اوقات اپنے قوائے روحانی کے نشو و نما کے لیے چِلّہ کشی کی ریاضت بھی کر چکے تھے - اقبال نے اپنے والد کے متعلق احباب کو بعض واقعات سنائے تھے جن میں سے ایک واقعہ بعض کتابوں میں شائع بھی ہو چکا ہے - راقم الحروف نے بھی اقبال کی زبان سے یہی واقعہ ہو بہو سنا ہے اس لیے اس کو نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے - اقبال نے بتایا کہ جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی ، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا - میں نے کیا دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں - میں فوراً بستر

سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے پیچھے چلتے چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا جو آدھ کھلا تھا اور اس میں سے روشنی اندر آ رہی تھی ۔ والدہ اس دروازے میں سے باہر جھانک رہی تھیں ؛ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور مجھے سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا ۔ صبح ہوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تاکہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں ۔ والدہ پہلے ہی وہاں موجود تھیں اور والد انہیں اپنا ایک رؤیا سنا رہے تھے جو رات انہوں نے بہ حالتِ بیداری دیکھا تھا ۔ والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر مقیم ہوا ہے ۔ اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے ۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگا منگایا ، مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیے ۔ چند گھنٹوں میں تانگا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کاروان کا ڈیرا تھا ۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور ذی اثر خاندان پر مشتمل ہے جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے کے لیے پنجاب آئے ہیں ۔ والد نے تانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے ؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو ۔ سالار بے حد متعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو ہمارے مریض کی بیماری سے مطلع ہے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاہتا ہے لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا ۔ جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ہے ، اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں ۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بہ ظاہر راکھ نظر آتی تھی ، وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا

اقبال منزل سیالکوٹ

حاصل ہوگی ۔ اس وقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین ہی نے اس پیش گوئی کو اہمیت دی ۔ لیکن چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا اور لواحقین کو یقین ہونے لگا کہ مریض صحت یاب ہو جائے گا ۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیال کوٹ پہنچ گئے ۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیال کوٹ میں وارد ہوگیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے ۔

جب باپ کی یہ کیفیت ہو ، اس کے مرشدوں اور دوستوں کا حلقہ بھی ایسے ہی لوگوں پر مشتمل ہو اور دن رات اس قسم کے کرشمے چشم و گوش کی پرورش کرتے رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اقبال رح کا ذہن وجدانی کیفیت کے لیے کس قدر آمادہ ہوگا ۔ غالباً یہی وجہ ہوگی کہ اقبال نے اپنی علمی تحقیق کے لیے بھی ما بعد الطبیعیات ہی کا موضوع تجویز کیا ۔

سکاچ مشن سکول

شیخ نور محمد نے مولانا میر حسن کے ارشاد پر اقبال رح کو سکاچ مشن ہائی سکول سیال کوٹ میں داخل کرادیا ۔ اقبال اس سے قبل بھی ابتدائی دینی تعلیم حاصل کررہے تھے اور سکول میں داخل ہونے کے بعد بھی مولانا سے برابر پڑھتے رہے ۔ کبھی کبھی دینیات کے درس کے لیے مولانا غلام حسن کے ہاں بھی چلے جایا کرتے تھے ۔ مولانا ابراہیم میر سیال کوٹی کا بیان ہے کہ اقبال رح نے غالباً ۱۸۸۷ع میں پرائمری ، ۱۸۹۰ع میں مڈل اور ۱۸۹۲ع میں انٹرنس پاس کیا ، تینوں امتحانوں میں انہوں نے وظیفہ حاصل کیا ۔ سید ذکی شاہ کی روایت ہے کہ اقبال رح نے انٹرنس کا امتحان ۱۸۹۳ع میں پاس کیا جب ان کی عمر بیس سال تھی ، ہمارے نزدیک یہ روایت زیادہ صحیح ہے ۔

پہلی شادی

ابھی انٹرنس کے امتحان کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ اقبال زنجیرِ ازدواج میں جکڑ دیے گئے ۔ گجرات میں ایک دولت مند بزرگ خان بہادر ڈاکٹر عطا محمد خان رہتے تھے ، ان کی بڑی

صاحب زادی سے رشتہ طے پایا ۔ جب برات سیال کوٹ سے گجرات جانے کے لیے تیار ہوئی ، سہرا بندھ گیا ، اقبال رح گھوڑے پر سوار ہو گئے تو پاس ہونے کی خوش خبری کا تار آیا ۔ اقبال رح کی یہ پہلی شادی ناکام ہوئی ؛ اگرچہ انہوں نے نباہ کی بے حد کوشش کی اور اس بیوی سے ایک لڑکی مریم (مرحومہ) اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے لیکن زوجین میں میل کا امکان کم ہوتا گیا اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی[1] ۔ مریم کا انتقال علامہ کی والدہ محترمہ کی وفات سے بھی پہلے ہو گیا تھا ۔ امام صاحب (سیال کوٹ) کے مقبرے کے پاس قبر ہے ، وہیں علامہ کے والدین کی قبریں بھی ہیں ۔

سکول اور کالج کے اساتذہ

چوں کہ اس وقت تک سکاچ مشن ہائی سکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں کھل گئی تھیں اور اس کا نام سکاچ مشن کالج ہو گیا تھا اس لیے اقبال رح نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ایف-اے کی تعلیم بھی وہیں جاری رکھی ۔ مولانا ابراہیم میر سیال کوٹی کا بیان ہے کہ اس وقت حسب ذیل اساتذہ اس سکول اور کالج میں پڑھاتے تھے :—

۱ - ماسٹر غلام علی (اقبال شیدائی کے والد) ، ۲ - ماسٹر پالامل ، ۳ - منشی امام الدین ، ۴ - مولانا سید میر حسن ، ۵ - مسٹر ڈیوڈ ہیڈ ماسٹر ، ۶ - ماسٹر ٹہل سنگھ (عیسائی) ، ۷ - مسٹر وی ڈی سنگھا (جو بعد میں بیرسٹر ہوگئے) ، ۸ - پادری ینگسن (سکاچ مشن) ، ۹ - جارج واخ پرنسپل سکاچ مشن کالج ۔

اس زمانے میں اقبال شعر گوئی کا مشغلہ اختیار کر چکے تھے ۔ خان بہادر محمد مسیح پال کا بیان ہے کہ اقبال کالج کی کلاسوں میں پڑھتے تھے اور میں سکول میں تھا ؛ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ وہ سکول کے ایک جلسے میں شریک ہوئے اور اپنی نظم پڑھی ۔

مرزا داغ سے تلمّذ

اس کے علاوہ شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ اقبال کی طالب علمی کے زمانے میں سیال کوٹ میں بھی ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوا کرتا تھا ، اس کے لیے اقبال نے کبھی

۱ - بیانات خواجہ فیروزالدین احمد بیرسٹر و علی بخش ۔

کمرۂ مطالعہ حضرت علامہ رحمہ (سیالکوٹ)

کبھی غزل لکھنی شروع کردی - اس زمانے میں اقبال نے خط و کتابت کے ذریعے فصیح الملک مرزا داغ سے چند غزلوں میں اصلاح لی اور اس طرح اقبال رح کو اُردو زبان دانی کے لیے بھی ایسے اُستاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا ۔ . . . . جناب داغ نے جلد ہی کہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ تلمّذ کا سلسلہ بہت دیر تک قائم نہیں رہا ، البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی - داغ کا نام اُردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبولِ عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی اُن لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انھوں نے اصلاح کی - مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے ہیں[۱]'' -

مولانا میر حسن کے فیضِ تربیت سے اقبال رح برابر بہرہ اندوز ہوتے رہے اور فاضل و شفیق استاد نے اس جوہرِ قابل کو علم و حکمت ، شعر و ادب ، فارسی و عربی، زبان‌دانی اور فکرِ صحیح کے محاسن سے مالا مال کردیا - علامہ اقبال رح بھی مولانا کے عزّ و احترام میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے اور ۱۹۲۹ء تک جب مولانا کا انتقال ہوگیا ، ہمیشہ جب کبھی سیالکوٹ جاتے اس آستانۂ علم پرجبہہ سائی سے ہر گز غفلت نہ کرتے -

سکاچ مشن کالج سے ایف.اے پاس کرنے کے بعد اقبال رح لاہور بھیج دے گئے تاکہ تعلم کے اعلیٰ مدارج طے کرسکیں کیوں کہ سکاچ مشن کالج میں ابھی بی.اے کی کلاسیں نہیں کھلی تھیں اور وہ مرّے کالج کے نام سے موسوم نہ ہوا تھا -

---

۱ - شیخ سر عبدالقادر ، دیباچہ بانگ درا -

دوسری فصل

اقبال لاہور میں

ٹامس آرنلڈ

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے ، گورنمنٹ کالج کی بی ۔ اے کلاس میں داخل ہوئے اور انگریزی ، فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے ۔ ۱۸۹۷ء میں بی ۔ اے نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا ، وظیفہ بھی پایا اوز عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کیے ۔ اُس زمانے میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کرکے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے ۔ ایک تو اقبال کا اپنا رجحان فلسفے کی طرف تھا ، اس پر آرنلڈ جیسے نامور فلسفی کی شاگردی کا موقع ملا ۔ چناں چہ اقبال نے فلسفے کے ایم ۔ اے میں داخلہ لے لیا ۔ پروفیسر آرنلڈ چند ہی روز میں اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اقبال سے دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا ۔ وہ اپنے احباب سے اقبال کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ '' ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے '' اقبال نے ۱۸۹۹ء میں ایم ۔ اے پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے ، اس لیے ایک طلائی تمغہ بھی حاصل کیا ۔

کواڈرینگل کمرہ نمبر ۱

اقبال لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج کے اس ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۱ میں مقیم رہے جو '' کواڈرینگل '' کہلاتا ہے ۔ ان کا کمرہ دوستوں کے جمگھٹوں اور شعر خوانیوں کا مرکز بنا رہتا تھا اور جونیر طلبہ جنھیں اس محفل میں بار نہ ملتا تھا ، بڑی حسرت سے اس کمرے کی رونقوں کو دور سے دیکھا کرتے تھے ۔ اقبال عام طور پر لاہور کے مشاعروں میں نہ جاتے تھے لیکن ایک دفعہ ان کے ہم جماعت انھیں کھینچ کر ایک مشاعرے میں

لے گئے جس میں شہزادہ مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے ۔ اقبال نے جب اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مشاعرے میں غزل

تو مرزا ارشد اچھل پڑے اور کہنے لگے : اقبال ! اس عمر میں یہ شعر ؟ ۔ ایک دو دفعہ اور بھی اقبال نے اس مشاعرے میں غزلیں پڑھیں تو لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے ۔ شیخ عبدالقادر کے ساتھ اسی زمانے میں دوستی کے تعلقات قائم ہوئے ۔ منشی محمد دین فوق بھی داغ کے شاگرد تھے اور کشمیری قوم کی خدمت میں بھی سرگرم رہتے تھے اس لیے اقبال سے ان کو خصوصی اخلاص تھا ؛ چناں چہ ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانانِ ہند کی پہلی مجلس میں اقبال نے فوق صاحب کی تحریک پر پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی جس کا پہلا مصرع تھا : '' کیا تھا گردشِ ایام نے مجھے محزوں '' اور مقطع تھا :

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھ لے اقبال صورتِ مضموں

اُس وقت اقبال نے ابھی بی۔اے[1] بھی پاس نہ کیا تھا ۔

نالۂ یتیم

۱۸۹۹ء میں انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کا جو سالانہ جلسہ ہوا ، اس میں اقبال نے ایک نظم '' نالۂ یتیم '' کے عنوان سے ترنم کے ساتھ پڑھی ۔ نظم بے حد مؤثر تھی اور ترنم اس سے بھی زیادہ مؤثر تھا ، چناں چہ اس پر ہزاروں حاضرین اشک بار ہوئے اور دور دور تک اس نظم کی دھوم مچ گئی ۔ بہت سی مجلسوں اور انجمنوں کی طرف سے اقبال کو فرمائشیں موصول ہونے لگیں لیکن انھوں نے ہمیشہ ان فرمائشوں کی تعمیل سے انکار کیا ۔

---

۱ ۔ کشمیری میگزین لاہور جلد ۳ نمبر ۳ ۔

سر سیّد کے انتقال کی تاریخ

قیامِ لاہور کے زمانے میں ایک دفعہ اقبال تعطیلات کی وجہ سے سیالکوٹ گئے ہوئے تھے کہ سرسید احمد خاں[1] کے انتقال کی خبر آئی۔ مولانا میر حسن سے سرسید کے تعلقات بہت گہرے تھے ؛ انہیں بے حد صدمہ ہوا۔ وہ کالج جا رہے تھے ، راستے میں اقبال رح مل گئے۔آپ نے فرمایا ''سرسید فوت ہوگئے ہیں ، ذرا تاریخِ وفات کی فکر کرنا،، اقبال ایک شناسا کی دوکان پر بیٹھے تھے ، تھوڑی دیر فکر کرنے کے بعد سید ذکی شاہ سے کہنے لگے '' تاریخِ وفات ہو گئی ہے،جاؤ ابھی شاہ صاحب کو سنا دو،، تاریخ تھی :'' انی متوفیک و رافعک الی و مطہرک''۔ ذکی شاہ نے یہ تاریخ شاہ صاحب (مولانا میر حسن) کو جا کر سنائی تو انھوں نے فرمایا ''بہت خوب ہے۔ میں نے بھی ایک تاریخ نکالی ہے۔غفرلہ''۔

مولانا حالی نے جب سرسید کی سوانح عمری '' حیاتِ جاوید'' لکھی تو اس میں ان دونوں تاریخوں کا ذکر تھا لیکن نام کسی کا بھی درج نہ تھا۔ مولانا میر حسن نے خود خواجہ حالی کو خط لکھا کہ''بہت افسوس کی بات ہے ، ان تاریخوں پر آپ نے کسی کا نام نہ لکھا ، یہ دونوں تاریخیں شاگرد اور استاد کی ہیں''۔ خواجہ حالی نے معذرت کا خط لکھا اور کہا کہ''مجھے ناموں کا علم نہ ہو سکا ، اب انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں نام ضرور لکھ دوں گا''۔

مکلوڈ عربک ریڈر

ایم-اے پاس کرنے کے بعد اقبال اورینٹل کالج لاہور میں '' مکلوڈ عربک ریڈر'' مقرر ہوئے اور کچھ مدت کے بعد انھیں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی جس پر وہ ۱۹۰۵ء تک فائز رہے۔ اس زمانے میں اقبال نے بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر محلہ جلوٹیاں کے سامنے بازار میں ایک بالا خانہ کرایے پر لے لیا تھا ، اس کے نیچے آج کل ایک کمہار کی دوکان ہے ، مکان کا نمبر ۱۱ ہے۔

---

۱ - بیان سید ذکی شاہ -

انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے اجلاس ۱۹۰۱ء میں بھی اقبال نے ایک دل‌گداز نظم پڑھی ، جس کا عنوان تھا '' ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے،، یہ وہ نظم تھی جس کا آخری شعر ہے :

پیامِ عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے — ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

۱۹۰۱ء ہی میں ملکۂ وکٹوریا کا انتقال ہوا، اقبال اس وقت سیالکوٹ میں تھے۔ ۹ فروری ۱۹۰۱ء کے''پیسہ اخبار'' میں سیالکوٹ کے ایک ماتمی جلسے کی کارروائی درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماتمی قرار داد کی تائید میں شیخ محمد اقبال رح ایم۔ اے نے بھی تقریر کی ؛ اس جلسے کے صدر مولوی نیاز علی ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس تھے۔

''مخزن'' میں ''ہمالہ''

۱۹۰۱ء کے ماہ اپریل میں شیخ عبدالقادر کا مشہور ادبی رسالہ ''مخزن ،، جاری ہوا ، لاہور کی ایک ادبی مجلس میں جو بعض معزز مشاہیر نے قائم کی تھی ، اقبال نے اپنی ایک نظم '' ہمالہ ،، پڑھ کر سنائی (جو بانگ درا کی پہلی نظم ہے) - یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور ہر طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں کہ اُسے شائع کیا جائے لیکن اقبال رح کا خیال تھا کہ اس نظم میں ابھی بعض خامیاں باقی ہیں اس لیے نظر ثانی کے بعد اسے شائع کرنا مناسب ہوگا لیکن شیخ عبدالقادر نے ان سے وہ نظم حاصل کرکے ''مخزن،، کے پہلے پرچے میں شائع کر دی۔

فکرِ سخن کا اندازہ

شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں ''۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک جب اقبال رح ولایت گئے ، ان کی نظموں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس عرصے میں وہ عموماً''مخزن'' کے ہر نمبر کے لیے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے اور جوں جوں لوگوں کو اُن کی شاعری کا حال معلوم ہوتا گیا، جابجا مختلف رسالوں اور اخباروں سے فرمائشیں آنے لگیں اور انجمنیں اور مجلسیں درخواست کرنے لگیں کہ اُن کے سالانہ جلسوں میں لوگوں کو وہ اپنے کلام سے محظوظ کریں۔ شیخ صاحب (اقبال رح) اُس وقت طالب علمی

سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے ۔ طبیعت زوروں پر تھی ؛ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی ، ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے ۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے ، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے ۔ میں نے اُس زمانے میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا ، موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا ۔ ایک خاص کیفیت رقّت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی ۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے ؛ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے ۔ یہ عجب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اس طرح زبان سے نکلیں ، اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے اور درمیان میں خود وہ انہیں قلم بند بھی نہیں کرتے ۔ مجھے بہت سے شعراء کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا ہے مگر یہ رنگ کسی اور میں نہیں دیکھا ۔ اقبال رح کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ باایں ہمہ موزونیِ طبع وہ حسبِ فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے ۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہ دے مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسبِ فرمائش وہ کچھ لکھ سکے ، یہ قریب قریب ناممکن ہے ،،۔[1]

اس طویل اقتباس کا مقصد یہ ہے کہ اقبال کے اندازِ شعرگوئی کے متعلق صحیح کیفیت معلوم ہو جائے ۔ شیخ عبدالقادر چوں کہ خود بھی ادبیاتِ اردو کے نقد و نظر میں پایۂ بلند رکھتے تھے اور اقبال سے ان کا تعلق بھی مدۃ العمر دوستانہ و مخلصانہ رہا اس لیے ان کے مشاہدات کو معتبر و مستند تسلیم کرنا چاہیے ۔

---

۱ ۔ دیباچہ بانگِ درا ۔

علی بخش اور علاّمہ

جس زمانے میں اقبال گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے ، انہیں دنوں مولوی حاکم علی (جو بعد میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہو گئے تھے) مشن کالج میں پڑھاتے تھے ۔ علی بخش (ملازمِ اقبال) لاہور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس تلاشِ ملازمت کے لیے آیا اور چند روز کے بعد اسے مولوی حاکم علی کے ہاں ملازمت مل گئی ۔ ابھی اس ملازمت پر تین چار ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن مولوی صاحب نے ایک خط علی بخش کے ہاتھ اقبال کو بھیجا ۔ خدا جانے اقبال کو علی بخش کی کون سی ادا بھا گئی ، انہوں نے اس سے کہا کہ تم ہماری نوکری کر لو ۔ علی بخش نے کہا کہ میں تو مولوی صاحب کے پاس ہوں ، انہیں کیوں چھوڑوں ؟ اقبال نے کہا ” علی بخش ! ہمارے پاس آ جاؤگے تو بہت اچھے رہوگے ،، ۔ ان کے اصرار پر علی بخش نے وطن سے اپنے بھائی کو بلوا کر مولوی حاکم علی کے پاس رکھوا دیا اور خود اقبال رح کی خدمت میں حاضر ہو گیا ۔

علی بخش کا بیان ہے کہ اقبال کچھ مدت کے بعد ولایت چلے گئے اور مجھے اپنے بھائی کے پاس ہنگو (کوہاٹ) بھیج دیا ۔ وہاں میرا دل نہ لگا ، واپس آ گیا ؛ پہلے اسلامیہ کالج میں، پھر مشن کالج میں نوکر ہو گیا ۔ ایک دن سید تقی شاہ (ابنِ مولانا میر حسن) سے ملاقات ہوئی ۔ انہوں نے کہا : ”علی بخش! میں تیری تلاش میں تھا ، ولایت سے شیخ صاحب (اقبال) کا خط آیا ہے کہ علی بخش کو تلاش کرو ، وہ نوکر ہو یا بےکار ، میرا انتظار کرے“۔ میں نے کہا کہ ”میں اب ملازم ہوں“۔ وہ کہنے لگے ”شیخ صاحب کا تاکیدی خط آیا ہے ، جو وہ چاہتے ہیں وہی کرو“ ۔ ڈاکٹر صاحب ولایت سے آئے تو میں نوکری چھوڑ کر ان کے پاس آ گیا ۔ میری شادی ہو چکی تھی لیکن میری بیوی میرے لاہور آنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی ۔ گھر والوں نے دو تین دفعہ میری شادی کا انتظام کیا ، میں شیخ صاحب (اقبال) سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا ۔ میں نے جب کبھی ان سے

پوچھا ، انھوں نے یہی جواب دیا کہ پہلے کھانے پینے کا انتظام کریں ، پھر شادی کرنا مناسب ہوگا ، غرض دوبارہ شادی کی نوبت ہی نہ آئی۔[۱]

یہ تھی علی بخش سے اس تعلق کی ابتدا جو تا دمِ مرگ قائم رہا ، بلکہ علی بخش حضرت علامہ کے انتقال کے بعد بھی ان کے بچوں کی خدمت میں منہمک رہا ۔ آج کل کے زمانے میں ایسے ملازم بالکل ناپید ہیں، جو ایک آقا سے عمر بھر نباہ کریں اور ایسے آقا بھی کہاں ہیں ؟

ای-اے-سی کا امتحان

۱۹۰۱ء کا ذکر ہے ، اقبال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحانِ مقابلہ میں شامل ہوئے لیکن میڈیکل بورڈ نے ان کو طبّی نقطۂ نگاہ سے '' اَن فٹ ،، قرار دیا۔ حالانکہ بہ‌ظاہر ان کی صحت نہایت اچھی تھی ۔ سرخ و سفید تھے اور اکھاڑے میں ڈنڑ پیلا اور مگدر ہلایا کرتے تھے ۔ اس بے انصافی کے خلاف "پیسہ اخبار" "کشمیری گزٹ" نے احتجاجی نوٹ لکھے ۔[۲]

شیخ عطا محمد پر مقدّمہ

۱۹۰۳ء میں اقبال کو ایک شدید پریشانی سے سابقہ پڑا ۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اس زمانے میں بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے ۔ بعض مخالفین نے سازش کرکے ان کے خلاف ایک فوج داری مقدمہ کھڑا کردیا جس میں عزت کے علاوہ جان کے بھی لالے پڑ گئے ۔ اقبال کو اس سلسلے میں فورٹ سنڈیمن جانا پڑا ، آخر بڑی جد و جہد اور لارڈ کرزن وائسرائے سے اقبال کی ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہوا ۔ خاندان بھر نے بے حد پریشانی اٹھائی ، زرِ کثیر صرف ہوا لیکن شیخ عطا محمد باعزت بری ہوئے اور ملازمت پر بھی آنچ نہ آئی، حال آں کہ بلوچستان ایجنسی کے کار فرما شیخ صاحب کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے تھے۔[۳]

---

۱ - بیان علی بخش۔

۲ - کشمیری گزٹ ماہ اکتوبر ۱۹۰۱ء - ۳ - اقبال نامہ عطاءاللہ حصہ اول صفحہ ۵ و ۶ -

انجمنِ حمایتِ اسلام میں

اُس زمانے میں قریب قریب ہر سال اقبال انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے کے لیے نظم لکھتے تھے ۔ چناں‌چہ '' فریادِ اُمت بہ حضورِ سرورِ کائنات ،، اور '' تصویرِ درد ،، اِسی زمانے کی نظمیں ہیں ۔ '' تصویرِ درد '' [۱] تو "بانگ درا" میں موجود ہے لیکن '' فریادِ امت ،، جو خاصی طویل ترکیب بند تھی ، "بانگ درا" کی ترتیب کے وقت قلم‌زد کر دی گئی اور اس کا صرف ایک بند '' دل ،، [۲] "بانگ درا" میں شامل کیا گیا ۔ ۱۹۰۴ء کے جلسے میں خواجہ الطاف حسین حالی تشریف لائے ، مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے ۔

خواجہ حالی اور مرزا ارشد

خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنی نظم ساتھ نہیں لا سکا ، اس پر مرزا ارشد نے مزاحاً ایک دو رباعیاں کہیں ، جن میں سے ایک یہ ہے :

سنتے ہیں کہ اس بزم میں حالی آئے ــــ سننے کو ہیں حالی و موالی آئے
کیا شوق ہے کیا خوف ہے کیا گھبراہٹ ــــ بھول آئے ہیں نظم گھر سے خالی آئے

خواجہ حالی نے فرمایا کہ میں کل نظم پیش کروں گا ۔ دوسرے دن نظم لکھ کر لائے ۔ جب سنانے لگے تو معلوم ہوا کہ ان کی کشش کی وجہ سے مجمع بہت زیادہ ہو رہا ہے اور ان کی آواز سب حاضرین تک نہ پہنچ سکے گی ۔ خواجہ صاحب نے چند ہی اشعار پڑھے تھے کہ مجمع نے تقاضا کیا کہ یہ نظم اقبال سے پڑھوائیے ۔ چناں‌چہ خواجہ حالی کی نظم اقبال کو پڑھنے کے لیے دی گئی ۔ اقبال نے نظم پڑھنے سے پہلے ایک فی البدیہ اور برجستہ رباعی پڑھی :

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی ــــ معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا ــــ جاری ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

---

۱ - بانگِ درا صفحہ ۶۲ - ۲ - بانگِ درا صفحہ ۵۴ -

اس کے بعد آپ نے خواجہ صاحب کی نظم نہایت پُر تاثیر لے میں پڑھ کر سنائی ۔ خواجہ صاحب کی اس نظم کے چھ بند تھے ، یہ نظم '' جواہراتِ حالی '' کے صفحہ ۴۵ پر چھپی ہوئی ہے ۔ [1]

دل چسپ قطعہ

اِسی سال اقبال نے انجمن کے جلسے میں ایک طویل قطعہ پڑھا تھا جس کے ابتدائی اشعار یہ تھے :

بھاٹی دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا میں
شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام ہے
خضر صورت مولوی صاحب کھڑے تھے اک وہاں
ہم مسلمانوں میں ایسی مولویّت عام ہے
وعظ کہتے تھے نہ مسلم کوئی انگریزی پڑھے
کفر ہے آغاز اس بولی کا کفر انجام ہے [2]

اس قطعے میں دوسرے مزے مزے کے اشارات کے علاوہ اپنے دوست زبدۃالحکما حکیم غلام نبی پر بھی ایک چوٹ کی گئی تھی :

موچی دروازے میں ہیں فخرِ اطبّائے زماں
آن سے امیدِ شفا لیکن خیالِ خام ہے

چوں کہ اس قطعے میں بعض غلط قسم کے مولویوں کو کھری کھری سنائی گئی تھیں اس لیے مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) نے قطعہ کو چھاپنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اس کے متعلق بھی ایک شعر میں اشارہ تھا :
آج کل لوگوں میں ہے انکار کی عادت بہت نام محبوبانِ عالم کا یونہیں بدنام ہے
غرض یہ قطعہ بے حد دل‌چسپ تھا اور سننے والوں نے شاعر کے اشارات سمجھ کر اس سے خوب لطف اٹھایا ۔

۱ - بیان خواجہ فیروز الدین احمد۔ ۲ - روداد جلسہ انجمن حمایت اسلام ۱۹۰۳ء۔

بازارِ حکیماں کی مجلسیں

بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر بازارِ حکیماں علامہ اقبال کے رجوع کا بڑا مرکز رہا ہے ۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ جب علامہ گورنمنٹ کالج سے فارغ التحصیل ہو کر اسی کالج میں پروفیسر ہوگئے تو انھوں نے ہوسٹل سے نکل کر سب سے پہلے بھاٹی دروازے کے اندر ہی محلۂ جلوٹیاں کے سامنے سکونت اختیار کی ۔ علاوہ بریں شیخ گلاب دین وکیل سیال کوٹ کے رہنے والے تھے اور کشمیریت کے علاوہ اقبال کو ان سے ہم وطنی کا تعلق بھی تھا ۔ ان کے ساتھ ہی مولوی احمد دین ، سید محمد شاہ ، خواجہ رحیم بخش (خواجہ فیروز الدین احمد بیرسٹر کے والد)، خلیفہ نظام الدین (ڈاکٹر مظفر الدین مرحوم سابق ڈائرکٹر انڈسٹریز پنجاب کے والد) سے روابط روز افزوں ہوئے ۔ پہلے پہل احباب خوش ذوق کا یہ مجمع حکیم شہباز الدین کے مکان پر ہوا کرتا تھا ، پھر جب حکیم صاحب کا انتقال ہوگیا تو یہ مجمع اس چبوترے پر ہوتا تھا جو حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان کے سامنے واقع تھا ۔ راقم الحروف نے بھی متعدد بار علامہ اور مولوی احمد دین سے اس چبوترے پر ملاقات کی ہے ۔

بعد کے مراحل پر چودھری شہاب الدین ، شیخ عبدالقادر اور میاں فضل حسین بھی اس مجلس میں شامل ہونے لگے تھے اور کبھی کبھی فقیر سید نجم الدین (کرنل فقیر وحید الدین کے والد) بھی کارِ سرکار سے رخصت ملنے پر چند ہفتے ان احباب کی صحبت میں بسر کر جاتے ۔ جب اس مجمع میں علامہ اقبال کے ساتھ ہی چودھری صاحب ، شیخ صاحب اور میاں صاحب زیادہ نمایاں ہوگئے تو لوگ اس کو ''ہاؤس آف لارڈز'' کہا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ چاروں حضرات یکے بعد دیگرے سر ہوگئے یعنی علم و ادب کے علاوہ یہ مجلسیں اس زمانے کے معیار کے مطابق معاشرتی وجاہت کا سرچشمہ بھی تھیں اس لیے ان کے شرکاء سب کے سب شرفاء تھے جو حکام و عوام دونوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے ۔ ابتدائی مشاعرے جن میں اقبال نے غزلیں پڑھیں اور اہلِ لاہور سے روشناس ہوئے ، یہیں

منعقد ہوتے تھے اور حکیم شہبازالدین ہی ان کا انتظام وانصرام کرتے تھے۔[1]

خان احمد حسین خاں فرماتے ہیں کہ وہ خود ان مجالس میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے۔ ان مجلسوں میں سامعین کی تعداد کم و بیش ایک سو ہوتی تھی۔ اس کے بعد یہ مشاعرے زیادہ وسیع ہوگئے اور نواب غلام محبوب سبحانی (خلف شیخ امام الدین گورنر کشمیر) کی صدارت میں اس مقام پر منعقد ہونے لگے جہاں آج کل انارکلی بازار کے آغاز میں ہوٹل واقع ہے۔ ان مجلسوں کی تنظیم و ترتیب کے لیے ایک ادبی انجمن بھی قائم ہو گئی تھی جس کے صدر مسٹر مدن گوپال بیرسٹر اور سیکرٹری خان احمد حسین خان تھے اور لالہ ہرکشن لال، میاں شاہ دین اور دوسرے نامور لوگ بھی ممبر بن گئے تھے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم "ہمالہ" اسی انجمن کے ایک اجلاس میں پڑھ کر سنائی تھی۔ ان مجالس کا مدعا یہ تھا کہ غزل کے علاوہ نظم کو بھی رواج دیا جائے؛ چناں چہ میاں شاہ دین کی تجویز پر سب سے پہلے مناظرِ قطرت پر نظمیں لکھنے کا فیصلہ ہوا؛ پہلا عنوان "ہمالہ" تجویز کیا گیا جس پر اقبال، احمد حسین خاں اور بعض دوسرے صاحبوں نے نظمیں لکھیں۔

خان صاحب کا بیان ہے کہ میں یہ تو اِس وقت کہ نہیں سکتا کہ علامہ اقبال کے ابتدائی کلام میں کوئی امتیازی خصوصیت تھی لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اقبال جو کچھ بھی پڑھتے تھے، اس میں غیر معمولی دل‌چسپی پیدا کر دیتے تھے۔ شعر بھی اچھے ہوتے تھے اور آواز میں بھی خاص سوز اور اثر تھا۔ اس سے پیش‌تر مشاعروں یا جلسوں میں نظمیں گا کر پڑھنے کا دستور نہ تھا۔ اقبال کو اس معاملے میں اوّلیت حاصل ہے۔ اس کے بعد یہ ترنم بالکل متعدی ہو گیا اور شعراء اکثر گا کر کلام سنانے لگے یہاں تک کہ عبدالمجید وکیل (لاہور) اور چودھری خوشی محمد ناظر (کشمیر) بھی آواز واجبی ہونے کے باوجود گا کر پڑھتے تھے۔

۱۔ بعض بزرگوں نے بتایا کہ اس مشاعرے کی غزلیں ایک رسالے میں چھاپ دی جاتی تھیں جس کا نام "شورشِ محشر" تھا اور جس کے ایڈیٹر خان احمد حسین خان تھے۔ تلاش کے باوجود اس رسالے کے پرچے دست یاب نہیں ہوسکے۔

اقبال کی مہارتِ فن

علامہ اقبال رح عام طور پر عروض وزبان کی بحثوں سے بہت گھبراتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے محاورات اور قواعدِ فن کا زیادہ علم نہیں لیکن حقیقت میں یہ محض ان کا انکسار تھا یا وہ ان مبتدیانہ و طالب علمانہ بحثوں کی سطح سے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ نفسِ مضمون کے بجائے ان زوائد میں اپنا وقت صرف کرنا تضیع اوقات سمجھتے تھے۔ بعض "اہلِ زبان" ان کے کلام پر نکتہ چینی کرتے یا "اودھ پنچ" اپنے مخصوص انداز میں ان کی فارسی ترکیبوں یا جدید اسالیبِ بیان کا مضحکہ اڑاتا تو وہ ٹس سے مس بھی نہ ہوتے بلکہ اپنے نیاز مندوں کو بھی اس قسم کی تنقیدوں کا جواب دینے سے منع فرما دیتے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ کیفیت نہ تھی۔ ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے کسی صاحب نے کسی اخبار میں "تنقیدِ ہمدرد" کے نام سے اقبال اور ناظر[1] کے بعض اشعار پر زبان و فن کی بنا پر چند اعتراضات کیے۔ اس پر اقبال نے "اردو زبان پنجاب میں" کے عنوان سے ایک نہایت معقول اور دندان شکن جوابی مضمون لکھا جو "مخزن" میں شائع ہوا[2]۔ چند ابتدائی کلمات کے بعد اقبال نے ایک نہایت کام کی بات کہی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارے دوست "تنقیدِ ہمدرد" اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروّج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کی معیار کیا ہے۔ جو زبان بہ ہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطلب پر قادر ہو، اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کی معیار خود بہ خود قائم ہو جاتی ہے، لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع

۱۔ چودھری خوشی محمد ناظر۔ ۲۔ ملاحظہ ہو "مخزن" بابت اکتوبر ۱۹۰۳ء۔

کیے جارہے ہوں ، اس کے محاورات وغیرہ کی صحت اور عدمِ صحت کی معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے ۔ ابھی کل کی بات ہے ، اردو زبان جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چوں کہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا ، اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیرِ نگین ہو جائے ۔ ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریقِ معاشرت ، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرزِ بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے ۔ علمِ السنہ کا یہ ایک مسلّم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے ۔ تعجب ہے کہ میز ، کمرا ، کچہری ، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے تو بلا تکلف استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُر معنی پنجابی لفظ استعمال کرے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو ، اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصوص ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے ۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علمِ زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فردِ بشر کے امکان میں نہیں ہے ۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کرے تو آپ کا عذر بےجا ہوگا ۔ اردو ہی ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے

کئی ایک الفاظ بدمعاش ، بازار ، لوٹ ، چالان وغیرہ لے لیے ہیں اور ابھی روز بہ روز لے رہی ہے ۔"

یہ وہ معقول اور نا قابلِ تردید خیالات ہیں جو اقبال نے آج سے نصف صدی پیش تر ظاہر کیے تھے اور ان کی صداقت ہمارے آج کل کے ماحول میں اور بھی زیادہ روشن نظر آتی ہے ۔ جو لوگ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد بھی اردو کے محاورات کو صرف دہلی و لکھنو کے پرانے محاورت تک محدود رکھنے میں کوشاں ہیں اور پنجابی یا سرحدی یا سندھی یا بنگالی کے کسی محاورے کو اردو میں دخیل ہونے کا حق نہیں دینا چاہتے ، انہیں اقبال کے منقولہ بالا خیالات پر غور کرنا چاہیے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ "تنقیدِ ہمدرد" کے معترضانہ مضمون کا لہجہ دعوائے ہمدردی کے باوجود تلخ اور دل آزار تھا کیوں کہ اقبال نے اپنے مضمون میں یہ کلمات بھی لکھے ہیں :-

" اگرچہ "تنقیدِ ہمدرد" صاحب نے بالخصوص حضرتِ ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کیے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے اعراض کروں گا کیوں کہ فنِ تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرّا ہو ۔ تنقید کی بنا دوستی ، محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہیے نہ یہ کہ مضمون تو اپنے خیال میں از راہِ دوستی لکھیں اور طرزِ بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے ۔ میر رضی دانش کیا خوب فرماتے ہیں :

؎ مغور چنداں کہ نشناسد زگل گلچیں ترا
پاسبانِ حسنِ پاکِ خویشتن بودن خوش است "

اس کے بعد اقبال نے اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔ بعض باتوں کا جواب

اس سے پہلے ''انبالوی صاحب''[1] دے چکے تھے جن کا ذکر اقبال نے کیا ہے اور ان جوابات کو شافی قرار دیا ہے ۔ آگے چل کر اقبال صرف اُن اعتراضات کا جواب دیتے ہیں جو ان کے اشعار پر کیے گئے تھے، مثلاً اقبال کا ایک شعر تھا :

آرزو یاس کو یہ کہتی ہے   اک مِٹے شہر کا نشان ہوں میں

''تنقید ہمدرد'' نے لکھا تھا کہ ''آرزو یاس سے یہ کہتی ہے'' ہونا چاہیے۔ ''کو'' یہاں درست نہیں ۔ اس پر اقبال لکھتے ہیں کہ :

''اکابر شعرائے قدیم و حال کا کلام اس دعوے کا مؤیّد ہے کہ ''کہنا'' کا صلہ ''کو'' بھی آتا ہے اور ''سے'' بھی، البتہ ایک باریک فرق ان کے استعمال میں ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں کہنے کا مقولہ ایک کلمۂ مفرد یا مرکبِ ناقص (ترکیب اضافی یا توصیفی وغیرہ) ہو اور اس میں مفعول اول کی کوئی صفت پائی جائے تو ہمیشہ ''کو'' آئے گا مثلاً ''زید نے عمر کو جاہل کہا'' یا ''جز جام جہاں بین کے پیمانے کو کیا کہیے'' مگر جہاں مقولہ مرکب ناقص یا کلمہ مفرد بھی ہو لیکن وہ مفعولِ اول کی صفت پر دال نہ ہو اور نیز جہاں مقولہ ایک جملہ یعنی مرکبِ تام ہو ، وہاں ''کہنا'' کا صلہ ''کو'' اور ''سے'' دونوں طرح آتا ہے ۔ مندرجہ بالا شعر میں ''کہنا'' کا مقولہ مرکبِ تام یعنی ''اک مٹے شہر کا نشان ہوں میں'' ہے ۔ آپ کا ادّعا ہے کہ یہاں ''کو'' کی جگہ ''سے'' ہونا چاہیے، میں کہتا ہوں کہ ''سے'' اور ''کو'' دونوں ہو سکتے ہیں اور اساتذہ کا کلام میرا مؤیّد ہے ۔ فخر المتقدّمین و المتأخّرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ہیں :

---

[1] ۔ انبالوی صاحب سے غالباً میر نیرنگ مراد ہیں جو انبالے کے باشندے اور اقبال کے مخلص دوست تھے ۔ اقبال نے میر نیرنگ کا نام شاید اس وجہ سے نہ لکھا ہو کہ میر صاحب نے یہ جواب اپنے نام سے نہ دیا ہوگا بلکہ محض ''انبالوی'' ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہوگا ۔

مر کے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی
آکے عیسیٰ سرِ بالیں نہ کہیں قُم مجھ کو

اس شعر میں ''کہنا'' کا مقولہ ایک مرکبِ تام یعنی ''قُم'' ہے اور حضرتِ مرحوم اس کا صلہ ''کو'' استعمال کرتے ہیں ۔ مومن فرماتے ہیں :

دیا اس بدگماں کو طعنۂ غیر   غضب ہے ، کیا کہوں اپنی زباں کو

شیخ غلام ہمدانی مصحفی جن کے انداز کے جناب حسرت وارفتہ ہیں فرماتے ہیں:

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی ہی نہیں دشت میں آواروں کو

اور لیجیے ! مرزا رفیع سودا دولت مند بخیل کی ہجو میں فرماتے ہیں :

غرض اٹھ کر چلا وہ جب واں سے   کہ گیا کان میں یہ سہاں سے
چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو   کہ دو بلوا کے تم بکاول کو

مرزا نے پہلے شعر میں کہنے کا صلہ ''سے'' استعمال کیا ہے اور دوسرے میں ''کو''، اب فرمائیے، آپ کے دلیرانہ دعوے کی تردید ہوئی یا نہیں ؟''

اقبال کا ایک اور شعر تھا :

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں   اور رکھیں اسے کہاں کے لیے

اس پر بھی معترض نے وہی اعتراض کیا کہ ''تجھے'' کی جگہ ''تجھ سے'' ہونا چاہیے ۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے میر تقی ، مرزا سودا ، مومن ، ظفر ، داغ اور امیر کے اشعار پیش کیے ہیں جن میں ایسے موقع پر مجھے، تجھے، تمھیں بے تکلف استعمال ہوتے ہیں ۔ اقبال کا ایک مصرع تھا: ع

''جس کے پھولوں میں اخوّت کی ہوا آئی نہیں''

معترض نے لکھا کہ اس موقع پر ''ہوا آنا'' صحیح نہیں ، اقبال نے جواب دیا :—

''ہوا آنا'' اردو محاورہ نہ ہوگا ، میرا مقصود بھی تو محاورہ

نہیں ہے ۔ خان آرزو مرحوم نے بھی اسی قسم کا ایک اعتراض شیخ علی حزیں علیہ الرحمہ کے ایک شعر پر کیا تھا مگر مولانا صہبائی مرحوم اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں :
"ایراد الفاظ گاہے بطریق محاورہ و روزمرہ بود کہ مردم را باہم در ادائے مدّعا بے تکلف اتفاق افتد و گاہے برائے تناسب و رعایت محسنات بدیعی الخ" ۔ میرے شعر میں پھولوں کو جو تعلق ہوا اور باغ سے ہے ، وہ ظاہر ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کیے گئے ۔ ہاں اگر آپ کے اعتراض کا مفہوم یہ ہو کہ 'آنا' ہوا کے ساتھ اردو میں مسموع نہیں ہے تو ظفر دہلوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے :

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ہوا آئی
حباب آسا جو میرا ہو گیا ہے پیرہن ٹھنڈا"

اقبال کا ایک شعر تھا :

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

"تنقید ہمدرد" نے اعتراض کیا کہ 'بناؤں' اور 'دیکھوں' کا قافیہ غلط ہے ۔ اس پر اقبال نے لکھا ہے کہ بلاشبہ اس شعر میں ایطائے خفی ہے جس کو شایگاں کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں ۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قواعدِ قافیہ کی رو سے یہ قافیہ غلط ہے مگر اساتذہ نے اکثر فنِ قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی ۔ اس کے بعد اقبال نے یہ اشعار بطور سند پیش کیے ہیں :

پھر دل میں مرے لگی ہے آتش
نالے سے برس رہی ہے آتش (مومن)

جب وادیِ وحشت میں گزر میرا ہوا ہے
ہر ایک بگولا پئے تعظیم اٹھا ہے (ناسخ)

سنگ دل تجھ کو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک
میری سوزش کے لیے غیر سے سازش کب تک (امیر)

اس کے بعد اقبال نے شعرائے فارسی کے کلام سے بے شمار مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ قواعدِ قافیہ کی خلاف ورزی عام ہے، مثلاً :

چہ گفت آں خداوندِ تنزیل وحی
خداوندِ امر و خداوندِ نہی (فردوسی)

چناں نادر افتاد در روضۂ
کہ در لاجوردی طبق بیضۂ (سعدی)

اسی طرح اردو اور فارسی کے بے شمار اشعار نقل کر کے اصولِ قافیہ پر بحث کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اس قسم کی خفیف سی خلاف ورزیاں قابلِ اعتراض نہیں ہیں کیوں کہ اکثر شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں ۔ اقبال نے "مفلسی" کے عنوان سے دو چار اشعار "مخزن" میں لکھے تھے ؛ ان میں سے دو یہ ہیں :

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا — ہائے کیا تیر بے خطا ہے ترا
شورِ آوازِ چاکِ پیراہن — لبِ اظہارِ مدعا ہے ترا

معترض نے اعتراض کیا کہ 'صفا' بہ معنی صاف لکھنا صحیح نہیں ہے۔ اس پر اقبال لکھتے ہیں :

اہلِ زبان کے تصرّفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بسا اوقات مصدر کو بمعنی اسم فاعل استعمال کرتے ہیں جس طرح اردو والوں نے 'صفا' مصدر کو صاف کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ حکیم افضل الدین خاقانی خلیفۂ بغداد کی تعریف میں

فرماتے ہیں : ابر انفاسش زوال قحط قحطان آمدہ ۔ علیٰ ھذا کبھی حال کو اسمِ فاعل کے معنوں میں بولتے ہیں ۔ کلام ہو تو حضرت داغ دام فیضہ کا یہ مطلع ملاحظہ فرمائیے :

آئنہ منہ پہ بھلا اور برا کہتا ہے
سچ ہے یہ ، صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے

دھلی مرحوم کی زبان پر اعتبار نہ کرو تو میر انیس علیہ الرحمہ کا یہ مصرع حاضر ہے: ع

بت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے

البتہ ظفر کا یہ شعر قابلِ اعتبار نہیں کیوں کہ یہاں صفا بہ معنی صاف بہ ترکیبِ فارسی بندھا ہے اور فارسی میں صفا بہ معنی صاف مستعمل نہیں ہے :

وہ آئنہ ہے نہ جس کو ہو حاجتِ سیماب
اک اضطراب ہے کافی دلِ صفا کے لیے

دوسرے شعر پر '' تنقید ھمدرد '' نے یہ اعتراض جڑ دیا کہ 'شور لب' کیوں کر بن گیا ۔ اس پر اقبال نے جو بحث کی ہے وہ قابلِ ملاحظہ ہے :

اس شعر میں ایک نازک بات تھی مگر افسوس آپ نے تدبّر نہ کیا اور یہ اعتراض کر دیا کہ 'شور لب' کیوں کر بن گیا ۔ مینا خانۂ خیال کے تماشائی ہو کر ایسی جنبش مژگاں سے رنگِ تماشا کو '' توڑنا ''[1] مناسب نہ تھا ۔ اقبالِ ہیچ مداں عرض کرتا ہے کہ لبِ اظہار میں اضافت بیانی ہے ۔ آپ کا اعتراض صحیح ہوتا اگر لبِ اظہار سے حقیقی لب مراد لی جاتی ۔

[1] '' مژہ برہم مزن تانشکنی رنگ تماشا را '' کی طرف اشارہ ہے یعنی اگر '' رنگ کو توڑنا '' جائز ہے تو شور کا لب بن جانا کیوں باعثِ تعجب ہو ۔

ہاں اضافتِ بیانی کی سند چاہو تو حاضر ہے :

صفِ مژگانِ تو گر عکس بدریا فگند
خارِ قلاب بود در بدنِ ماھی ما (شیخ علی حزیں)

کہاں گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
بسانِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ (مرزا غالب)

پس جب ''ماھیِ ما '' اور '' میرے آئینے '' سے '' میں '' مراد ہو سکتی ہے تو '' لبِ اظہار '' سے لب مراد کیوں نہ ہو ؟ اور اظہار اور شور میں جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے لیکن مجھے امید نہیں کہ آپ اس توضیح کو قبول کریں ۔ ایک اور تشریح پیش کرتا ہوں ، شاید سمعِ قبول سے شرف اندوز ہو ۔ شور کو لب کے ساتھ اظہار میں مشارکت ہے ۔ پس یہ استعارہ بے تکلف ہے اور استعارہ بے تکلف تمام فصحا کے نزدیک جائز ہے ۔ علم معانی کا کوئی چھوٹا سا رسالہ لے کر پڑھیے، اس میں بھی اس قسم کے استعارے کو جائز لکھا دیکھیے گا ۔ قطع نظر اس بات کے آپ خوب جانتے ہیں کہ استعارے کا میدان وسیع ہے ۔ شاعر اہلِ زبان کے محاورات کا پابند ہوتا ہے اور یہ پابندی ضروری ہے لیکن اہلِ زبان کے تخیّلات کی پابندی ضروری نہیں ۔ یہ ضرور نہیں کہ اگر متقدمین نے '' گلشن طور '' لکھا ہے تو ہم ہمیشہ گلشن طور ہی لکھا کریں ۔ جس شخص نے مُلاّ ظہوری پر یہ اعتراض کر دیا تھا کہ '' آتشِ بیگانہ '' مسموع نہیں ہے ، میری رائے میں وہ غلطی پر تھا کیوں کہ ظہوری کا تخیّل ایرانیوں کے تخیّل کا مقلّد نہیں ہو سکتا ۔ اسی خیال سے بیدل علیہ الرحمہ نے فارسیوں کی پروا نہ کرکے '' خرام کاشتن '' (ہر گہ دو قدم خرام می کاشت) لکھ دیا اور نافہموں نے ان کی آزادیٔ تخیّل کو سہامِ اعتراض کا نشانہ

بنایا ۔ متقدمین میں سے ناصر علی سرهندی اور مرزا جلال اسیر
بهی ان قیود سے آزاد هیں ۔ خواجه آتش ''گرگ بغل،، تحریر
فرماتے هیں اور حضرت امیر کے اشعار سے بهی ایسا هی
معلوم هوتا هے ؛ ع

هم بار خاطر قفس و آشیاں نہیں

غالباً ''گرگ بغل،، اور ''خاطر قفس،، کا استعارہ آپ
کسی ایرانی یا اردو شاعر کے کلام میں نه پائیں گے ۔ پس
میری رائے میں استعارے پر اعتراض کرنے کا حق کسی محقق
کو حاصل نہیں ۔ اِلّا اس صورت میں جب که استعاره اصلیت
سے معرّا هو ...... اپنے استعارے کی تائید میں شیخ علی
حزیں علیه‌الرحمة کا ایک شعر پیش کرتا هوں ۔ جس طرح میں
نے لب سے مراد ''آوازِ لب،، یا گفتار لی هے ، اسی طرح
شیخ علیه الرحمة اپنے شعر میں ناقوس سے مراد آوازِ ناقوس
لیتے هیں :

سر کافر شدن داریم کو بت خانۂ عشقے　　که ناقوسش بجائے نغمه یامی شودمارا''

اقبال کا ایک مصرع تها ؛ ع ''اس جهاں میں اک معیشت اور سو افتاد هے،، ،
معترض نے لکھا که ''سو افتاد'' کی جگه ''سو افتادیں،، لکهنا چاهیے تها ۔
اس کے جواب میں بهی اقبال نے خواجه آتش ، تسلیم ، جلال کے اشعار
نقل کرکے معترض کو خاموش کرایا ۔ اس کے بعد اقبال کے اس مشهور مصرع
پر ''مدت سے آرزو تهی که سیدها کرے کوئی'' اعتراض کیا گیا ۔ اقبال
نے لکها که ''معلوم نہیں آپ کا اعتراض اس مصرع کی زبان پر هے یا مفهوم
پر ؛ سیدها کرنا یہاں انهیں معنوں میں لکها گیا هے جن معنوں میں میر ممنون
دهلوی نے لکها تها :

تیرے قامت نے کیا خوب هی سیدها اس کو
سروِ گلشن کو بہت دعویٔ رعنائی تها

اگر آپ کہیں که محاورے کا اطلاق اپنی ذات پر نہیں هو سکتا تو صحیح
نہیں ؛ ظفر مرحوم کا مطلع هے :

عشق میں کیا هم هی اے تقدیر سیدھے هوگئے
کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے هوگئے

اصل میں سیدها کرنا فارسی محاوره ''راست کردن،، کا ترجمه هے اور یه
محاوره صوفیهٔ کرام کے اشعار میں به کثرت پایا جاتا هے ۔ یہی وه راستی هے
جو عشق کی حرارت سے پیدا هوتی هے اور جس کا اثر سکندر کے آئینے کو
جام جہاں نما بنا سکتا هے ، حرماں نصیب اقبال کو اسی راستی کی آرزو هے،، ۔

اقبال کی منصف مزاجی اور طالب علمانه ذهنیت کا ایک روشن ثبوت یه
هے که جب ''تنقید همدرد،، نے ''میں نے کہنا هے،، پر اعتراض کیا
که یه غلط اور خلافِ محاوره هے تو اقبال نے اپنے جواب میں اس غلطی
کو تسلیم کر لیا اور لکها که پنجاب میں چوں که ''نے،، کا یه استعمال
عام هے اس لئے بعض اوقات بے خیالی کے عالم میں هم لوگ اسے شعر میں
باندھ دیتے هیں لیکن اس کے خلافِ محاوره هونے میں کوئی کلام نہیں ۔

آخر میں اقبال پھر اپنے انکسار کی طرف عود کرتے هیں اور فرماتے هیں:

''قسم بخدائے لایزال! میں آپ سے سچ کہتا هوں که بسا اوقات
میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی هوتی هے که میں باوجود
اپنی بے علمی اور کم مائگی کے شعر کہنے پر مجبور
هو جاتا هوں ورنه مجهے نه زباں‌دانی کا دعویٰ هے نه شاعری کا ۔
راقم مشهدی میرے دل کی بات کہتے هیں :

نیم من در شمارِ بلبلاں امّا بایں شادم
که من هم در گلستاں قفس مشت پرے دارم

اس مضمون سے اتنے طویل اقتباسات نقل کرنے سے مقصود یه هے که
آج کل کے شعرا و ادبا اس سے وه نمائی حاصل کریں اور ان کو معلوم هو که

اقبال علومِ مغربی کا بحرِ بے پایاں ہونے کے باوجود فارسی اور اردو شاعری اور ان دونوں زبانوں کے غوامض کا کتنا بڑا ماہر تھا اور اس کا یہ مبلغ علم اُس وقت تھا جب اس کی عمر ابھی پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی۔ جب تک ہمارے شعرا اپنے قدیم ذخیرۂ ادب و شعر سے ناواقف اور بے بہرہ رہیں گے ، وہ دنیائے شعر میں کسی عظمت و اہمیت کے حق‌دار نہ ہو سکیں گے ۔

جنوری ۱۹۰۲ء کے ''مخزن'' میں بھی اقبال کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا موضوع تھا : ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' ۔ اس مضمون میں اقبال نے تعلیمِ اطفال کے طریق اور نفسیاتِ اطفال کے مطالعے کے متعلق نہایت گراں‌قدر خیالات کا اظہار کیا ۔ افسوس کہ قلّتِ گنجائش کی وجہ سے اس مضمون کے زیادہ اقتباسات نقل نہیں کیے جا سکتے ۔ تعلیم کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں :

"یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نفسِ ناطقہ قُوا کا ایک مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے اور اس کی ہر ایک قوت کا نشو و نما ہر دوسری قوت کے نشو و نما پر منحصر ہے ۔ جس طرح جسمانی اعضا تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں ، اسی طرح نفسِ ناطقہ کے قُوا کا نشو و نما بھی انہیں اصولوں کے تحت میں ہے لہٰذا طریقۂ تعلیم وہی کامل ہوگا جو نفسِ ناطقہ کے تمام قُوا کے لیے یکساں ورزش کا سامان مہیا کرے ، ادراک ، فکر ، تخیّل ، تأثر اور مشیّت ، غرض نفسِ ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہیے کیوں کہ کامل طریقِ تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفسِ ناطقہ کی پوری پوشیدہ قوتیں کمال بزیر ہوں، نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہوجائیں۔"

آخری پیراگراف ملاحظہ ہو :

"مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ایک عمدہ اور مضبوط تعلیمی بنیاد رکھنے کے لیے بچے کے نشو و نما کا مطالعہ

کہاں تک ضروری ہے ۔ معلّم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں کیوں کہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہیں کی قدرت میں ہے ۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلّم کی کارگزاری ہے ۔ اگرچہ بد قسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشے کی وہ قدر نہیں جو ہونی چاہیے ۔ معلّم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے کیوں کہ تمام قسم کی اخلاقی، تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سر چشمہ اسی کی محنت ہے ۔ پس تعلیم یافتہ اصحاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشے کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریقِ تعلیم کو اعلیٰ درجے کے علمی اصولوں پر قائم کریں جس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ ان کے دم قدم کی بہ‌دولت علم کا ایک سچا عشق پیدا ہو جائے گا جس کی گرمی میں وہ تمدنی اور سیاسی سر سبزی مخفی ہے جس سے قومیں معراجِ کمال تک پہنچ سکتی ہیں[1]۔"

آغاز سے ۱۹۰۵ء تک کی جو نظمیں ''بانگ درا'' میں درج ہیں ، ان کی تعداد غزلوں کے علاوہ ۴۹ ہے ۔ ان میں سے اکثر ''مخزن'' میں بعض ''پیسہ اخبار'' میں اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوئیں ۔ ان نظموں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مظاہرِ فطرت ، ہنگامۂ کائنات اور حسن و جمال کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے شاعر سراپا استفہام و استفسار ہے ؛ اس کے دل میں ایک تڑپ ہے کہ کسی نہ کسی طرح حقائقِ اشیاء میں ڈوب کر ان کا سراغ لگا لے ۔ حکمت و تصوف کی جس فضا میں اقبال نے تربیت پائی تھی اور اس کے بعد فلسفے سے جو اپنا رشتہ استوار کیا تھا ، اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ سراپا تلاش و تجسّس ہوتے ۔ اکثر نظموں میں تفکّر کی طرف رجحان صاف طور پر نظر آتا ہے ، یہاں تک کہ وہ

---

۱ - مخزن، جنوری ۱۹۰۲ء -

''کنارِ راوی'' پر کھڑے ہو کر ایک تیز رَو کشتی کو دیکھتے ہیں تو دور فاصلے پر اس کے غائب ہو جانے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ :

جہازِ زندگیِ آدمی رواں ہے یونہی　　ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا　　نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

یہی وہ چیز ہے جو اقبال کو دورِ حاضر کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ کوئی رومانی شاعر ہوتا تو راوی کے کنارے کھڑے ہو کر اپنے سوزِ فراق اور شامِ غم کا رونا روتا لیکن اقبال اس منظر کو دیکھ کر انسان کی ابدیت کا قائل ہو جاتا ہے اور اس حکمت کو نہایت وثوق سے بیان کرتا ہے۔

اس حصے میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جو انگریزی شاعری سے ماخوذ ہیں اور چند ایسی بھی ہیں جو اپنے انداز کی ندرت کی وجہ سے گو بہ ظاہر انگریزی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت طبعزاد ہیں اور اس امر کا پتا دیتی ہیں کہ شاعر اپنے اظہار کے لیے جدید اسلوب پیدا کر رہا ہے جو معاصرین سے بالکل الگ اور ممتاز ہے۔

بعض نظموں میں فارسی ترکیبوں کی بھر مار ہے ؛ مثلاً ہمالہ ، آفتاب ، شمع ، خفتگانِ خاک سے استفسار ، لیکن بعض حیرت انگیز طور پر سادہ اور آسان واقع ہوئی ہیں۔ ان نظموں کو چھوڑ کر جو ''بچوں کے لیے'' لکھی گئی ہیں ، ایک آرزو ، عقل و دل ، عشق اور موت ، طفلِ شیر خوار ، ترانۂ ہندی ، جگنو ، نیا شوالہ ، ہندوستانی بچوں کا گیت کی زبان بہت سادہ و سلیس ہے۔ ایک آرزو ، ترانۂ ہندی ، نیا شوالہ ، ہندوستانی بچوں کا گیت اور ''تصویرِ درد'' کے ایک دو بند اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ اس زمانے میں اقبال وطنیتِ ہندی اور قومیتِ متحدہ کے تصورات کی طرف مائل تھے اور اہلِ ہند کو جہالت ، نفاق ، امتیازِ ملّت و آئین اور ذوقِ محکومی سے نفرت دلانا چاہتے تھے ؛ ترانۂ ہندی بھی اسی

زمانے کی چیز ہے۔ اس دور میں صرف ایک نظم ''بلال'' ایسی ہے جسے خالص اسلامی کہنا چاہیے ، باقی تمام نظمیں مفکّرانہ یا وطن پرستانہ ہیں۔

اس زمانے میں علامہ نے علمِ سیاستِ مدن پر ایک کتاب ''علم الاقتصاد'' کے نام سے اردو میں لکھی۔ چوں کہ اس کی حیثیت بالکل ابتدائی علمی کوشش کی تھی اس لیے علامہ نے اس کو دوبارہ شائع کرانے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی بلکہ اگر کسی نیاز مند نے اس کا ذکر کیا تو علامہ نے یہ کہ کر ٹال دیا کہ وہ کتاب اب بہت پرانی (آؤٹ آف ڈیٹ) ہو چکی ہے۔

۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر آرنلڈ ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے۔ اقبال کو مولانا میر حسن کے بعد تلمیذانہ وابستگی صرف ڈاکٹر آرنلڈ سے تھی ؛ وہ ان کی روانگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ چناں چہ ''نالۂ فراق'' ایک نظم لکھی جو ''بانگِ درا'' کے صفحہ ۷۳ پر درج ہے۔ اس میں استاد کی عظمت ، اپنی تشنگیِ علم اور عزمِ انگلستان کا اظہار کیا گیا ہے اور فرماتے ہیں :

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

اس کے بعد اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ جانے کا عزم مصمّم کر لیا ؛ کچھ رقم تو اقبال نے اپنی ملازمت کے دوران میں پس انداز کر رکھی تھی اور باقی کے لیے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے یقین دلا دیا۔ مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر فرماتے ہیں : ''میں ۱۹۰۰ء میں بیرسٹری کے لیے انگلستان گیا تھا ؛ شیخ عبدالقادر میرے بعد گئے ؛ میں ہی ان کے استقبال کے لیے سٹیشن پر پہنچا اور شیخ صاحب دو ہفتے میرے ہی ہاں مقیم رہے۔ جب میں ۱۹۰۵ء میں واپس وطن آنے لگا تو شیخ صاحب نے مجھے تاکید کی کہ لاہور پہنچتے ہی شیخ محمد اقبال سے ملنا ، وہ ولایت آنا چاہتے ہیں۔ جو معلومات وہ حاصل کرنا چاہیں ، وہ انھیں مہیا کر دینا۔ میں نے لاہور پہنچ کر موجودہ ریلوے روڈ اور چیمبر لین روڈ کے چوک میں ایک مکان اپنے دفتر کے لیے کرایے پر لیا ، مولوی سید ممتاز علی مرحوم

کے دارالاشاعت کا دفتر قریب ہی تھا۔ ایک دن اقبال مولوی صاحب ہی کی وساطت سے میرے پاس آئے اور ولایت کے سفر، قیام اور تعلیم کے متعلق سوالات کرتے رہے۔ دوسری دفعہ بھی آئے تو مزید معلومات دریافت کیں اور پھر میں نے سنا کہ وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔

"میں نے عدالتِ ضلع میں وکالت شروع کی تھی۔ مولوی احمد دین اور شیخ گلاب دین نامور وکلاء میں سے تھے اور اقبال سے گہرے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ یہ حضرات مجھ سے اقبال کی قابلیت اور شاعری کی اکثر تعریفیں کرتے رہتے۔ میں کہتا تھا کہ افسوس ہے میں اقبال سے کچھ زیادہ خلا ملا پیدا نہ کر سکا۔ اب وہ ولایت سے واپس آئیں گے تو ان سے باتیں ہوں گی۔"

اقبال کو فقرا و اولیا سے گہری عقیدت تھی۔ جب وہ انگلستان کو روانہ ہوئے تو پہلے دہلی میں حضرت نظام الدین (رحمۃ اللہ علیہ) کے مزار پر حاضر ہوئے اور "التجائے مسافر" کے عنوان سے ایک نظم پڑھی "بانگِ درا" کے صفحہ ۹۷ پر درج ہے، پہلا شعر ہے:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا

آگے چل کر گزارش کی ہے کہ:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہمسفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو

اپنے گھر اور والدین کا ذکر کرنے کے بعد مولانا میر حسن کے متعلق فرماتے ہیں:

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

اس کے بعد اپنے برادرِ معظّم شیخ عطا محمد کے متعلق لکھتے ہیں:

وہ میرا یوسفِ ثانی وہ شمعِ محفلِ عشق
ہوئی ہے جس کی اخوّت قرارِ جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفترِ من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

ظاہر ہے کہ یہ دعا لفظ بہ لفظ پوری ہوئی۔ اقبال ملک و ملّت کے لیے مایۂ ناز ہستی بن کر یورپ سے واپس آئے۔ اللہ نے ان کی زبان میں تاثیر بھی عطا فرمائی اور انہوں نے واپس آ کر والدین، استادِ محترم اور برادرِ معظّم کو بہ عافیت اور خوش و خرّم بھی دیکھا۔

تیسری فصل

اقبال یورپ میں

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

ٹرینٹی کالج کیمبرج

۱۹۰۵ء میں اقبال احباب کی نیک خواہشوں اور بزرگوں کی دعاؤں سے لدے پھندے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ روانہ ہوئے اور وہاں پہنچتے ہی کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخل ہو گئے۔ چوں کہ مشرقی علوم میں بہرۂ وافی رکھتے تھے اور عمیق غور و فکر کی عادت تھی اس لیے روز اول ہی سے اپنے ہم سبق طلبہ خصوصاً ایشیائی ممالک کے نوجوانوں میں بےحد مقبول و ممتاز ہو گئے۔ بڑے بڑے باکمال اساتذہ کو بھی اس ہندی نوجوان کی امتیازی قابلیتوں کے باعث اس سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ پروفیسر آرنلڈ تو خیر اقبال کے پرانے استاد تھے، مشہور معلمِ فلسفہ پروفیسر میک ٹیگرٹ سے اقبال نے اپنے مخصوص مضمون یعنی فلسفے کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔ پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن سے ملاقاتیں ہوئیں۔ عربی و فارسی کی تحصیل و تحقیق کا ذوق و شوق جو ان دنوں انگریزی کے مقابلے میں کسی قدر دب گیا تھا، ازسرِ نو تازہ ہو گیا اور اقبال نے پی ایچ-ڈی-کی ڈگری کے لیے ایران کے فلسفۂ مابعد الطبیعی کا مضمون منتخب کیا اور قرار دیا کہ یہ ڈگری میونک (جرمنی) یونیوسٹی سے حاصل کی جائے۔ چناںچہ اس کے لیے وہ جرمنی بھی گئے اور برلین، میونک، ہائیڈل برگ اور دوسرے مقامات پر تحقیق و تفتیشِ علمی میں مصروف رہے۔

تصوّف اور شعر

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے ذہن میں مختلف مشغولیتوں کی وجہ سے ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ابتدائی تربیت اور خاندانی رجحان کے اثر سے تصوف کی طرف مائل تھے۔ پی ایچ-ڈی- کے مقابلے کے لیے مطالعہ و تحقیق کے دوران میں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ مروجہ تصوف کے اکثر پہلو اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس سے مغائر ہیں۔ اس زمانے کے چند سال بعد جب لاہور میں راقم الحروف اقبال سے ملا تو ایک صحبت میں انھوں نے بڑے شد ومد سے فرمایا کہ میں نے شیخِ اکبر محی الدین ابنِ عربی کی "فصوص الحکم" اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی "حکمۃالاشراق" کوئی دس دس دفعہ بالاستیعاب اور نہایت غور و خوض سے پڑھی ہیں۔ ان بزرگوں کے علم و ذوق میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کتابوں کے اکثر مندرجات کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ کم از کم میں انہیں عقائد و تعلیماتِ اسلامی سے تطابق نہیں دے سکتا۔ اسی زمانے میں علامہ نے خواجہ حسن نظامی کی وساطت سے اور بہ راہِ راست بھی مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواری سے خط و کتابت کی۔ مقصود یہ تھا کہ اپنے مقالے کی تیاری کے لیے تصوف اور وحدت الوجود کے متعلق زمانے کے ممتاز صوفیہ سے بھی مذاکرہ ہو جائے۔ آپ نے شاہ صاحب سے جو استفسارات کیے ان کا مفاد یہ تھا کہ (۱) قرآن حکیم میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں، ان کا پتا دیجیے۔ (۲) وحدت الوجود کا مسئلہ کن کن آیات سے نکلتا ہے؟ (۳) تاریخی اعتبار سے اسلام اور تصوف کا کیا تعلق ہے؟ (۴) کیا حضرت علیؓ کو کوئی پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ شاہ صاحب نے ان سوالات کے جوابات دیے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان سے علامہ کی تسکین نہیں ہوئی۔ یہ خط و کتابت کا سلسلہ طویل وقفوں

سے ۱۹۱۶ء تک جاری رہا ۔ جب علامہ نے مثنوی "اسرار خودی" کا
ایک نسخہ شاہ صاحب کی خدمت میں ارسال کرکے ان کی رائے طلب
کی تو خواجہ حسن نظامی نے بھی دوسرے صوفیوں کی طرح مثنوی کے
اس حصے پر اعتراضات کیے تھے جس میں خواجہ حافظ کے متعلق چند
اشعار شامل تھے ۔ شاہ صاحب نے علامہ کے اشعار و اقوال کا جواب یہ
دیا "صحابہ کرام رض میں جوش و مستی کا غلبہ تو ہوتا تھا مگر
وہ اس میں پڑے نہیں رہتے تھے بلکہ انہوں نے عالم صحو میں نشو و نما
پائی ۔ سُکر میں چوں کہ نقص ہے اس لیے خدا نے ان کو اس حالت میں
نہ رکھا اور وہ تمام عالم کے لیے کامل و مکمل ہوئے ۔ پھر وہ حافظ
شیراز کی طرح 'خودگویم و خود رقصم ، خود چنگ خوش آوازم' کا مصداق
کیوں کر رہ سکتے تھے" یعنی دوسرے لفظوں میں شاہ صاحب نے اقبال
کی تائید فرمائی اور تسلیم کیا کہ حافظ شیراز کا عالم ، عالمِ صحو
نہیں بلکہ عالمِ سکر ہے اور سکر نقص کی دلیل ہے ۔

(حسن مثنیٰ ندوی نے رسالہ "ریاض" کراچی، جنوری و مارچ ۱۹۵۵ء
کے دو پرچوں میں شاہ صاحب اور علامہ کی خط و کتابت نقل کی ہے ،
تفصیل کے لیے یہ پرچے دیکھنے چاہییں) ۔ اقبال کا دوسرا مشغلہ شعر تھا ،
اس میں بھی وہ گو مگو میں پڑے ہوئے تھے ۔ ادبی و لسانی تربیت تمام تر
مشرقی اور اسلوبِ اظہار کا نیا تقاضا مغربی ۔ چناں چہ انہوں نے اکثر
ایسی نظمیں لکھیں جو مغربی شعرا کے اندازِ فکر کا چربہ معلوم ہوتی تھیں ۔
علاوہ بریں وہ کبھی کبھی غزلیں بھی کہہ لیتے تھے ۔ اس
صورت حالات میں ایک دفعہ انہوں نے ترکِ شعر کا ارادہ کر لیا
اور اپنے احباب سے بھی کہہ دیا کہ اب میں شعر نہیں کہوں گا ۔
شیخ عبدالقادر ان دنوں انگلستان ہی میں تھے ۔ انہوں نے کہا کہ
آپ کا انداز اساسی طور پر مشرقی ہے اور آپ کی شاعری ملک و قوم

کے لیے بے حد مفید ہو سکتی ہے ، اس لیے فکرِ شعر کے ترک کا
ارادہ مناسب نہیں ۔ بہت سی حیص بیص کے بعد دونوں دوست پروفیسر
آرنلڈ کے پاس گئے اور ان سے اس معاملے میں مشورے کے طالب
ہوئے ۔ بوڑھا استاد نوجوان شاگرد کی صلاحیتوں سے باخبر تھا ، اس
نے اقبال کو ایسے ارادے سے روکا اور کہا کہ آپ کو ضرور
شعر کہتے رہنا چاہیے اور اس مشغلے کو چھوڑ دینا بڑا ظلم ہو گا ؛
چناں چہ اقبال نے اپنا فیصلہ منسوخ کرکے استاد کے فیصلے کے آگے سر
تسلیم خم کر دیا ۔

انگلستان اور جرمنی میں اقبال کی متعلمانہ زندگی کے متعلق بعض
کارآمد تفصیلات عطیہ بیگم فیضی کے مجموعۂ 'خطوطِ اقبال' سے ملتی ہیں ۔
اگرچہ اس کتاب میں اقبال کے بعض خطوط اور معلمین و متعلمین
کی بعض مجالس کے حالات کے سوا کچھ نہیں لیکن چوں کہ یہ مآخذ
صحیح ، معاصرانہ اور مستند ہیں اس لیے ان کی قدر و قیمت سے انکار نہیں
کیا جا سکتا ۔ ذیل میں ان مآخذ سے استفادہ کیا جائے گا ۔ اگرچہ اقبال
لاہور سے ایم۔اے کرنے کے بعد انگلستان گئے تھے لیکن کیمبرج کے ٹرینٹی
کالج میں داخلہ لے کر از سر نو گریجویٹ ہونا پڑا ۔ چناں چہ انہوں نے
وہاں سے بی۔اے کی ڈگری لی ۔ اس وقت تک انگلستان کے مقیم ہندوستانیوں
میں اور انگلستان کے تعلیم وتعلّم کے حلقوں میں اقبال کی حاضر دماغی ، قابلیت
اور علمی فضیلت کا خاصا چرچا ہو گیا تھا ۔ مس بیک لندن میں ہندوستانی
طلبہ کی امداد ، دیکھ بھال اور خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں اور
کبھی کبھی اپنے ہاں ان کو کھانے کی دعوت دے کر باہم ملاقات اور
مبادلۂ خیالات کا موقع بھی دیا کرتی تھیں ۔ اس زمانے میں عطیہ بیگم بھی
انگلستان میں تحصیلِ علم کے لیے مقیم تھیں ۔ مس بیک نے یکم اپریل ۱۹۰۷ء
کو عطیہ بیگم کے نام ایک دعوت نامہ بھیجا جس میں انہیں

بتایا کہ آج آپ کی ملاقات ایک قابل آدمی محمد اقبال سے ہوگی جو کیمبرج سے محض آپ کی ملاقات کے لیے یہاں وارد ہوا ہے۔ عطیہ بیگم نے اُس وقت تک اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا لیکن چوں کہ مس بیک کی دعوت تھی اس لیے وہ پہنچ گئیں۔ کھانے کی میز پر

زباں داں، ظریف اور طنّاز

محمد اقبال موجود تھے۔ عطیہ بیگم لکھتی ہیں: "میں نے دیکھا کہ وہ فارسی، عربی اور سنسکرت میں در خور واق رکھتے تھے۔ حاضر جواب، ظریف اور طنّاز تھے، گفتگو میں کسی مخاطب کی ذرا سی کمزوری سے بھی فائدہ اٹھا جاتے تھے اور حاضرین پر تابڑ توڑ چوٹیں کرتے چلے جاتے تھے۔ حافظ پر گفتگو شروع ہوئی تو انہوں نے اس شاعر کے کمالات کا اعتراف کیا بلکہ یہ کہا "جب میں حافظ کے موڈ میں ہوتا ہوں، اُس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت حافظ میں جذب ہوجاتی ہے۔ گویا میں خود حافظ بن جاتا ہوں"۔ اس دن اقبال نے ایک اور فارسی شاعر کا ذکر بھی کیا جس کو ہندوستان میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ تم بابا فغانی کا کلام ضرور پڑھو کیوں کہ زندگی کے متعلق ان کا تصور بہت مختلف اور دل چسپ ہے۔

داخلی و خارجی شخصیتیں

چند روز بعد اقبال نے مجھے ایک تناول خانے میں کھانے کی دعوت دی جس میں چند جرمن سکالر بھی شامل ہوئے جن کے ساتھ اقبال اُن دنوں ریسرچ کا کام کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس ڈنر میں ہر چیز نہایت آراستہ و پیراستہ اور باقاعدہ اور خوش نما ہے؛ میں نے اس حسنِ ترتیب کی داد دی تو اقبال نے کہا:

"میرے قالب میں بہ‌یک وقت دو شخصیتیں ہیں: بیرونی شخصیت نہایت عملی اور کار و باری قسم کی ہے اور اندرونی

علامہ اقبال

شخصیّت تخیّل—تصوّف اور تصوّر کا پیکر ہے۔“

اس تقریب پر جرمن سکالروں اور اقبال کے ساتھ جو گفتگو ہوئی، وہ بے انتہا دل آویز اور بے حد معلومات افزا تھی۔ اس کے جواب میں میں نے ۱۵ اپریل کو ایک دعوت چائے دی، جس میں اقبال کے علاوہ بعض دوسرے صاحبانِ علم و فن بھی تھے، مثلاً مس سیلوسٹر اور مس لیوی جو انسانیات اور فلسفے کی طالبات تھیں اور موسیو مانرل اور ہیرمیزٹراتھ جو مشہور موسیقار تھے۔ یہ مجلس بے حد پُر رونق اور درخشاں تھی۔ اِدھر اقبال فی‌البدیہ اشعار سنا رہے تھے، اُدھر وہ لڑکیاں چہک رہی تھیں۔ میں نے ارادہ کیا کہ اقبال کے اشعار لکھ لوں، اس پر اقبال نے کہا ”اس قسم کے اشعار صرف وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں، بس پڑھے گئے اور قصہ ختم ہوا، ان کو نقل کرنا بے کار ہے“۔ موسیقاروں نے نغمہ و ساز کی دل‌فریبیوں سے ہمیں مسحور کر دیا اور یہ محفل مدت تک سب کو یاد رہی۔

۲۲ اپریل کو عطیہ بیگم، اقبال اور شیخ عبدالقادر لندن سے کیمبرج کو روانہ ہوئے اور سید اور بیگم سید علی بلگرامی کے ہاں پہنچے جہاں اقبال نے عطیہ بیگم کا تعارف کرایا۔ اس موقع پر بھی نہایت بلند پایہ علمی مذاکرات ہوئے۔ عطیہ بیگم کہتی ہیں کہ کبھی کبھی اقبال ماندہ و افسردہ معلوم ہوتے تھے اور بادی‌النظر میں محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ ایک حرف زبان سے نہ نکالیں گے لیکن جہاں کسی ہم صحبت شخص کی زبان سے کوئی قابلِ جواب فقرہ نکلا، اقبال کا فقرہ بجلی کی طرح کوند گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اقبال کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ جب وہ بہ ظاہر تھکا ماندہ اور افسردہ ہو تو گویا کسی مدِ مقابل پر چوٹ کرنے کے لیے تیاری میں مصروف ہوتا ہے۔ اس سے مجھے مسٹر گلیڈسٹون یاد آگئے جو پارلیمنٹ میں اسی

طرح غیر متوقع طور پر ایسی چوٹ کرتے تھے کہ مدمقابل ہو کھلا جاتا تھا۔

زندگی اور موت

یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر کیمبرج میں ایک پکنک ہوئی۔ دریا کے کنارے ایک بڑے درخت کے سائے میں متعدد ذی علم لوگ جمع تھے۔ پروفیسر آرنلڈ باتیں کرتے کرتے موت و حیات کے مسئلے پر بحث کرنے لگے۔ گونا گوں خیالات کے اظہار سے مباحثہ پیچیدہ سا ہو گیا۔ اقبال خاموش بیٹھے تھے، پروفیسر آرنلڈ ان سے کہنے لگے: ”آپ بھی تو کچھ کہیے“۔ اقبال نے چمک کر کہا: ”زندگی موت کی ابتدا ہے اور موت زندگی کا آغاز ہے“، بس اس جامع فقرے پر بحث ختم ہو گئی۔

استاد اور شاگرد

۹ جون کا ذکر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ایک ڈنر پر اقبال بھی تھے۔ پروفیسر نے ذکر کیا کہ جرمنی میں نہایت نادر عربی مخطوطہ بر آمد ہوا ہے جس کی تصحیح اور جس کے اقتباس کے لیے میں اقبال کو بھیجنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس ذمہ دارانہ کام کے لیے صرف یہی موزوں رہیں گے۔ اقبال نے گزارش کی کہ اپنے استاد کے مقابلے میں میں بالکل طفلِ مکتب ہوں۔ پروفیسر نے کہا کہ نہیں، میری رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں شاگرد استاد سے بہت بہتر ثابت ہوگا۔ اقبال نے خفیف سے طنزیہ لہجے میں جواب دیا: ”جناب والا! اگر آپ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں تو میں اپنے استاد کی رائے کو تسلیم کرتا ہوں اور اس کے احکام کی تعمیل کروں گا“۔ پروفیسر آرنلڈ اقبال کا مطلب سمجھتے تھے اور متیقّن تھے کہ اس معاملے میں اقبال اُن سے بہتر قابلیت رکھتے ہیں لیکن یہ ساری گفتگو اس قدر نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ہوئی کہ صرف اہلِ علم ہی اس کے اہل ہو سکتے ہیں۔

دل چسپ محفلیں

۲۳ جون کو عطیہ بیگم کے مکان پر چند انگریز اور ہندوستانی مہمان جمع ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری نے گانا سنایا، لارڈ سنہا کی لڑکیوں (کومولا اور رومولا) نے بھی موسیقی میں اپنا کمال دکھایا۔ اقبال نے تمام شرکاءِ مجلس کے متعلق فی البدیہ ایسے اشعار سنائے کہ سب سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ۲۷ جون کو ایک جرمن خاتون مس شولی نے دوستوں کو ہندوستانی کھانے کی دعوت دی۔ عطیہ لکھتی ہیں کہ میں وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ اقبال وہیں مقیم ہیں اور "ہندوستانی کھانے" تیار کرنے میں مس شولی کو نہایت ماہرانہ مشورے دے رہے ہیں۔ یہ کھانا واقعی لذیذ تھا۔ یہاں سے سب لوگ امپیریل انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ تقریب میں چلے گئے، جہاں بڑی رونق تھی اس لیے کہ قصر شاہی کے اکابر بھی موجود تھے (یعنی شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے شہزادے شہزادیاں)۔ سب حاضرین دل‌چسپی کا اظہار کر رہے تھے لیکن اقبال بار بار کہہ رہے تھے "یہ ایک دل‌چسپ تضیع اوقات ہے"۔

۲۹ جون کو ایک معزز خاتون لیڈی ایلیٹ نے ایک پارٹی دی جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ دفعتاً مس سروجنی داس نہایت پُر تکلف لباس اور جھلملاتے ہوئے زیوارت پہنے جھم جھم کرتی سامنے آن موجود ہوئیں۔ لوگ ان کے اس ذوقِ پست کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ انھوں نے دفعتاً اقبال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "میں تو صرف آپ سے ملنے کے لیے یہاں آ گئی ہوں"۔ اقبال کی طبیعت کا شعلہ چمکا اس نے کہا :

"تو یہ صدمہ اس قدر ناگہانی ہے کہ میں نہیں سمجھتا اس کمرے سے زندہ سلامت باہر جاسکوں گا"۔

جولائی کے آغاز تک اقبال جرمن زبان کے امتحان کے سلسلے میں "تاریخِ عالم" لکھ چکے تھے۔ اس کے بعد چند روز میں اقبال نے اپنے مقالات احباب کو سنائے اور جولائی کے تیسرے ہفتے میں جرمنی چلے گئے۔

عطیہ بیگم ایک اور مجلس مکالمہ کا حال سناتی ہیں کہ ۲۳ جولائی کو لندن میں بعض ہندوستانی جمع ہوئے تو ایک طالب علم پرمیشر لال نے ذکر کیا کہ میرے پاس وطن سے جو خطوط آئے ہیں، اور ایک اُردو کا رسالہ "مخزن" موصول ہوا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے جو قوم پرستانہ نظمیں اور گیت لکھے ہیں، ان سے شمالی ہند کے کوچہ و بازار اور مدرسے اور گھر گونج رہے ہیں اور ان سے قوم پرستی کا ایک ایسا جذبہ بیدار ہوگیا ہے جس کی مثال ہندوستان میں اس سے پیش‌تر موجود نہ تھی۔ اس کے بعد اس طالب علم نے وہ نظمیں گا کر سنائیں۔ سب ہندوستانی اس سے آواز ملا کر گانے لگے اور ہال گونج اٹھا۔

جب شور ذرا کم ہوا تو عطیہ بیگم نے اقبال کا جرمنی سے آیا ہوا تازہ خط پڑھا۔ یہ خط جرمن زبان میں لکھا ہوا تھا۔ تعلیم یافتہ لوگ اس خط کی زبان اور اسلوبِ تحریر کی پاکیزگی پر بے حد متعجب ہوئے بلکہ پروفیسر آرنلڈ نے بڑی منت سماجت سے یہ خط عطیہ سے لے لیا کہ میں اس خط کو بہ‌طور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھوں گا۔ اس سے پہلے بھی پروفیسر آرنلڈ اقبال کے دو مسودے عطیہ بیگم سے چھین کر محفوظ کر چکے تھے۔

اقبال کی استانیاں

جرمنی میں اقبال کا زیادہ وقت ہائیڈل برگ میں بسر ہوا کیوں کہ ایک تو اس یونیورسٹی میں ان کے مقالے کے متعلق تحقیق و تدقیق کی سہولتیں زیادہ تھیں، دوسرے یہ شہر جرمنی کے سیاسی مرکزوں سے الگ تھلگ نہایت سکون سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اقبال بہت جلد بے تکلف اور مخلی بالطبع ہوگئے لیکن وہاں کی علمی فضا اتنی وقیع و متین تھی کہ اقبال نے اپنی لندن والی شوخی، طراری اور طنازی کو ترک کرکے انکسار اختیار کر لیا۔ دو جوان اور حسین پروفیسر عورتیں، فراؤ پروفیسر واژناسٹ اور فراؤ پروفیسر سینے شال اقبال کی استاد تھیں جو انھیں فلسفے کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم

دیتی تھیں ۔ یونیورسٹی کے تدریسی معمولات کے علاوہ ہر طالب کشتی رانی ، موسیقی ، باغبانی اور کوہ پیمائی وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کرلیتا تھا اور کبھی کبھی اقبال بھی ان مشغلوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے ۔ یونیورسٹی ہاسٹل میں کوئی ایک سو طالب علم اور پروفیسر رہتے تھے اور اس ہاسٹل کی منتظمہ ایک ستر سال کی بزرگ خاتون فراؤ پروفیسر ہیرن تھیں جو پورے ہائیڈل برگ میں قابل ترین استاد تسلیم کی جاتی تھیں اور موسیقی میں بے حد مہارت رکھتی تھیں ۔ اس یونیورسٹی میں معلم و متعلم کا معیارِ زیست بالکل یکساں تھا اور بادی النظر میں ان کے درمیان امتیاز کرنا دشوار تھا ۔ صرف تعلیم و تدریس کے اوقات میں یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ طلبہ کون کون ہیں ۔ ان کے پروفیسر کون کون ہیں اور ان کے مبلغِ علم کا کیا عالم ہے ۔ ہاسٹل میں طلبہ تو اپنے قیام و طعام کے لیے مقررہ فیس ادا کرتے تھے لیکن پروفیسروں کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ ان کے قیام و طعام کا انتظام بلا معاوضہ کیا گیا تھا ۔

دن بھر کی رسمی تعلیم کے خاتمے پر طلبہ اور پروفیسر پاس ہی ایک دریا کے کنارے کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے اور وہاں دونوں خاتون پروفیسریں جرمن ، یونانی اور فرانسیسی فلسفے پر طلبہ سے مذاکرہ شروع کر دیتیں ۔ اقبال ان کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوتے اور ایک ایک لفظ کو بغور سنتے ، خصوصاً وہ فراؤ سینے شال کی معلوماتِ علمی سے بہت مرعوب تھے اور جب کبھی وہ اقبال کے کسی غلط جواب پر انہیں ٹوکتیں تو اقبال سکول کے ایک بچے کی طرح پشیمان ہوتے ۔ اس بے تکلف علمی مجلس کے بعد یہ سب لوگ کافی ہاؤس سے نکل کر پاس ہی ایک پہاڑی پر چڑھ جاتے جس پر پہنچنے کے لیے ایک ہزار سیڑھیاں طے کرنی پڑتی تھیں ۔ اور سب لوگ تکان سے بچنے کے لیے گاتے ہوئے چڑھتے لیکن یہ گانا اکثر نہایت بے سرا ہوتا تھا ۔ اقبال کہا کرتے تھے کہ وادی نیکر کا بہترین منظر اسی پہاڑی سے دیکھا جا سکتا ہے ۔

اقبال پر عالمِ استغراق

۲۲ اگست کو ایک عجیب واقعہ ہوا : طلبہ اور پروفیسروں نے ایک پکنک کا انتظام کیا اور ہر شخص کو اس کے مسکن سے ساتھ لیتے گئے ۔ اقبال کا مسکن اس راستے پر آخری تھا ۔ وہاں پہنچے تو اقبال پکنک پر جانے کے لیے تیار ہونے کے بجائے ایک عالمِ مدہوشی میں خاموش اور بے حرکت بیٹھے تھے ۔ معلوم ہوا کہ وہ شبِ گزشتہ ہی سے اس عالم میں ہیں ، سامنے ایک کتاب رکھی ہے اور بالکل پتھر کے بت کی طرح اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر بیٹھے خلا میں گھور رہے ہیں ۔ طلبہ یہ دیکھ کر بے حد حیران ہوئے اور دونوں خاتون پروفیسروں کی تشویش تو لاانتہا تھی ۔ طرح طرح کے اندیشوں کی وجہ سے کوئی اقبال کے پاس نہ پھٹکتا تھا ، آخر عطیہ بیگم نے جرأت کی اور اقبال کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا ، جس پر وہ کسی قدر ہوش میں آئے ۔ عطیہ بیگم نے کہا کہ آپ ہندوستان میں نہیں بلکہ جرمنی میں ہیں ۔ یہاں آپ کے ان حالات و واردات کو نہ کوئی سمجھے گا اور نہ ان کی قدر کرے گا اس لیے "سُکر" کو چھوڑ کر "صحو" کی حالت میں آئیے ۔ اس کے بعد اقبال بالکل ہوش میں آ گئے اور پکنک میں شریک ہوئے جس کے آخر میں انہوں نے اپنے نفسیاتی واردات کے متعلق عطیہ سے گفتگو کی ۔

ہائیڈل برگ کے معلمین و متعلمین اسی طرح پڑھتے لکھتے اور ہنستے کھیلتے رہتے تھے اور اقبال اپنی علمی و تفریحی خصوصیتوں کی وجہ سے ان میں ممتاز درجہ رکھتے تھے ۔ ۲۵ ۔ اگست کو یہ قافلہ "آسمانی باغ" کو روانہ ہوا جس کو اقبال "باغِ فردوس" کہا کرتے تھے ۔ اس باغ میں کسی پرانے بادشاہ نے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں تعمیر کر رکھی تھیں جن میں ایک مسجد بھی تھی ۔ باغ آبشاروں ، جھیلوں ، خوش نما نشست گاہوں اور گوناگوں پھلوں اور پھولوں سے آراستہ اور مالا مال تھا ۔ مسجد بہت شان دار تھی اور اس کے چاروں طرف اللہ تعالیٰ کے اسماء عربی حروف میں کندہ تھے بلکہ بعض مقامات پر آیاتِ قرآنی بھی ثبت تھیں ۔ سب نے چاہا کہ

اقبال انہیں ان آیات کا مطلب سمجھائیں ، اس پر اقبال نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ قصّہ سنایا :

> ''ایک تھا بادشاہ ، اس کو ایک دن جنّت کی ایک حور نظر آئی جس پر وہ بری طرح فریفتہ ہوگیا اور اس سے کہنے لگا کہ تم میری ملکہ بن جاؤ ۔ حور نے کہا کہ میں تمہاری ملکہ بننے کو تیار ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور ایک مسجد تعمیر کرو ، بس اسی مسجد میں تم سے نکاح پڑھوالوں گی ۔ بادشاہ نے حور کے حکم کی تعمیل کی ، مسجد تیار ہوئی ، بادشاہ کا حور سے نکاح ہوگیا ۔''

اس گھڑنت پر ہندوستانی طلبہ تو ہنسنے لگے لیکن اقبال ایسے متین و سنجیدہ رہے کہ دوسروں کو اس واقعے کے تاریخی ہونے کا یقین ہوگیا ۔

۲۸ اگست کو اقبال میونک گئے ۔ اس سے قبل انہوں نے اپنے اولین اسباق میونک ہی میں حاصل کیے تھے اور پروفیسر ران کی حسین و طرح دار بیٹی آن کی معلّم و اتالیق رہی تھی ۔ جب اقبال دوسرے طلبہ کے ساتھ پروفیسر ران سے ملنے گئے تو دوران ملاقات میں ان کی صاحب زادی نے اقبال کا امتحان لینے کی غرض سے بعض سوالات کیے اور اگرچہ اقبال ہائیڈل برگ میں رہ کر مزید بہت کچھ سیکھ چکے تھے ، لیکن اس کے باوجود اس خوب صورت معلّمہ نے اپنے اعتراضات سے اقبال کو خاصا پریشان کیا ۔ اس کے بعد وہ حسینہ پیانو پر جا بیٹھی اور موسیقی کے بعض نغمے ایسی خوبی سے گائے کہ سب لوگ اس کے فنی کمالات پر دنگ رہ گئے ۔ اسی معلمہ کے زیر نگرانی اقبال نے اپنا وہ مشہور مقالہ مرتّب کیا تھا جس پر انہیں میونک یونیورسٹی نے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی ۔

اس کے بعد اقبال واپس ہائیڈل برگ آ گئے اور کچھ مدت گزرنے پر لندن واپس چلے گئے تا کہ بیرسٹری کی تکمیل کریں ۔ اُن دنوں پروفیسر آرنلڈ لندن

یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے ۔ انہوں نے چھ مہینے کی رخصت حاصل کی تو اقبال ان کی جگہ عربی کے معلّم مقرر کر دیے گئے ۔

سیّد امیر علی شاہ کے ساتھ

مئی ۱۹۰۸ء میں بہ‌مقام ویسٹ منسٹر (لندن) کیکسٹن ہال میں امیر علی ایم ۔ اے ۔ سی ۔ آئی ای کے زیر صدارت مسلمانان مقیم لندن کا اجلاس ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کا افتتاح کیا گیا ۔ سید امیر علی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے ، ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا مجلس عاملہ کے ممبر چنے گئے ۔ قواعد و ضوابط وضع کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی جس میں سید امیر علی کے ساتھ میجر سید حسن بلگرامی اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل کیے گئے ۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں اقبال ''بی ۔ اے (کیمبرج) پی ایچ ۔ ڈی (میونک) بیرسٹر ایٹ لا ''، بن کر واپس وطن تشریف لے آئے ۔

تجسّس

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے جو نظمیں اور غزلیں لکھیں ، ان کی تعداد بہت کم ہے ۔ ''بانگِ درا ''، سے معلوم ہوتا ہے کہ تین ساڑھے تین سال کی مدت میں انہوں نے چھوٹی بڑی کل چوبیس نظمیں اور چند غزلیں کہیں ۔ یہ بھی کچھ اپنی طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ شیخ عبدالقادر کی تحریک پر لکھی گئیں جو ''مخزن ''، کے لیے آئے دن نظموں کا مطالبہ کرتے رہتے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے تمام تر اوقات حصولِ علم و فن کے لیے صرف کر رہے تھے اور مشغلۂ شعر کو معرضِ التوا میں ڈال رکھا تھا ۔ ان نظموں اور غزلوں سے جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک لکھی گئیں ، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں تجسّس و تفحّص نے بعض اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں جن کو سلجھانے کے لیے وہ بار بار حسن و عشق کے سائے میں پناہ لے رہا ہے لیکن پھر بھی اس کے دماغ میں بعض ایسے سوالات اُبھر رہے ہیں ، جن کا جواب اس کو نہیں ملتا ۔ ''محبت''، ، ''حقیقتِ حسن ''، ، ''حسن و عشق ''، ، ''کسی کی گود میں بلی دیکھ کر ''، ، ''وصال ''، ، '' سلیمیٰ ''، ، '' حسن ''،

وغیرہ خالص حسن انسانی اور جذباتِ عشق پر مبنی نظمیں ہیں؛ ''اخترِصبح ''، '' کلی ''، '' چاند تارے ''، '' ایک شام '' حسن فطرت سے متعلق ہیں۔ لیکن بعض نظموں میں انسان کی بے چارگی اور تحیّر کا احساس واضح ہے۔مثلاً '' انسان '' (قدرت کا عجیب یہ ستم ہے) ، '' فراق ''۔ لیکن سب سے زیادہ نمایاں تغیّر یہ نظر آتا ہے کہ وطن پرستی اور قوم پسندی کے وہ جذبات و خیالات جو یورپ جانے سے پیش تر شاعر کے دل و دماغ پر حاوی تھے ، ان کی گرفت بے حد نرم پڑ چکی ہے۔

وطنیّت سے نفرت

وطن سے باہر جا کر اقبال کو یہ احساس ہوا کہ قوم پرستی مسلمانوں کے مرض کا مداوا نہیں کیوں کہ مغرب کی جن قوموں نے اس اصولِ زندگی کو اختیار کیا ہے ، وہ انتہا درجے کی خود غرض ہوگئی ہیں؛ ملک گیری اور استحصال کی حرص و آز نے ان کو بلند اخلاقِ انسانی سے محروم کر دیا ہے۔ اگر قوم پرستی اسی غرض پرستی اور لوٹ کھسوٹ کا نام ہے تو یہ کسی آبرو مند قوم کا نصب العین نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں جب اقبال نے دنیائے اسلام کے جمود ، مسلمانوں کی بے عملی اور تعلیماتِ اسلامی کی کس مپرسی کو دیکھا تو انھوں نے اپنے ابتدائی خیالات سے رجوع کرکے اپنا مسلک یہ قرار دیا کہ ملتِ اسلامی کو بیدار کیا جائے ، اس کو اقدار و اخلاقِ اسلامی سے از سرِ نو آشنا بنایا جائے اور اس بھٹکے ہوئے آہو کو پھر حرم کا رستہ دکھایا جائے۔ ان کو صاف نظر آ گیا کہ مغربی تہذیب و ترقی کی بنیاد اخلاقِ عالیہ کی چٹان پر نہیں بلکہ زر پرستی کی ریت پر ہے اس لیے یہ عمارت مستقبل قریب میں پیوندِ خاک ہونے والی ہے ؛ چناں چہ ''زمانہ آیا ہے بےحجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا ''، والی نظم میں انھوں نے واشگاف طور پر اپنے خیال کو ظاہر بھی کر دیا۔

قومیّتِ اسلامی

اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے لیے اخلاقِ عالیہ کی بنیاد تلاش کرتے۔چوں کہ

انھوں نے بزرگانِ اسلام کے زیر نظر پرورش پائی تھی اور دین اسلام کے معارف و حقائق اُن پر آئینہ تھے اس لیے انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے پاس آبرومندانہ زندگی کے لیے نہایت سنگین و مستحکم بنیاد موجود ہے جس پر تہذیب ، ترقی اور سربلندی کا قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ راقم الحروف سے فرمایا کہ یورپ میں میں جس انداز کی نظمیں کہتا تھا ، اگر اسی انداز پر قائم رہتا تو کبھی کا '' نوبل پرائز '' پا چکا ہوتا لیکن میں نے تہذیبِ مغربی کی کیفیت اور ملتِ اسلامیہ کی حالت کو دیکھ کر یہی فیصلہ کیا کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ہر ایسے مسلمان کو جسے قدرت سے کوئی استعداد ودیعت ہوئی ہے، چاہیے کہ اپنی پوری طاقت مسلمانوں کی خدمت اور اسلام کی بزرگ داشت کے لیے وقف کر دے۔ یہ ہزار '' نوبل انعامات '' سے بہتر ہے۔

اس دور کی نظموں میں ''علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام'' اور ''عبدالقادر کے نام '' جو نظمیں لکھی گئیں ، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمتِ ملت کا جذبہ اقبال کے قلب میں قیامت برپا کر رہا تھا۔ '' صقلیہ '' میں درد و سوز کی جو کیفیت ہے ، وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس کی عظیم الشان تاریخ یاد دلا کر بیدار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ اب ''ہمالہ''، '' نیا شوالہ ''، '' گایتری ''، '' میرا وطن وہی ہے '' کا دور گزر چکا تھا ، '' ملکی ترانے '' کی لے غائب ہو چکی تھی اور اقبال اپنے لیے ایک نیا راستہ تجویز کر چکا تھا۔

دوسرا باب

اقبال زندگی کی شاہ راہ پر

پہلی فصل

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک

” ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی ۔ بیرسٹرایٹ لا۔ “

مراجعت

اقبال انگلستان سے واپس آ کر بمبئی ، دہلی اور انبالے میں بعض احباب سے ملتے ملاتے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ دوپہر کی ٹرین سے لاہور پہنچے ۔ ریلوے سٹیشن پر ہر مذہب و ملّت کے معززین اور اقبال کے احباب کثرت سے موجود تھے جنھوں نے ان کا پُر جوش استقبال کیا ۔ یہاں سے احباب انھیں بھاٹی دروازے لے گئے ، جہاں باغ میں شامیانے نصب کرکے دعوتِ چائے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ شیخ گلاب دین وکیل سب دوستوں کی طرف سے اہتمام پر مامور تھے ۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر اسی دن سیال کوٹ روانہ ہو گئے تاکہ بزرگوں اور عزیزوں کے دیدار سے آنکھیں روشن کریں ، جو تین سال سے ان کے لیے چشم براہ تھے ۔

پیشۂ وکالت

تین چار دن کے بعد علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سیال کوٹ سے آکر مرزاجلال الدین بیرسٹر سے ملے اور علامہ کے لیے دفتر کرایے پر لینے کا کام ان کے سپرد کیا؛ چناں چہ موہن لال روڈ پرگلاب سنگھ کے مطبع مفیدِ عام کے پاس علامہ کے لیے ایک مکان کرایے پر لے لیا گیا (موہن لال روڈ کو آج کل اردو بازار کہتے ہیں ۔ یہ مکان مطبع مفیدِ عام کے بالکل سامنے واقع ہے اور آج کل

اس میں سٹیشنری کی دکان ہے) - قانونی کتابوں کی لائبریری کا انتظام بھی کیا گیا اور منشی طاہر الدین مرحوم علامہ کے منشی مقرر کیے گئے - علامہ کے احباب کا منشا یہ تھا کہ وہ عدالت ہائے ضلع میں پریکٹس کریں اور اسی وجہ سے انھوں نے کچہری کے قریب دفتر کا بندوبست کیا تھا ،لیکن مرزا صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ اس دفتر میں صرف دو تین ماہ رہے کیوں کہ وہ ضلع میں پریکٹس کرنا پسند نہ کرتے تھے - چوں کہ انھوں نے چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا چیف کورٹ کے قرب کی وجہ سے انارکلی بازار کا وہ بالا خانہ کرائے پر لے لیا، جس میں سر محمد شفیع مدت تک رہ چکے تھے اور جو ایک مشہور وکیل کی وجہ سے خاصا مشہور ہو چکا تھا - اس مکان میں علامہ ۱۹۲۲ء تک مقیم رہے - اسی میں ان کی سکونت تھی اور اسی میں دفتر تھا ، بلکہ منشی طاہرالدین بھی اسی مکان کے عقبی حصے میں رہنے لگے - مدت ہوئی یہ مکان منہدم کر دیا گیا اور اب اس کی جگہ وہ عمارت کھڑی ہے جسے نیو مارکیٹ کہتے ہیں -

وکالت کے طالب علم

لاہور ہائی کورٹ کے دفتر میں دوسرے وکلا کے ساتھ حضرتِ علامہ کا ذاتی فائل بھی محفوظ تھا جو قواعد کے ماتحت اب تک معرض تلف میں آ جانا چاہیے تھا لیکن علامہ کی جلالتِ قدر اور اس فائل کی تاریخی حیثیت کے پیشِ نظر اس کو محفوظ رکھا گیا - میاں محمد خلیل سابق رجسٹرار ہائی کورٹ اس کے لیے مستحقِ تحسین ہیں - پچھلے دنوں ہائی کورٹ کے ایک افسر سید محسن ترمذی ایم-اے، ایل‌ایل - ایم نے اس فائل کے ضروری حصے ایک مضمون کی صورت میں شائع کیے جن سے معلوم ہوا کہ :

۱۸۹۸ء میں شیخ محمد اقبال نے لاہور لاء سکول (جو بعد میں لاء کالج کہلایا) میں داخل ہو کر ایک متعلمِ قانون کی حیثیت سے لکچروں کا کورس

پورا کیا اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں قانون کے امتحان ابتدائی (P.E.L.) میں بطورِ امیدوار بیٹھے لیکن اصولِ قانون کے پرچے میں فیل ہو گئے -

پھر جون ۱۹۰۰ء میں انھوں نے چیف کورٹ میں ایک درخواست پیش کی کہ انھیں دسمبر ۱۹۰۰ء کے امتحان پی - ای-ایل میں دوبارہ بیٹھنے کی اجازت عطا فرمائی جائے اور دوبارہ لکچروں میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے - مسٹر جسٹس چیٹر جی نے یہ درخواست ''حسبِ قواعد" نا منظور کر دی -

اسی نامنظوری سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ فیصلہ کیا کہ قانون کی تعلیم انگلستان جا کر حاصل کریں - اگر مسٹر جسٹس چیٹر جی اس درخواست کو منظور کر لیتے تو اقبال اسی زمانے میں کسی قصبے کی عدالت یا ضلع میں وکالت شروع کر دیتے اور اس تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتے جو انھیں انگلستان اور جرمنی کے اکابرِ علم کی صحبت سے نصیب ہوئی -

پروفیسری اور بیرسٹری

۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چیف کورٹ میں درخواست دی کہ میرا نام وکلا کی فہرست میں درج کر لیا جائے اور مجھے ایڈووکیٹ چیف کورٹ قرار دیا جائے - چناں چہ درخواست منظور کر لی گئی اور اقبال چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے -

انھیں دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ مسٹر جیمز کا دفعتاً انتقال ہو گیا - مسٹر رابسن پرنسپل تھے - فوری طور پر کسی انگریز پروفیسر کا بندوبست ہو نہ سکتا تھا اور بہترین ہندوستانی پروفیسر ڈاکٹر اقبال ہی ہو سکتے تھے اس لیے پرنسپل کی گزارش پر حکومت پنجاب نے علامہ اقبال سے استدعا کی کہ عارضی طور پر فلسفے کی پروفیسری قبول کر لیں تاکہ کالج کے سلسلۂ تعلیمات میں خلل نہ پڑنے پائے - گرمی کا موسم تھا ، علامہ کے پیریڈ کالج میں چھ بجے صبح سے ۹ بجے تک قرار پائے - علامہ اقبال

اور مسٹر ڈڈلے ، انڈر سیکرٹری تعلیمات حکومتِ پنجاب، دونوں نے چیف کورٹ کے حکامِ اعلیٰ کو لکھا کہ علامہ کے مقدمات ہمیشہ اُس وقت لیے جائیں جب وہ کالج سے فارغ ہو کر آجائیں۔ چیف جسٹس اور دوسرے ججوں نے اس کو منظور کر لیا اور علامہ بہ‌یک وقت پروفیسر اور بیرسٹر کی حیثیتوں سے کام کرنے لگے ۔

کالج سے یہ تعلق بلاشبہ قانوناً عارضی تھا لیکن کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہا ۔ آخر حضرتِ علامہ نے اس سے خود استعفیٰ دے دیا اور اپنے دوستوں اور ملازموں کے استفسار پر یہ فرمایا کہ میں اب سرکاری ملازمت نہیں کر سکتا تاکہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں ، بے‌تکلف کہہ سکوں ۔

اوّلین احباب

علامہ نے ایک گگ (چھوٹی بگھی) لے لی تھی ۔ اسی میں کچہری جایا کرتے تھے ۔ گھوڑے کی دیکھ بھال کے لیے ایک پوربیا سائیس ملازم تھا ۔ اس زمانے میں مرزا جلال الدین صاحب کے علاوہ علامہ کے تعلقات نواب ذوالفقار علی خان ، سر جگندر سنگھ سردار امراؤ سنگھ ، سے بہت گہرے ہو گئے تھے ۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ اکثر کچہری سے فارغ ہو کر اپنی گگ واپس بھیج دیتے اور میری کار میں بیٹھ کر میرے دفتر میں آ جاتے ۔ شام وہیں گزارتے اور رات کے گیارہ بارہ بجے گھر واپس جاتے ۔ بعض اوقات رات بھر میرے پاس ہی رہتے اور صبح نماز ، تلاوتِ قرآن اور ناشتے کے بعد گھر جاتے ۔ مولانا عبداللہ ٹونکی کا ایک رشتہ‌دار ظہور میرا بیرا تھا جسے ستار بجانے میں کمال حاصل تھا ۔ علامہ اس سے اکثر ستار سنتے بلکہ کچھ مدت تک اس سے ستار بجانا سیکھتے بھی رہے ۔ جب نواب ذوالفقار علی خان کے ساتھ تعلقات بڑھے تو ایک خاصی مدت تک میں اور علامہ روزانہ شام کی چائے نواب صاحب ہی کے ہاں پیتے بلکہ جس دن کچہری میں تعطیل ہوتی ، ہم دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھاتے ۔

اُس وقت تک سر محمد شفیع مسلمانوں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے اور عام طور پر جلسوں کی صدارت وہی کیا کرتے تھے ۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ ، ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ ، مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ اور خواجہ کمال الدین علامہ اقبال کے دوست اور مداح تھے اور ان کو مسلمانوں کی قیادت کا حق‌دار سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے علامہ کا نام ایک جلسے کی صدارت کے لیے تجویز کیا لیکن علامہ نے اپنی جگہ نواب ذوالفقار علی خان کو صدر بنانے کی حمایت کی؛ چناں‌چہ اس کے بعد احمدیہ بلڈنگ اور اسلامیہ کالج کے میدان میں متعدد جلسے نواب صاحب کے زیرِ صدارت منعقد ہوئے ۔ سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خان قیادت کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے ۔ جب منٹو ؟ مارلے سکیم کے ماتحت پنجاب میں کونسل قائم ہوئی تو بعض بزرگوں کی مصالحت کوشی سے یہ قرار پایا کہ پہلی مرتبہ سر محمد شفیع ممبر منتخب کیے جائیں اور دوسری مرتبہ نواب صاحب کو موقع دیا جائے ۔ چناں‌چہ سر محمد شفیع ممبر بن گئے اور نواب ذوالفقار علی خاں کو مہاراجہ پٹیالہ نے اپنی ریاست کا وزیر اعظم مقرر کر دیا ۔ سر جگندر سنگھ پٹیالے ہی میں ہوم منسٹر مقرر ہوئے ۔ یہ دونوں دوست تین سال تک پٹیالے میں رہے ۔ یہ ذکر اس‌لیے کیا گیا ہے کہ نواب صاحب کی وجہ سے اکابر پٹیالہ بھی علامہ اقبال کے گرویدہ ہوگئے تھے اور علامہ اور مرزا جلال الدین اکثر پٹیالے جایا کرتے تھے ۔

دوسری شادی

چوں کہ علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی تھی ، مطمئن نہ تھے اور موافقت و مصالحت کی کوششیں نا کام ہو چکی تھیں اس لیے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہاں تھے ۔ احباب میں ذکر ہوا تو شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحب‌زادی کے متعلق تحریک کی جو اُس وقت وکٹوریا گرلز سکول میں پڑھتی تھی ۔ جب بات پکی ہوگئی تو علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد سیال کوٹ سے آئے

اور مرزا جلال الدین ، میاں شاہ نواز بیرسٹر ، مولوی احمد دین وکیل اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر سسرال میں پہنچے اور وہاں علامہ کا نکاح پڑھا گیا ۔ اس موقع پر صرف نکاح ہوا تھا ، رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی ۔

رخصتی کا التوا

نکاح ہو جانے کے بعد علامہ کے پاس چند گم نام خطوط پہنچے جن میں منکوحہ خاتون کے خلاف نا مناسب شکایات لکھی تھیں ۔ علامہ سخت ضغطے میں پڑ گئے ۔ دوستوں سے ذکر کیا ، انھوں نے حالات کی چھان بین کا وعدہ کر لیا ۔ ان حالات کی وجہ سے رخصتی کا معاملہ غیر معیّن وقت تک ملتوی ہوگیا ۔ علامہ اس زمانے میں بے حد ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے ، ایک بیوی سے ان بن ہوگئی ، دوسری کے متعلق یہ حالات رونما ہو گئے ۔ اسی اثنا میں علامہ کے ایک دوست سید بشیر حیدر جو اُس زمانے میں ایکسائیز انسپکٹر لدھیانہ تھے ، لدھیانے

لدھیانے میں تیسری شادی

کے ایک مشہور دولت مند خاندان ”نولکھا“ کے متعلق رشتے کا پیغام لے کر آئے ۔ اس خاندان کی کیفیت یہ ہے کہ جالندھر کے ایک صاحب ڈاکٹر سبحان علی نے یو ۔ پی میں کاروبار سے بڑی دولت کمائی ۔ ایک موقع پر ان کی دولت اور جائداد کا حساب لگایا گیا تو نو لاکھ کی مالیت تجویز ہوئی ۔ چناں چہ وہ ”سبحان علی نولکھے“ مشہور ہوگئے ۔ انھوں نے لدھیانے میں شادی کی جس سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی ۔ ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کا شوہر بھی ڈاکٹر تھا ، وہ بھی ان کے ساتھ ہی کام کرتا تھا ۔ وہ فوت ہو گیا اور ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ گیا ۔ یہ بچے ڈاکٹر سبحان علی ہی کے ساتھ رہے اور انھیں کے خاندان میں شامل سمجھے جاتے تھے ۔ ڈاکٹر سبحان علی کے انتقال کے بعد یہ لڑکا جس کا نام غلام محمد تھا ، بڑا ہونے کی وجہ سے تمام امورِ خاندانی کا ذمہ دار اور مختار ہوگیا ۔ سید بشیر

حیدر جو پیغام لائے تھے ، وہ غلام محمد کی بہن یعنی ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کی لڑکی کے متعلق تھا ۔ جب رشتہ طے ہوگیا تو لاہور سے علامہ کی برات لدھیانہ گئی جس میں دوسرے احباب کے علاوہ شیخ عطا محمد ، مرزا جلال الدین ، چودھری شہاب الدین ، شیخ گلاب دین اور مولوی احمد دین بھی شامل تھے ۔ لدھیانہ سٹیشن پر برات کا شان دار استقبال کیا گیا ۔ سکولوں کے بچوں نے علامہ کی نظمیں گا کر سنائیں ۔ برات کی خاطر مدارات اعلیٰ پیمانے پر ہوئی بلکہ میزبان نے لدھیانے کے بازاروں میں کہلا بھیجا تھا کہ براتی بازار سے جو شے خریدیں ، اس کا بل براتیوں سے نہیں بلکہ ہم سے وصول کیا جائے ۔ نکاح کے بعد براتی واپس آ گئے لیکن علامہ وہیں رہ گئے ۔

لاہور والی بیگم کا دامن پاک

چند روز بعد یہ خاتون لاہور آ گئیں اور اس موقع پر علامہ کی پہلی بیگم (گجرات والی) بھی یہاں پہنچ گئیں اور دونوں انارکلی والے مکان میں علامہ کے ساتھ رہنے لگیں ۔ موچی دروازے والی بیگم کا معاملہ معلق ہی رہا لیکن کچھ مدت کے بعد یہ واقعات رونما ہوئے :

۱ ۔ وکٹوریا گرلز سکول کی ہیڈ مسٹرس مس بوس سے مرزا جلال الدین کی بیگم نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اس نے اس لڑکی کی بے حد تعریف کی اور اس کی ذہانت، طباعی اور نیکی کو بہت سراہا ۔

۲ ۔ علامہ کے والدِ محترم نے جو بے حد پرہیزگار اور مقدس بزرگ تھے ، استخارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ لڑکی بالکل پاک دامن ہے ۔

۳ ۔ مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں نے اپنے منشیوں اور کارکنوں کے ذریعے سے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ گم نام خطوط لکھنے کا ذمہ دار نبی بخش وکیل تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی اس کے بیرسٹر لڑکے سے ہو جائے ۔

۳ - جب یہ انکشافات ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اس بات پر بے حد افسوس ظاہر کیا کہ علامہ نے ایک بہتان پر یقین کر لیا اور ساتھ ہی لکھ دیا "میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے ، اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی ، اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روز قیامت آپ کی دامن گیر ہوں گی"۔

نکاح از سرِ نو کیا

آخر علامہ اس بیگم کو لانے کے لیے تیار ہوگئے؛ انہیں شبہ تھا کہ وہ چوں کہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے مبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہو - انھوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ - مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوئی، لیکن اگر آپ کے دل میں کوئی شبہ اور وسوسہ ہو تو دوبارہ نکاح کر لیجیے ؛ چناں چہ ایک مولوی صاحب کو طلب کرکے علامہ کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھوایا گیا اور علامہ اس کو ساتھ لے کر سیال کوٹ چلے گئے - آٹھ دس دن کے بعد واپس آئے تو بڑی گرم جوشی کے ساتھ مرزا صاحب سے ملے اور فرمایا "اب میں بالکل مطمئن ہوں اور اپنے آپ کو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں" - مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اس خاتون سے (جو جاوید و منیرہ کی والدہ ہیں) ، شادی ہو جانے کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ، ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں - یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے ، اس کے بعد اقبال کی زندگی کا اسلوب کاملاً بدل گیا -

"رنگ رلیوں" کا ذکر آ گیا تو یہ بھی سن لیجیے کہ اقبال عنفوانِ شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے - بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے ، شہد کی مکھی کبھی نہ بنے، لیکن آج بھی ان

کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں جو اس گئے گزرے زمانے کی رنگین صحبتوں کی یاد کو اب تک سینوں سے لگائے ہوئے ہیں - خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی ؛ ان کے تمام ہم نشیں اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ علاوہ بریں مثنوی "رموزِ بیخودی" کے آخر میں "حضور رحمۃللعالمین" میں عرض حال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشقِ مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر آباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو - فرماتے ہیں :

مدتے با لالہ رُویاں ساختم — عشق با مرغولہ مُویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم — بر چراغِ عافیت داماں زدم
برقہا گردید گردِ حاصلم — رہزناں بردند کالائے دلم

این شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت
این زر سارا ز دامانم نہ ریخت

سسرال سے کوٹھی کی پیش کش

ایک دفعہ علامہ کے لدھیانے والے برادرنسبتی غلام محمد نے کہا کہ اقبال ایک کوٹھی خرید لیں ، روپیہ ہم دے دیں گے - علامہ اس شرط پر تیار ہوگئے کہ وہ اس روپے کو بالاقساط واپس لے لیں ؛ چناں چہ کوینز روڈ پر دھنپت رائے کی ایک پرانی کوٹھی کا سودا طے ہوگیا ، پانسو روپے بیعانہ قرار پایا - علامہ نے لدھیانے خط لکھا ، غلام محمد روپیہ لے کر آ گیا - اُس وقت علامہ کی لدھیانے والی بیگم زندہ تھیں - علامہ نے مرزا جلال الدین کو غلام محمد کے ساتھ بھیجا کہ مالکِ مکان سے معاملہ طے کر آئیں - راستے میں غلام محمد نے مرزا صاحب سے کہا کہ بیعانے کی رسید میری بہن کے نام لکھی جائے - مرزا صاحب کہتے ہیں کہ علامہ نے مجھے ایسی کوئی بات نہ بتائی تھی

اس لیے میں مشوّش ہوگیا؛ لیکن جب مالکِ مکان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اور صاحب کے ساتھ کوٹھی کا سودا کر چکا ہے۔ جب میں نے واپس آ کر علامہ کو یہ قصہ سنایا تو انہوں نے فرمایا کہ "اچھا ہوا، یہ سودا نہ ہوا ورنہ مجھے اپنی بیوی کے مکان میں رہنا پڑتا"۔

نکاح کے پیغامات

ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کی بیٹی علامہ کے ساتھ شادی کرنے کی بے حد خواہش مند تھی؛ وہ کہا کرتی تھی کہ مجھے ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ زیادہ انس ہے۔

علامہ سے شادی کرنے کے سلسلے میں بہت خطوط آیا کرتے تھے۔ مرزا صاحب ایک واقعہ سناتے ہیں: کرنال کے ایک مولوی صاحب نے علامہ کو پیہم خطوط لکھے کہ ایک نہایت اچھی پڑھی لکھی خاتون جو مذہب کی پابند ہے، آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔ علامہ نے مولوی صاحب کو لکھوایا کہ ایسے خط نہ لکھا کرو لیکن مولوی صاحب پھر بھی باز نہ آئے اور لکھتے رہے "اگر رد کروگے تو ظلم کروگے۔ تم اس خاتون کو ایک بار دیکھ تو لو"۔

وہ خاتون اپنے بھائی کے ساتھ مرزا صاحب کے مکان پر آئی؛ انہوں نے علامہ اور نواب ذوالفقار علی خاں کو بلا بھیجا۔ سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ علامہ اور نواب صاحب کھانا کھا کر چلے گئے؛ دوسرے روز اُس خاتون کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا گیا۔[1]

ذہنی کش مکش

دوسری شادی سے پہلے بزرگانِ خاندان کوشش کر رہے تھے کہ پہلی بیگم سے علامہ کی موافقت

۱۔ گزشتہ چند صفحوں کے مندرجات زیادہ تر مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں کے بیانات پر مبنی ہیں۔

ہو جائے لیکن اقبال انتہائی ذہنی کرب میں مبتلا تھے جس کا پتا اس چٹھی سے چلتا ہے جو انہوں نے اپریل ۱۹۰۹ء میں عطیہ بیگم کو لکھی۔ عطیہ نے ملامت کی تھی کہ آپ کو علی گڑھ کالج کی طرف سے فلسفے کی پروفیسری پیش کی گئی تو آپ نے اس کو مسترد کیوں کر دیا۔ علامہ اس چٹھی میں لکھتے ہیں کہ ہاں، میں نے علی گڑھ کی پروفیسری مسترد کر دی اور اس سے پہلے میں گورنمنٹ کالج لاہور کی پیش کش کو بھی رد کر چکا ہوں جس میں مجھے تاریخ کی پروفیسری پیش کی گئی تھی:

"میں کوئی ملازمت نہیں کرنا چاہتا؛ میری خواہش یہ ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس ملک سے بھاگ جاؤں۔ اس کی وجہ تم کو معلوم ہے۔ مجھے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات سے بے حد زیر بار ہوں؛ میری زندگی نہایت مصیبت ناک ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی میرے سر چپکنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد محترم کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی کر دینے کا کوئی حق نہ تھا خصوصاً جس حالت میں مَیں نے اس سے انکار کر دیا تھا۔ میں بیوی کو نان و نفقہ دینے پر آمادہ ہوں لیکن میں اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرت کے حصول کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ یا فطرت میرے اس حق سے انکار کریں گے تو میں دونوں کے خلاف بغاوت کروں گا۔ میرے لیے صرف ایک ہی چارہ ہے کہ میں اس بد بخت ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں یا مے خواری میں پناہ ڈھونڈوں جس سے خود کشی آسان ہو جاتی ہے۔ کتابوں کے یہ مردہ، بے جان اور بنجر اوراق مسرت نہیں دے سکتے اور میری

روح کے اعماق میں اس قدر آگ بھری ہوئی ہے کہ میں ان
کتابوں کو اور ان کے ساتھ ہی معاشری رسوم و روایات کو
بھی جلا کر خاکستر بنا سکتا ہوں"۔(۹ اپریل ۱۹۰۹ء)

عطیہ بیگم نے تسلی اور ہم دردی کا خط لکھا اور مشورہ دیا کہ تم شیخ عبدالقادر سے بات کرو۔اس پر علامہ نے لکھا :

"میں عبدالقادر سے اکثر ملتا ہوں اور چیف کورٹ کے بار روم میں تو ان سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہو جاتی ہے لیکن ہم دونوں کے درمیان مدتِ دراز سے تمہارا ذکر نہیں آیا اور حقیقت یہ ہے کہ اب تو میں دوسروں سے بہت ہی کم بات چیت کرتا ہوں۔ میرا بدبخت نفس خود ہی ایسے مصیبت ناک خیالات کا معدن بنا ہوا ہے جو میری روح کے تاریک و تارگوشوں سے سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں عنقریب سپیرا بن کر گلیوں میں گھوما کروں گا اور میرے پیچھے پیچھے لونڈوں کا ایک گروہ تماشا دیکھنے کے لیے چلا کرے گا۔ مجھے تم یاس پرست نہ سمجھو ؛ سچ یہ ہے کہ غم بے حد لذیذ شے ہے ، میں اپنی بد قسمتی سے لطف اٹھا رہا ہوں اور ان لوگوں پر قہقہہ لگاتا ہوں جو اپنے آپ کو خوش و خرم سمجھتے ہیں۔ دیکھا ! میں اپنی مسرت کو کس طرح چھپاتا ہوں"(۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء)

عطیہ بیگم علامہ کو جنجیرہ آنے کی دعوت دیتی ہیں اور نواب صاحب اور بیگم صاحبہ جنجیرہ کے شوقِ ملاقات کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ علامہ وعدہ کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی وقت ضرور آئیں گے لیکن ٹرین کے سفر کے بعد ایک جہاز ، پھر کشتیوں اور پھر تانگوں پر منزل طے کرنے

اور بعض خلیجیں اور گھاٹیاں عبور کرنے کی مصیبت کو "ہفت خواں" بھی بتاتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ چند روز کے لیے حیدرآباد دکن جا کر لاہور واپس آ جاتے ہیں تو عطیہ بیگم ان کو نہایت غیظ آلود خط لکھتی ہیں کہ تم حیدرآباد تک آئے اور جنجیرہ نہ پہنچے اور معلوم ہوتا ہے کہ تم حیدر آباد میں نوکری کرنا چاہتے ہو حال آں کہ ہندوستان کے کسی والیِ ریاست کے ہاں تمہارا نوکر ہونا تمہادی تمام صلاحیتوں کو سلب کر دے گا۔ اس کے جواب میں علامہ عطیہ بیگم کو لمبے لمبے خط لکھ کر اپنی فروگزاشت پر ان سے اور نواب و بیگم جنجیرہ سے معذرت خواہ ہوتے ہیں کہ رخصت بہت محدود تھی اور مجھے فوراً لاہور پہنچنا تھا اور اب اس فروگزاشت کی تلافی کسی آیندہ موقع پر کروں گا اور رہا حیدر آباد میں ملازمت کا سوال تو میں اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

ایک خط میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں کہ اگرچہ تمہارے خطوں سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم میری مصیبتوں کو سمجھنے سے قاصر ہو اور میں سمجھانا بھی فضول سمجھتا ہوں کیوں کہ تم میری باتوں کا یقین کرنے سے انکار کرتی ہو :

"بے شک ہر انسان اپنی آرام گاہ تک پہنچنے کا صابرانہ انتظار کرتا ہے۔میں جلد سے جلد اس مقام کو جانا چاہتا ہوں تا کہ اپنے خالق سے یہ مطالبہ کروں کہ وہ میرے ذہن کی عقلی توجیہ و تصریح کرے اور یقین جانو کہ یہ کام اس کے لیے بھی آسان نہ ہوگا۔ تم مجھے نہ سمجھنے کی شکایت نہ کرو، خود میں بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ مدت ہوئی میں نے لکھا تھا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

آگے چل کر لکھتے ہیں :

"مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ تمھیں اس بات کا بے حد رنج ہے کہ شمالی ہندوستان کے لوگ میرا کما حقہ احترام و اعتراف نہیں کرتے لیکن تم اس بات کی پروا نہ کرو ؛ میں دوسروں کی باتوں پر زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا :

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

میں نہایت سیدھی سادی دیانت دارانہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ میرے دل اور زبان کے درمیان پوری موافقت ہے۔ لوگ منافقت کی مدح و ثنا کرتے ہیں ؛ اگر شہرت ، عزّت اور مدح و ثنا حاصل کرنے کے لیے مجھے منافقت اختیار کرنی پڑے تو میں کم نام اور کس مپرس رہنا ہزار درجے زیادہ پسند کروں گا۔ عوام کو جن کی گردنوں پر راون کی طرح دس سر ہیں ، ان لوگوں کا احترام کرنے دو جو مذہب اور اخلاق کے متعلق عوام کے جھوٹے اور بے بنیاد نصب‌العینوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں ان کے رسوم و روایات کے آگے سر جھکانے اور ذہنِ انسانی کی آزادی کو دبانے سے بالکل قاصر ہوں۔ بایرن ، گوئٹے اور شیلے کے معاصرین ان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ میں ان کے مقابلے میں قوتِ شعری کے اعتبار سے کم تر ہوں ، لیکن مجھے فخر ہے کہ کم از کم اس معاملے میں تو ان کا ہم سر ضرور ہوں۔" (۷ جولائی ۱۹۰۹ء)

ایک مثنوی کی داغ بیل

جولائی ۱۹۱۱ء میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں :

"گزشتہ پانچ چھ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی ہو رہی ہیں اور پبلک کو ان کے پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض نظمیں تو میں نے خود ہی تلف کر دی ہیں تاکہ مبادا کوئی ان کو چرا کر شائع کر دے۔ بہر حال کچھ تردد کروں گا کہ بعض نظمیں محفوظ ہو جائیں۔ والدِ محترم نے فرمائش کی ہے کہ میں بو علی قلندر کی پیروی میں ایک فارسی مثنوی لکھوں۔ اگرچہ یہ کام مشکل تھا لیکن میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ چند ابتدائی اشعار یہ ہیں :

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن	بزم را از ہا و ہُو آباد کن
آتش استی بزمِ عالم بر فروز	دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز	اشک‌خونیں را جگر پرکالہ ساز
پشت پا بر شورشِ دنیا بزن	موجۂ بیرون این دریا بزن

باقی اشعار بھول رہا ہوں ، امید ہے کچہری سے واپس آنے پر یاد کر سکوں‌گا۔ ایک غزل بھیجتا ہوں جو پچھلے دنوں رسالہ "ادیب" میں چھپی ہے۔ شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک سہیلی مس گوئسمین نے شالامار باغ کے ایک تختۂ گل سے ایک نہایت خوب صورت پھول مجھے پیش کیا تھا ، اس پر میں نے چند اشعار لکھے تھے (بانگ درا : پھول کا تحفہ عطا ہونے پر"۔ مؤلف) ۔ میرے دوست سردار امراؤ سنگھ نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے سردار صاحب کو لکھا ہے کہ وہ ترجمہ بھیج دیں۔ اصل نظم بھی غالباً میرے پاس نہیں ، بہر حال تلاش کر کے تمھیں بھیج دوں گا۔[۱]"

---

۱ - اقبال کے خطوط بنام عطیہ بیگم ۷ جولائی ۱۹۱۱ء۔

کشمیریوں کے لیے فوجی ملازمت اور زراعت پیشہ

۱۹۰۹ع میں علامہ اقبال انجمنِ کشمیری مسلمانانِ لاہور کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوگئے تھے۔ منشی محمد دین فوق کے رسالے ''کشمیری میگزین'' میں انجمنِ کشمیری مسلمانان کے جلسوں کی روائیدادیں اور دوسری تحریریں درج ہوتی تھیں۔ اس رسالے میں علامہ کی طرف سے کشمیریوں کے نام دو گشتی چٹھیاں شائع ہوئی تھیں جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ ''کشمیریوں کے مربی اور محسن نواب آنریبل سر خواجہ محمد سلیم اللہ خاں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی نے ۵ فروری ۱۹۰۹ع کو وائیسریگل کونسل میں کشمیری قوم کی فوجی ملازمت اور زمین داری کے متعلق سوالات پیش کیے تھے۔ فوج کے متعلق لارڈ کچنر سپہ سالار افواج ہند نے یہ جواب دیا کہ کشمیری مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں، اگرچہ کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن علیحدہ موجود نہیں۔ کشمیروں کو زراعت پیشہ قوم قرار دینے کے متعلق یہ جواب دیا گیا کہ صوبے کی حکومت جس قوم کو مناسب سمجھتی ہے، زمینداری اقوام بندی میں شامل کر لیتی ہے۔ یہ دونوں سوال جواب وائسرائے نے حکومت پنجاب کو بھیج دیے ہیں اور حکومت پنجاب اپنے کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے ذریعے سے اعداد و شمار فراہم کرا رہی ہے کہ ہر ضلع میں کتنے کشمیریوں کی بسر اوقات کا ذریعہ زراعت ہے۔ اس گشتی چٹھی میں علامہ نے قومی کارکنوں سے اپیل کی تھی کہ ان اعداد و شمار کی فراہمی میں حکام سے تعاون کریں تاکہ حصولِ مقصد میں آسانی ہو۔ کشمیریوں کی مردم شماری کے متعلق بھی تحریک کی گئی کہ ہر مقام کے کارکن کشمیری مسلمانوں کی فہرستیں تیار کریں۔[1]

اکتوبر ۱۹۰۹ع کے کشمیری میگزین میں ''رباعیاتِ اقبال'' کے عنوان سے آٹھ رباعیاں مسلمانانِ کشمیر کے متعلق درج ہیں۔ مثال کے طور پر دو

۱۔ کشمیری میگزین مئی ۱۹۰۹ع و جون ۱۹۰۹ع۔

رباعیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر
چشمِ اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِ مطلب ہے اخوّت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ ''کشمیر''

موتی عدن سے، لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے خُتن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیری میگزین ماہ مارچ ۱۹۰۹ع میں اقبال کی وہ نظم تمام و کمال درج ہے جو انھوں نے فروری ۱۸۹۶ع میں مجلسِ کشمیری مسلمانان لاہور کے جلسے میں پڑھی تھی اور جس کا ذکر کسی اور فصل میں کیا جا چکا ہے؛ اُس وقت علامہ بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ ''کشمیری میگزین'' ماہ اپریل ۱۹۰۹ع میں ''حالاتِ اقبال'' کے عنوان سے علامہ کے مفصل حالاتِ زندگی درج ہیں اور ان کے علمی و شعری کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

انجمن کے جھگڑوں میں ثالثی

۱۹۱۰ع میں علامہ اقبال نے چند چھوٹی چھوٹی نظمیں تو لکھیں جو ''پیسہ اخبار'' اور ''مخزن'' میں شائع ہوتی رہیں لیکن انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں کوئی نظم نہ پڑھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انجمن میں اختلافات و تنازعات بہت بڑھ گئے تھے اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ ''پیسہ اخبار'' مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۰ع میں ایک اطلاع درج ہے کہ ۲۲ اپریل کی شام کو نواب فتح علی خان قزلباش کے دولت کدے پر آنریبل محمد شفیع، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مولوی محبوب عالم، میاں

فضل حسین ، چوہدری نبی بخش ، مولوی فضل الدین ، میاں نظام الدین اور مولوی کریم بخش جمع ہوئے اور بحث مباحثے کے بعد ان حضرت نے فیصلہ کیا کہ سات اصحاب کا ایک ثالثی بورڈ مقرر کیا جائے جس میں ایک طرف سے شیخ اصغر علی ، مولوی رحیم بخش اور میاں فضل حسین اور دوسری طرف سے میاں محمد شفیع ، نواب ذوالفقار علی خان اور ڈاکٹر محمد اقبال شامل ہوں اور ان کے صدر نواب فتح علی خان قزلباش مقرر کیے جائیں ۱ ۔

اسی ثالثی بورڈ نے اپنا فیصلہ دے دیا ، اس پر مولوی انشا اللہ نے انجمن کے خلاف دائر کردہ مقدمات واپس لے لیے ۔ ۱۹ جولائی ۱۹۱۰ء کو پیسہ اخبار میں فیصلہ ثالثی کا اعلان ہوگیا اور دعا کی گئی کہ اللہ اس فیصلے کو انجمن کے انتظامات کے لیے مبارک کرے ۔

"شکوہ" انجمن میں

۱۹۱۱ء کے ماہ اپریل میں انجمن حمایت اسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا ، اس میں علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" ریواز ہوسٹل کے صحن میں پڑھی ۔ اس وقت ان کے والد محترم بھی جلسے میں تشریف رکھتے تھے اور اس نظم کو سن کر برابر روتے رہے ۔ چند ماہ بعد موچی دروازے کے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں علامہ نے "جواب شکوہ" تحت اللفظ پڑھ کر سنائی ، ترنم کے تقاضے پر سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ یہ نظم تحت اللفظ ہی پڑھنی مناسب ہے ۲ ۔

بمبا دلیپ سنگھ سے ملاقات

۱۹۱۱ء ہی کا ذکر ہے ، سردار جگندر سنگھ نے علامہ اقبال سے کہا کہ شہزادی بمبا دلیپ سنگھ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی) آپ سے ملاقات کی بے حد خواہش مند ہے ۔ یہ شہزادی جیل روڈ کی ایک کوٹھی میں رہتی تھی اور اس کا ڈرائیور

۱ - پیسہ اخبار ۳۰ - اپریل ۱۹۱۰ء
۲ - پیسہ اخبار ۶ - اگست ۱۹۱۰ء

"پیر جی" گھر کے تمام انتظامات کا نگران تھا ۔ ایک دن سردار جگندر سنگھ مرزا جلال الدین اور علامہ اقبال کو بمبا کی کوٹھی پر لے گئے ۔ یہاں درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا جس میں چائے کا انتظام ہوا ۔ بمبا کی فرمائش پر علامہ نے ایک نظم سنائی ، بمبا اردو تو سمجھ لیتی تھی لیکن شعر سمجھنے سے قاصر تھی ۔ سردار جگندر سنگھ ترجمہ و تشریح کر کے سمجھاتے رہے ۔

بمبا کو معلوم ہو گیا تھا کہ علامہ اقبال حقہ بہت پیتے ہیں، چناں چہ اس نے دعوت دینے سے پہلے اپنے ڈرائیور پیر جی سے کہ کر اعلیٰ درجے کا حقہ بنوایا ۔ پیر جی نے اسے نہایت اہتمام سے تازہ کر کے اور چلم بھر کر برآمدے میں رکھ دیا ۔ بمبا خود گئی ، برآمدے سے حقہ اٹھالائی اور علامہ کے آگے رکھ دیا ۔ علامہ بہت خوش ہوئے اور بولے : دیکھیے مرزا صاحب ! ہمیں رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ہاتھ سے حقہ پلایا ۔

مرزا جلال الدین فرماتے ہیں کہ ایک اور موقع پر بمبا کی ایک آسٹرین سہیلی آئی وہ بھی علامہ سے ملنے کی مشتاق تھی ، ہمیں پھر چائے کی دعوت دی گئی ۔ اس دفعہ جگندر سنگھ لاہور میں موجود نہ تھے ، صرف میں اور علامہ گئے اور چائے پی کر واپس آگئے ۔ ایک دفعہ بمبا نے شالا مار چائے کا انتظام کیا ، اس کی آسٹرین سہیلی کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون بھی مدعو تھی ۔ ایک ۔ علامہ کی خدمت میں باغ کا ایک پھول پیش کیا ، دوسری نے ایک خوب صورت بلی پال رکھی تھی جو اس کی گود میں بیٹھی تھی ۔ علامہ کی دو نظمیں "پھول کا تحفہ عطا ہونے پر" اور "کسی کی گود میں بلی دیکھ کر" اسی موقع کی یاد میں لکھی گئی تھیں ۔

شہزادی بمبا کو انگریزوں سے بڑی کد تھی ، اس کے دل میں یہ وہم بیٹھا ہوا تھا کہ انگریز مجھے زہر دے دیں گے ۔ بیمار ہوئی تو لاہور میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل ڈاکٹر سدر لینڈ سے علاج کرایا ، میل جول بڑھا اور دونوں کی شادی ہوگئی ۔ کچھ مدت بعد ڈاکٹر سدر لینڈ ملازمت

سے سبک‌دوش ہوگئے ۔ ہما نے جیل روڈ والی کوٹھی فروخت کر دی اور شوہر کے ساتھ انگلستان چلی گئی۔[1]

اقبال کو تبلیغ کے لیے جاپان بھیجو

۱۹۱۲ء میں علامہ اقبال نے متعدد نظمیں لکھیں جن میں سے '' یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے '' اور ایک نعت '' نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر '' پیسہ اخبار میں شائع ہوئیں ۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں مولوی ظفر علی خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ موسم گرما کی تعطیلات میں ڈاکٹر محمد اقبال کو جاپان بھیجنا چاہیے تاکہ وہ وہاں تبلیغِ اسلام کریں ۔ مصارف کے لیے تجویز کی کہ علامہ کی نظم کی دس ہزار کاپیاں چھاپی جائیں اور آٹھ آنے فی کاپی کے حساب سے فروخت کر کے پانچ ہزار روپیہ فراہم کیا جائے جو علامہ کے مصارفِ سفر کے لیے کافی ہوگا ۔ اس پر "پیسہ اخبار" نے لکھا کہ یہ تجویز محض جوش میں آکر پیش کر دی گئی ہے۔ خود علامہ کا یہ خیال ہے کہ جب مولوی برکت اللہ (بھوپالی) تین سال جاپان میں رہ کر اخبار بھی نکالتے رہے اور دو تین سے زیاد جاپانیوں کو مسلمان نہ بنا سکے تو میں دو مہینے میں کیا کر لوں گا ۔ "پیسہ اخبار" نے لکھا کہ علامہ اس ملک ہی میں رہ کر اپنی قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ہیں ۔[2]

سلطان و فقیر

اس سال بھی انجمن حمایتِ اسلام کا سالانہ جلسہ ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہوا ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی اسی موقع پر زیرِ صدارت صاحب زادہ آفتاب احمد خان ہوا ۔ بے شمار اکابر و معززین جمع تھے ۔ انجمن کے جلسے کا پہلا اجلاس مرزا سلطان احمد وزیر مال بہاول پور کی صدارت میں اور اس

۱ - شہزادی ہما کا یہ سارا ماجرا مرزا جلال الدین کے بیان سے ماخوذ ہے ۔
۲ - پیسہ اخبار ۲۸ - مارچ ۱۹۱۲ء -

کے بعد کا اجلاس فقیر سید افتخار الدین کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ چوں کہ اس اجلاس میں علامہ اقبال نظم پڑھنے والے تھے اس لیے چاروں طرف اتنا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی ۔ علامہ نے اپنی مشہور نظم '' شمع و شاعر '' پڑھ کر سنائی جس نے ہزارہا کے مجمع کو ششدر و مبہوت رکھا ۔ اس نظم سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے ہزاروں روپے چندہ انجمن کو دیا ۔ چوں کہ اس موقع پر انجمن کے اجلاسوں کی صدارت ''سلطان احمد'' اور '' فقیر افتخار الدین'' نے کی تھی اس لیے علامہ نے ایک قطعہ فی البدیہہ ارشاد فرمایا :

ہمنشینِ بے ریائم از رہِ اخلاص گفت — اے کلامِ تو فروغِ دیدۂ برنا و پیر
درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش — گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر
گفتمش اے ہمنشیں معذور می دارم ترا — در طلسمِ امتیازِ ظاہری ہستی اسیر

من کہ شمعِ عشق را در بزم دل افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم[1]

مہاراجا الور کی پرائیویٹ سیکرٹری شپ

ایک دفعہ علامہ ریاست الور میں بھی گئے تھے ۔ انھوں نے خود یہ قصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو سنایا : '' ایک دن سر علی امام نے مجھ سے کہا کہ مہاراجا الور کو ایک قابل پرائیویٹ سیکرٹری کی ضرورت ہے ۔ اگر آپ وہاں نوکری کرنا چاہیں تو میں تقریب کرائے دیتا ہوں ۔ آپ جا کر مہاراج سے ملاقات کر آئیے۔ چناں چہ میں منشی طاہرالدین اور علی بخش کو ساتھ لے کر الور پہنچ گیا ، وہاں ہم مہمان خانۂ شاہی میں ٹھہرائے گئے ۔ دوسرے ہی دن صبح ایک مسلمان حجام ہماری خدمت کے لیے آیا ۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر اقبال آئے ہیں جو مسلمانوں کے بڑے مشہور شاعر اور رہ نما ہیں ۔ اس نے میری حجامت بناتے بناتے مجھ سے پوچھ لیا کہ میں

۱ - پیسہ اخبار ۱۸/۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء

یہاں کیوں آیا ہوں ۔ اس کے بعد اس نے بہت رک رک کر نہایت تأمّل سے کہا : "صاحب ! آپ یہاں نوکری نہ کریں تو اچھا ہے"۔ میں نے پوچھا "کیا وجہ"؟ اس نے پھر تأمّل کر کے کہا : "صاحب! کچھ نہیں ، ہم تو غریب رعایا ہیں ، اپنے مہاراج کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں ؟ لیکن آپ کے لیے کوئی ضروری تو نہیں کہ یہاں کی نوکری کریں"۔ جب میں نے اس سے بہ‌اصرار وجہ پوچھی تو اس نے ہزار تأمّل کے بعد وہ ناگفتہ بہ باتیں سنائیں جو ان اطراف میں بچے بچے کی زبان پر تھیں ۔"

علامہ مہاراجا الور سے ملے ؛ کچھ باتیں ہوئیں ۔ اس گفتگو کے دوران میں علامہ کو معلوم ہوا کہ پرائیویٹ سیکرٹری کی تنخواہ صرف چھ سو روپے ہوگی ۔ علامہ نے مہاراج سے کہا کہ سوچ کر جواب دوں گا ۔ یہ کہہ کر واپس آئے اور چپ چاپ ریاست الور سے رخصت ہو کر لاہور پہنچ گئے ۔

مسجدِ کان پور

۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کی مسجد (کان‌پور) کا ہنگامہ برپا ہوا ؛ مقامی حکام نے محض ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لیے مسجد کا وضوخانہ گرا دیا ۔ اس پر مسلمان جوش میں بھر گئے ؛ مظاہرہ ہوا ، گولی چلی ، گرفتاریاں ہوئیں ۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں جوش پھیل گیا ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء کا "پیسہ اخبار" مظہر ہے کہ " علامہ اقبال اور مرزا جلال‌الدین ملزمینِ کان پور کی طرف سے مقدمہ لڑنے کے لیے کان پور تشریف لے گئے ہیں ، زیادہ دنوں تک وہاں قیام نہ کریں گے "۔ (پیسہ اخبار، ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء)۔

مولانا گرامی

۱۹۱۳ء میں انجمن حمایت اسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا ، اس میں علامہ اقبال ، مولانا گرامی

ور نواب ذوالفقار علی خاں اکٹھے داخل اجلاس ہوئے ۔ مولانا گرامی کا تعارف کراتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ گرامی اکابر شعرائے فارسی میں سے ہے ؛ آج گرامی کو سن لو ؛ کل فخر کروگے ، تم نے گرامی کو سنا ہے ۔ مولانا نے اپنا کلام سنایا ۔ اسی اجلاس میں علامہ اقبال نے اپنا فلسفۂ خودی سادہ زبان اور سلیس انداز بیان میں پیش کیا اور مثنوی "اسرار خودی" کے چند اشعار بھی سنائے [1] ۔

اسرارِ خودی کی اشاعت

۱۹۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی ، جس میں سوءِاتفاق سے انگریز، فرانسیسی اور روسی ایک طرف اور جرمن ، آسٹرین اور ترک دوسری طرف صف آرا ہو گئے ۔ مسلمانانِ ہند سخت مضطرب ہوئے کیوں کہ ان کے حکم‌ران خلافتِ عثمانیہ اسلامیہ کے خلاف بر سرِ پیکار تھے ۔ علامہ اقبال گورنمنٹ کالج کی پروفیسری چھوڑ چکے تھے اور صرف چیف کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے ۔ اُن دنوں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے ۔ مثنوی "اسرار خودی" مکمل ہو چکی تھی ۔ علامہ کو کتابت و طباعت کے خلجان سے کوئی واسطہ نہ تھا ۔ چناں چہ یہ کام حکیم صاحب کے سپرد ہوا جنھوں نے منشی فضل الٰہی مرغوب رقم سے جو علامہ اقبال کی نظموں کے مشہور کاتب تھے ، مثنوی کی کاپی لکھوائی اور ۱۹۱۵ء میں چھپوا کر شائع کردی ۔

انھیں دنوں علامہ اقبال کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا ۔ علامہ کئی روز تک بے حد غم زدہ و افسردہ رہے ۔ راقم الحروف تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو دیر تک مرحومہ کی خوبیاں بیان کر کر کے آبدیدہ ہوتے رہے ۔ فرمانے لگے : جب میں سیال کوٹ جاتا تھا اور والدہ شگفتہ ہو کر فرماتی تھیں

---

۱ ۔ راقم جلسے میں حاضر تھا ۔

"میرا بالی آگیا"، تو میں ان کے سامنے اپنے آپ کو ایک ننھا سا بچہ سمجھنے لگتا۔ افسوس شباب میں یہ لمحۂ طفلی اب کبھی نصیب نہ ہوگا۔

علامہ نے "والدۂ محترمہ کی یاد میں" کے عنوان سے جدید انداز کا جو مرثیہ لکھا (بانگ درا صفحہ ۲۵۲) ، وہ ان کی شاہ کار نظموں میں سے ہے اور شاید ہی دنیا کی زبانوں میں اس مرثیے کی کوئی نظیر مل سکے۔ جس لمحۂ طفلی کا ذکر ابھی آیا ، اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور   دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم   صحبتِ مادر میں طفلِ سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں   پھر اسی کھوئے ہوئے فردوس میں آباد ہیں

مولانا اکبر نے قطعۂ تاریخِ وفات لکھا جو مرحومہ مغفورہ کی لوحِ مزار پر کندہ ہے :

مادرِ مخدومۂ اقبال رفت   سوئے جنّت زیں جہانِ بے ثبات
گفت اکبر با دلِ پُر درد و غم   رحلتِ مخدومہ تاریخِ وفات
۱۳۳۳ھ

چار سال تک علامہ زیادہ تر منقار زیرِ پر ہی رہے اس لیے کہ بے حد پر آشوب زمانہ تھا۔ مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، مولانا ابوالکلام ، مولانا ظفر علی خان اور بے شمار دوسرے عَلَم بردارانِ اتحادِ اسلامی قید و بند میں تھے۔ اگر علامہ اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکامِ وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی اشد شدید گرفت میں آجاتے اور کوئی نتیجہ بھی مترتّب نہ ہوتا بلکہ جب اواخرِ جنگ میں وائسرائے نے

وار کانفرنس

دھلی میں وار کانفرنس منعقد کی تو بہ طور خاص نواب ذوالفقار علی خان کی وساطت سے علامہ اقبال

کو بھی طلب کیا اور اس موقع کے لیے ایک نظم کی فرمائش کی۔ علامہ نے مجبور ہو کر ایک مسدس لکھا جس کے کل نو بند ہیں۔

بہ طورِ نمونہ دو بند ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں ؛ یہ نظم یونیورسٹی ہال لاہور میں پڑھی گئی :

اے تاج دارِ خطۂ جنّت نشانِ ہند   روشن تجلیوں سے تری خاورانِ ہند
محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند   تیغِ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند
ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقّر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقادِ خیر و شر   بہ روز جنگ توز جگر سوز سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر   آزادہ پر کشادہ پری زادہ بم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرّے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے[1]

مدینے کا کبوتر

۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال نے مدینۂ منورہ کا ایک کبوتر کہیں سے حاصل کر کے پالا تھا اور اس کے دانے دنکے کی فکر بہ نفس نفیس کیا کرتے تھے۔ نومبر کی ۲۰ کو وہ کبوتر ایک بلّی کی چیرہ دستی کا شکار ہو گیا۔ اس واقعے سے اقبال بہت متاثر ہوئے اور ایک نظم لکھی۔ پہلا شعر یہ تھا :

رحمت ہو تیری جان پہ اے مرغِ نامہ بر   آیا تھا اڑ کے ذروۂ بام حرم سے تو[2]

حضورؐ بطورِ نقادِ شعر

"ستارۂ صبح" (کرم آباد) مورخہ ۸ اگست ۱۹۱۷ء میں علامہ نے ایک مختصر سا مضمون لکھا جس کا عنوان تھا : "رسول اللہ صلعم فن شعر کے مبصّر کی حیثیت میں"

۱ - پورا مسدس اخبار "وکیل" (امرتسر) مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ و "ستارۂ صبح" مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء میں درج ہے۔
۲ - پوری نظم "ستارۂ صبح" ۳ نومبر ۱۹۱۷ء میں ہے۔

اس مضمون میں آپ نے یہ حقیقت واضح کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وقتاً فوقتاً اپنے عہد کی عربی شاعری کے متعلق جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ، وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ ادبی نصب العین کے دلیلِ راہ رہیں گے ؛ مثلاً حضور صلعم نے امرألقیس کے متعلق جو اسلام سے چالیس سال پہلے ہوا ہے ، ارشاد فرمایا : ’’ھواشعر الشعرا و قائد ھم الی النار،، یعنی ’’وہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے لیکن انھیں جہنم کی طرف لے جانے والا لیڈر بھی ہے،،۔ اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ حضورؐ اعلیٰ درجے کی شاعری کے مرتبہ شناس بھی تھے اور امرألقیس کی شاعری کے موضوع کو ناپسند کرنے کے باوجود اس کے کمالِ شاعرانہ کا اعتراف فرماتے ہیں ، لیکن چوں کہ اس شاعر کی حسین و جمیل شاعری سننے والوں کو حقائقِ حیات سے غافل کرکے ان میں بے خودی کی کیفیت پیدا کرتی ہے اور مے و معشوق کی طرف رہ بری کرتی ہے اس لیے اس کا ٹھکانا جہنم ہے ۔

ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضور صلعم کو سنایا گیا:

ولقد ابیت علی الطوی و اظلہ
حتیٰ انال بہ کریم الماکل

یعنی ’’میں نے بہت سی راتیں محنتِ شاقہ میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں،،۔ حضور صلعم اس شعر کو سن کے بے حد محظوظ ہوئے اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا :

’’کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے کہنے والے کو دیکھنے کے لیے میرا دل بے اختیار چاھتا ہے۔،،

یعنی چوں کہ ایک صحیح اور قابلِ تعریف جذبہ فنی حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیا گیا تھا لہٰذا حضور صلعم نے ایک بت پرست عرب سے ملنے کا

شوق ظاہر کیا ۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضور صلعم کے نزدیک آرٹ حیاتِ انسانی کا تابع ہے ۔ جو آرٹ انسان کو کاہلی، جمود، عیاشی سے نفرت دلا کر محنت و مشقت اور اکلِ حلال کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتا ہے ، وھی آرٹ قابلِ قدر ہے ۔ اس مضمون میں علامہ اقبال نے صاف صاف آرٹ کا یہ نظریہ بیان کر دیا کہ ’’فن برائے فن،، لغو بات ہے ، ’’فن برائے زندگی،، ھی بہترین نظریہ ہے ۔

’’یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمالِ صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی و اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔ غرض رسول اللہ صلعم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا ، اس نے اس اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شانِ ارتقا کیا ہے[1]۔،،

اس زمانے میں مولوی ظفر علی خاں جب کبھی کرم آباد سے لاہور آ کر علامہ کی صحبت سے مستفید ہوتے ، واپس جا کر اس صحبت کا حال بہت مزے لے لے کر لکھتے اور ’’ستارۂ صبح،، کے پڑھنے والوں کو بھی اس ادبی ضیافتِ طبع میں شریک کر لیتے ۔

رموزِ بے خودی

اپریل ۱۹۱۸ء میں ’’اسرار خودی،، کا دوسرا حصّہ مثنوی ’’رموزِ بے خودی،، کے نام سے شائع ہوا جس میں اسرارِ حیاتِ ملّیۂ اسلامیہ بیان کیے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ فرد کی خوشی کس طرح ملت کی خودی میں گم ہو کر اجتماعی قوت کا باعث ہو جاتی ہے ۔ اربابِ ذوقِ سلیم کو ’’اسرار خودی،، کے مطالعے سے مزید حقائق کی

۱۔ ’’ستارۂ صبح،، ۸ اگست ۱۹۱۷ء۔

جو تشنگی لاحق ہوگئی تھی، اس کو ''رموزِ بیخودی'' نے بہ وجہِ احسن فرو کیا[1]

گرامی لاہور میں

اُن دنوں مولانا غلام قادر گرامی[2] دو تین دفعہ ہوشیارپور سے لاہور میں وارد ہوئے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ لاہور میں ہمیشہ علامہ ہی کے ہاں قیام فرماتے اور ایک دفعہ آ جاتے تو ہفتوں یہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتے۔ چوں کہ شعر فارسی میں ان کا پایہ بہت بلند اور استادانہ تھا اس لیے حضرتِ علامہ بھی بعض اشعار میں آن سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ ان دونوں با کمالوں میں جو خلوص اور محبت کے تعلقات تھے، ان کی مثالیں آج بالکل ناپید ہیں۔ اگر علامہ ان کے کمالات کے مدح خواں اور معترف تھے تو وہ بھی علامہ کے فدائی تھے اور ان کے منصب کو خوب پہچانتے تھے۔ چناں چہ فرماتے ہیں :

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال
پیغمبریئے کرد و پیمبر نتواں گفت

جلسۂ فتح اور اقبال

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ جرمنی، آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے بریڈلا ہال لاہور میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں ارشاد فرمائیں جن کا کوئی تعلق جنگ یا فتح سے نہ تھا۔ ان میں سے ایک نظم ''شعاعِ آفتاب'' بانگِ درا کے صفحہ ۲۹۷ پر درج ہے۔ فارسی کے چند اشعار بھی سنائے۔ چوں کہ راقم الحروف اس جلسے میں موجود تھا اس لئے یہ اشعار درج ذیل ہیں۔ بعد میں علامہ نے ان میں کسی قدر ترمیم

۱۔ ریویو ''ستارۂ صبح'' ۱۲ اپریل ۱۹۱۸ء۔
۲۔ مولانا گرامی کے حالات و لطائف راقم کی کتاب ''سرگزشت'' میں ملاحظہ ہوں۔

کر دی تھی، لیکن راقم انہیں ابتدائی شکل ہی میں نقل کر رہا ہے :

ہیچ می دانی کہ صورت بندِ ہستی با فرانس
فکرِ رنگین و دلِ گرم و شرابِ ناب داد
روس را سرمایۂ جمعیّتِ ملّت ربود
قہرِ او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد
ملک و تدبیر و تجارت را بہ انگلستاں سپرد
جرمنی را چشمِ بے خواب و دلِ بے تاب داد
تا بر انگیزد نوائے حرّیت از سازِ دہر
صدرِ جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد
ہر کسے در خوردِ فطرت از جنابِ او بہ برد
بہرِ ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

خودی اور بین الاسلامیت

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء کی دہ سالہ مدت میں علامہ اقبال کے فکر کے دو شعبوں نے نہایت واضح اور معیّن راہِ عمل تجویز کر لی؛ ایک خودی اور دوسرے بین الاسلامی نظریہ۔ آپ نے فرمایا کہ جس تصوف نے خودی کو مٹا دینے اور قطرے کو دریا میں گم ہو جانے کی تعلیم دی ہے، وہ آبرو مند انسانوں کا مسلک نہیں بلکہ کیشِ گوسفندی ہے جس نے قوموں کو ذوقِ حیات سے عاری کر دیا ہے اور خصوصاً مسلمان معاشرے پر اس غلط مکتبِ فکر کا وہ اثر پڑا ہے جس سے وہ زوال و انحطاط کی منزلیں نہایت سرعت سے طے کر رہا ہے۔ جب تک فکرِ اسلامی اور ادبیاتِ اسلامی کو اس مہلک رجحان سے نجات نہ دلائی جائے گی اور ایک تنو مند اور حیات افروز ادبی نصب العین قائم کر کے ادبیاتِ اسلامیہ میں انقلاب پیدا نہ کیا جائے گا، مسلمانوں کی زندگی میں کوئی خوش گوار تغیّر پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک فکر و احساس کی وہ روح نہیں بدلے گی جس نے صدیوں سے اس قوم کو تنزّل کا شکار بنا رکھا ہے، زندگی

کے حوالی میں کوئی بہتر صورت پیدا نہ ہوگی ۔

وطنیت (بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے) علامہ اقبال کے نزدیک نہایت مکروہ و مبغوض نصب‌العین قرار پایا ۔ وہ حُبِ وطن اور وطن پروری کے تو نہایت پُر جوش اور سرگرم حامی تھے لیکن وطنیت کے جس تصور نے دنیا کی قوموں کو مادی مفادات کی کش‌مکش اور رقابت میں اسیر کرکے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا رکھا ہے ، وہ تصور حیاتِ انسانی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے ۔ یورپ کی قومیں علامہ اقبال کے نزدیک تباہی و بربادی کے راستے پر گام زن ہیں ، اس لیے کہ ان میں وطنیت نے انتہائی عصبیت کی شکل اختیار کر لی ہے اور وہ سب بنی نوع انسان کو قتل کرنے ، لوٹنے اور تباہ کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی علامہ نے اتحادِ عالمِ اسلامی کے نصب‌العین پر مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ۔ ''اسرار خودی'' اور ''رموزِ بےخودی'' میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ چین سے لے کر مراکش تک سب مسلمان بھائی بھائی ہیں لہٰذا ان کو وطنیت پرستی کی لعنت سے محترز رہ کر پوری طرح متحد رہنا چاہیے ۔

۱۹۰۹ء میں دو قومی نظریہ

علامہ اب اس امر کے بالکل قائل نہ رہے تھے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان مل کر کوئی مشترک سیاسی پروگرام بنا سکتے ہیں ، مثلاً ۱۹۰۹ء کا ایک واقعہ درج ذیل کیا جاتا ہے :

اس صدی کے عشرۂ اولین میں امرت سر کے ہندو ، مسلمان اور سکھ اربابِ ذوق نے ایک علمی و ادبی مرکز قائم کر رکھا تھا جس کو ''منروا لاج'' کہتے تھے ۔ اس مرکز کا ایک ماہ وار رسالہ بھی ''منروا'' کے نام سے جاری تھا ۔ مارچ ۱۹۰۹ء کے اوائل میں منشی غلام قادر فرخ

امرت سری نے علامہ اقبال کو لکھا کہ اپریل ۱۹۰۹ء میں منروا لاج کا سالانہ جلسہ ہے ، آپ اس میں شرکت فرمائیے ۔ جواب میں علامہ نے لکھا کہ انھیں دنوں انجمنِ حمایتِ اسلام کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے اس لیے لاج کے جلسے میں شرکت کا حتمی وعدہ نہیں کر سکتا ، اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ :

> ''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ امرت سر کے مسلمانوں کے خیالات منروا لاج کی نسبت کچھ اچھے نہیں ہیں'' ۔

فرخ صاحب نے لکھا کہ بلا شبہ اس لاج میں مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے لیکن سب اخوّت و مساوات پر کار بند ہیں ۔ بہت کوشش کی جاتی ہے لیکن مسلمان اس میں شامل ہی نہیں ہوتے ۔

علامہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو فرخ صاحب کے نام جو خط لکھا ، اس میں امرت سر کے مقامی حالات اور منروا لاج سے مسلمانوں کی بیزاری کا ذکر کرکے فرمایا کہ جن مجالس میں ہندوؤں کی کثرت ہو ، ان کے متعلق عام طور پر مسلمانوں کا رویہ یہی ہے اور غالباً یہی رہے گا :

> ''باوجود کوششِ بلیغ کے مسلمان برھمو سماج اور کانگرس کی مجالس سے متنفّر رہے اور اب تک ہیں ۔ خیر ان کی نسبت تو کہا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو تحریکوں سے روکنے والے بہت سے تھے مگر میں دیکھتا ہوں کہ جس شہر یا گاؤں میں دو سکول تھے ، ایک ہندوؤں کا اور دوسرا عیسائیوں کا ، تو مسلمان فطرۃً عیسائیوں کے سکول کی طرف متوجہ ہوتے ، خواہ ہندوؤں کا مدرسہ بھی ان کے لیے کشادہ ہو ۔ یہ ایسے واقعات ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے کوئی متفقہ حکمت عملی سوچنے کے لیے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔
>
> میں خود اس خیال کا رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس ملک سے اٹھ جانا چاہیے اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اسی پر کاربند

ہوں مگر اب میرا یہ خیال ہے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوب‌صورت ہے اور شعریت سے معمور ہے، تاہم موجودہ حالت اور قوموں کی نادانستہ رفتار کے لحاظ ناقابلِ عمل ہے[۱]۔" (محمداقبال)

اس دور کی اردو نظموں میں بلادِ اسلامیہ ، ترانۂ ملّی ، وطنیت ، ایک حاجی مدینے کے راستے میں ، شکوہ ، جوابِ شکوہ ، خطاب بہ جوانانِ اسلام ، غرّہ شوال ، شمع و شاعر ، حضور رسالت مآبؐ میں ، شفا خانۂ حجاز ، دعا ، فاطمہ بنت عبداللہ ، شبلی و حالی، صدیق رض، کفر و اسلام، بلال اور متعدد دیگر نظمیں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ شاعر کے دل و دماغ میں اپنے مقدس نصب‌العین کو مقبولِ عام بنانے کا جوش بدرجۂ اتم پیدا ہو چکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ نظمیں ہیں جن سے علامہ اقبال اسلامی ہند کی آنکھ کا تارا بن گئے اور تمام مسلمان بلا امتیاز مسلک و عقیدہ ان کے فدائی ہو گئے۔ اس زمانے میں مائیکرو فون نہ تھا لیکن اس کے باوجود پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار کے مجمعوں میں علامہ اقبال اپنی نظمیں اپنے آہنگ بلند و شیریں میں سناتے تھے۔ جو سن سکتے تھے وہ بےخود ہوجاتے تھے اور جو نہیں سن سکتے تھے، وہ بھی مسحور ہو کر بے حس‌وحرکت اپنے محبوب شاعر کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے تھے۔

تعنون اور خواجہ حافظ

علامہ اقبال نے مثنوی "اسرار خودی" کو سر علی‌امام کے نام سے مُعَنْوَنْ کیا۔ اس تعنون کو اکثر لوگوں نے اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ معترضین نے کہا کہ جس کتاب میں فلسفۂ خودی کی تشریح کی گئی ہے اور ملّت کو اعزازِ نفس اور خود داری کی تعلیم دی گئی ہے ، اس کو ایک خطاب یافتہ دنیا دار اور ایک

۱ - 'سفینۂ حیات' ، ازمنشی غلام قادر فرخ—۲۲-۲۳

ریاست کے وزیر اعظم کے نام پر معنون کرنا کیا معنی؟ اس کے علاوہ مسلمانوں کے ادبی نصب‌العین کی تصریح کرتے ہوئے خواجہ حافظ شیرازی کا نام لے کر ان کو جلی کٹی سنائیں مثلاً :

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او
مے علاج ہول رستاخیز او
رفت و شغل ساغر و ساقی گزاشت
بزم رندان و مے باقی گزاشت
گوسفند است و نوا آموخت است
عشوہ و ناز و ادا آموخت است

اس پر بھی صرف صوفیہ ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے اربابِ ذوق بھی منغض ہوئے۔ بہر حال "اسرارِ خودی"، کے دوسرے ایڈیشن سے یہ تعنون اور خواجہ حافظ والے اشعار حذف کر دیے گئے۔ جب بعض نیازمندوں نے جنھیں ان دو باتوں کے خلاف شکایت پیدا ہوئی تھی ، علامہ سے استفسار کیا کہ اب ان کے حذف کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ان سے جو مقصد پیش نظر تھا ، وہ پورا ہو چکا ہے اس لیے ان کو باقی رکھنا غیر ضروری سمجھا گیا۔

سر علی امام کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا ، ممکن ہے کسی موقع پر ان کے جذبۂ اسلامیت نے علامہ اقبال کو متاثر کیا ہو اور علامہ نے اسی تاثر کے ماتحت "اسرار خودی" ان کے نام معنون کر دی ہو لیکن خواجہ حافظ کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نگاہ بالکل واضح تھا۔ وہ ان ادبیاتِ اسلامیہ کو ملّت کے لیے مہلک سمجھتے تھے ، جو درسِ حیات اور تلقینِ عمل کے بجائے جمود و ہلاکت اور حقائقِ زندگی سے فرار کی طرف

لے جائیں۔ حافظ کے کلام کو انھوں نے بہ طور مثال پیش کیا تھا کیوں کہ وہ جمالیاتی اعتبار سے بےحد پرکشش ہے اور نوجوانوں کو ایک لمحے کے اندر مسحور کرکے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے، لیکن اس کی تعلیم ان نوجوانوں کو حیات و عمل کے تقاضوں سے غافل کر دیتی ہے۔گویا اس قسم کاادب ایک بے حد لذیذ زہر ہے جس سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہیے۔

شعرِ فارسی اور اسلام

مولوی سراج الدین احمد پال کے نام ایک خط میں علامہ نے لکھا کہ فارسی کے شعرا کے مطالعے میں ایک بات ہمیشہ زیر نظر رکھیے :۔

"حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستورالعمل اور شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستورالعمل کو مسخ کردینا ہے۔ یہ ایک نہایت Subtle طریقہ تنسیخ کا ہے اور یہ طریقہ وہی قومیں اختیار یا ایجاد کرسکتی ہیں، جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیش‌تر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ .... ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بہ ظاہر دل‌فریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید یا تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔

اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعارِ اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں مثلاً :

غازی زپۓ شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہیدِ عشق فاضل ترازوست
در روزِ قیامت این بہ او کے ماند
این کشتۂ دشمن است و آن کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف مگر انصاف سے دیکھیے تو جہادِ اسلامی کی تردید میں اس سے زیادہ دل‌فریب اور خوب صورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے، بلکہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔

اس نکتۂ[1] خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ . . . جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب و غریب باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس واسطے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعے میں آپ کا دماغ ایک خاص رستے پر پڑ جائے۔"

اور ہم نے بھی اس طویل خط کو اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ مسلمان ادباء و شعراء کو ادبیاتِ اسلامیہ کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نگاہ بالوضاحت

۱۔ علامہ اس لفظ کو کہیں " نکتہ " اور کہیں " نقطہ " لکھتے ہیں لیکن صحیح " نقطہ " ہی ہے۔

معلوم ہو جائے ۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد پال کو جو خواجہ حافظ پر ایک مبسوط مضمون لکھنا چاہتے تھے ، علامہ اقبال نے چند مفید مشورے دیے ہیں اور آخر میں یہ سطور لکھی ہیں :

"تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے ، جس نے "لمعات" میں "فصوص الحکم" محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ نہیں ۔ اس پر میں انشاءاللہ مفصّل لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے) ۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا ۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے تو پھر اس قوم کا نکتۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے ۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکیں ۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو، جو ان کو تنازع للبقا میں ہو ، چھپایا کرتی ہیں ۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا ۔"[1]

۱۔ اقبال نامہ عطاءاللہ حصہ اول ۳۶ - ۳۷ اور ۴۴ ، ۴۵ ۔

دوسری فصل

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۵ء تک

پیشتر اس کے کہ ہم پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے اور علامہ اقبال کی نئی مصروفیتوں کا ذکر کریں ، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر مسلمانوں کے اس پورے سیاسی پس منظر کو واضح کر دیا جائے ، جس نے اقبال کے جذبات و تخیّلات پر گہرا اثر ڈالا ۔

تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ

مشرق بنگال کے مسلمان مدت سے محسوس کر رہے تھے کہ جب تک صوبہ بنگال پر سیاست ، تجارت ، دولت ، تعلیم کے اعتبار سے اکثریت کو ہمہ گیر اقتدار حاصل رہے گا ، مسلمان ہرگز پنپ نہ سکیں گے ۔ وہ آئے دن مطالبہ کرتے تھے کہ کوئی ایسا انتظامی قدم اٹھایا جائے جس سے بنگال کے کروڑوں مسلمانوں کو بھی اپنی تقدیر کی تعمیر کا موقع مل سکے ۔ نواب سر سلیم اللہ خان (ڈھاکہ) بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے ۔ انھوں نے اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر انگریز کو تقسیمِ بنگال پر رضا مند کر لیا ۔ چناں چہ اعلان ہوگیا کہ مشرق بنگال اور آسام کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے گا ۔ مسلمان اس اعلان پر خوش ہوئے کیوں کہ نئے صوبے میں انھیں اپنی اکثریت کا یقین تھا اور وہ مطمئن تھے کہ اب وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے موثر تدابیر اختیار کر سکیں گے ، لیکن ہندو بنگالیوں نے جو سیاسی لحاظ سے زیادہ منظم اور مضبوط تھے ، تقسیمِ بنگال کے خلاف ایک ہندوستان گیر شورش برپا کر دی اور اسے سودیشی کی ترویج اور ولایتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک بنا کر اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اس سے متاثر ہو کر بعض بنگالی نوجوانوں نے بم

بھینکنا اور انگریزوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ۔ آخر دسمبر ۱۹۱۱ء کو انگریز نے عاجز آ کر تقسیمِ بنگال کے فیصلے کو منسوخ کر دیا اور مسلمانوں کی ناراضگی کا کچھ خیال نہ کیا ۔ اس کے بعد جب نواب سر سلیم اللہ خان کو کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی کا خطاب دیا گیا تو اس غیور بزرگ نے اسے قبول تو کر لیا، اس لیے کہ عطائے شاہانہ کو رد کرنا اُس زمانے کے رواج اور امراء کی وضع داری کے خلاف تھا، لیکن اس خطاب کے متعلق علی الاعلان یہ کہا ”یہ تمغہ ایک طعمہ ہے، ایک رشوت ہے اور میرے گلے میں ذلّت اور لعنت کا طوق ہے“ ۔ انگریز نے کچھ بنگالیوں کی سرکشی اور بم بازی سے متأثر ہو کر اور کچھ مسلمانوں کی تالیفِ قلوب کے لیے اعلان کیا کہ ہندوستان کا دارالسلطنت کلکتے سے دہلی میں منتقل کر دیا گیا ہے کیوں کہ دہلی شاہانِ سلف کا صدر مقام ہونے کی حیثیت سے اس عزت کا مستحق ہے ۔ اقبال نے بھی تقسیمِ بنگال کی تنسیخ پر تو دوسرے مسلمانوں ہی کی طرح صدمہ محسوس کیا لیکن انگریز کی طرف سے اس کی تلافی کا بھی کسی حد تک اعتراف کیا ۔ چناں چہ انہوں نے عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا کہ حکومت نے انتقالِ دارالسلطنت سے گویا بنگالیوں کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی ہے اور بنگالی سمجھتا ہے کہ اس کی جیت ہوئی ہے ۔ اس خط میں دو شعر بھی لکھے ہیں :

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہوگیا وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن گئی
تاجِ شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی[1]

یہی ۱۹۱۱ء تھا جس میں روس و برطانیہ نے ترکی و ایران کو ہضم کرنے کے لیے اتحاد کیا ۔ ادھر شمالی ایران میں روس نے مسلمانوں کو تختۂ مشقِ ستم بنایا، ادھر طرابلس میں تُرکوں کو آگ اور خون سے سابقہ پڑا ۔ پھر ۱۹۱۲ء میں جنگِ بلقان کی آفت نازل ہوگئی جو ۱۹۱۳ء تک رہی ۔ مولوی

۱۔ مکاتیبِ اقبال حصہ دوم ۱۵۲ - ۱۵۳۔

ظفر علی خاں، مولانا ابولکلام آزاد اور مولانا محمد علی اپنے اپنے حلقوں میں تحریر و تقریر کے ذریعے سے مسلمانوں کو اظہارِ حسیاتِ ملّیہ، اتحاد اور اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے آمادہ و تیار کر رہے تھے ۔ اقبال نے ”طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں“، ”مسلم“، ”فاطمہ بنت عبداللہ“ اسی زمانے میں لکھیں ۔ ”شمع و شاعر“، ”شکوہ“ اور ”جوابِ شکوہ“ تینوں نظمیں ایران، طرابلس بلقان وغیرہ کے حوادث سے متاثر ہو کر کہی گئیں اور ان کا ایک ایک مصرع مسلمانانِ ہند کے ان جذبات کا آئینہ دار ہے جو اس زمانے میں جوش و خروش کے کمال تک پہنچ گئے تھے ۔ ”جوابِ شکوہ“ تو مجروحینِ بلقان کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض ہی سے لکھی گئی تھی ۔

جنگِ یورپ اوّل

۱۹۱۳ء کے وسط میں جنگِ بلقان ختم ہوئی اور ۱۹۱۴ء میں جنگِ یورپ کا آغاز ہوا ۔ اقبال طبعاً بھی اور مصلحتاً بھی عملی سیاسیات سے علیحدہ رہے، بلکہ غیر سیاسی مجالس میں بھی نظر نہ آتے تھے ۔ مولانا شوکت علی نے ان کو اولڈ بوائیز ایسوسی ایشن علی گڑھ کالج کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی تو علامہ نے جواب لکھا :

”بھائی شوکت! اقبال عزلت نشیں ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے ۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے ۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو، میں ایک عرصے سے خدا گڑھ رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی ۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہیے ۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقاتِ ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے ۔“[1]

۱۔ مکاتیبِ اقبال حصہ اول ۲۵۵ ۔

ترکوں سے جنگ چھڑتے ہی حکومت نے مولانا محمودالحسن شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیز گل کو حجاز سے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا بھیج دیا - ۱۹۱۵ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نظر بند کردیے گئے اور ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی بھی پابند و مقیّد قرار پائے -

میثاقِ لکھنؤ

۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان میثاقِ لکھنؤ طے پایا - یعنی جب ان دونوں جماعتوں کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوئے تو ان کے اکابر نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلاف کو دور کرنے کے لیے باہم قرار داد کی کہ آئندہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ہوگا - جن صوبوں میں مسلم اکثریت ہے، ان میں ان کو اکثریت سے محروم کر کے صرف مساوات دی جائے گی اور ان کی زائد نشستیں اقلیتوں میں تقسیم کر دی جائیں گی - اور جن صوبوں میں مسلم اقلیّت ہے ان میں مسلمانوں کو پاسنگ دیا جائے گا - لکھنؤ میں کانگرس کے صدر امبیکا چرن موزمدار اور لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح تھے - میثاق ان دونوں اجلاسوں میں پیش ہوا اور دونوں جماعتوں نے اس کی تصدیق و توثیق کر دی -

علاّمہ اقبال اس میثاق کے مخالف تھے کیوں کہ اس کے ماتحت مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو موثر اقتدار نہ ملتا تھا اور مسلم اقلیّت والے صوبوں میں پاسنگ کی وجہ سے اُن کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا تھا - اس کے علاوہ علاّمہ کا خیال یہ تھا کہ ایسا میثاق اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں قومیتِ متحدہ کی داغ بیل ڈالنا منظور ہو اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں قومیتِ متحدہ کی تعمیر نا ممکن ہے، نہ اس کے لیے کوشش کرنا مفید ہے -

اگرچہ علاّمہ اقبال سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے محترز رہتے تھے، لیکن ان کی شخصیت سیاسیات (کیا ملکی اور کیا غیر ملکی) پر چھائی ہوئی معلوم

ہوتی تھی - کیوں کہ وہ 'قوم کے شاعر' یعنی ''قوم کی آنکھ'' تھے اور قوم کی ہر مصیبت پر اشک بار نظر آتے تھے :

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ[1]

جنگ کے زمانے میں علامہ اقبال نے ''اسرارِ خودی،، اور رموزِ بیخودی،، مکمل کیں - ۱۹۱۳ء میں '' اسرارِ خودی ،، لکھنی شروع کی ، ۱۹۱۸ء میں '' رموز بیخودی ،، ختم کی -

رولٹ بِل

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوگئی - جون ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی مزید دستوری اصلاحات کے متعلق مانٹیگو چمسفرڈ رپورٹ شائع ہوئی - ۱۹۱۹ء کے آغاز میں حکومت نے رولٹ بِل پاس کر دیا جس میں عدالت اور پولیس کو بہت زیادہ اور ناواجب اختیارات دیے گئے تھے - اس قانون کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جنگ کے خاتمے پر ہزارہا ہندوستانی اپنے ملک میں واپس آ رہے تھے - فوجی بھی، غیرفوجی بھی، تاجر بھی، صنعت کار اور مزدور بھی، سیاسی رہنا اور کار کن بھی - حکومت کو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ مبادا ہندوستان میں فتنے کا باعث ہوں، لہٰذا پولیس کو ایسے اختیارات حاصل ہونے چاہییں کہ جس کو وہ چاہے، وارنٹ کے بغیر گرفتار کرلے اور جس مکان کی تلاشی لینی چاہے، اس میں بےتکلف گھس جائے - اس پر گاندھی جی نے ہڑتالیں کرائیں اور ستیاگرہ کیا - پنجاب میں حکام نے سخت مظالم روا رکھے -

مارشل لاء

جنرل ڈائر نے جلیاں والہ باغ امرتسر میں اندھا دھند گولیاں چلوا کر صدہا انسانوں کو نذرِ اجل کر دیا - پنجاب میں مارشل لا نافذ کیا گیا جس میں عوام اور طالب علموں سے نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا - اب پورا ملک بلاامتیاز

۱- '' شاعر،، بانگ درا ۵۳ -

مذهب و ملّت احتجاج اور تنفّر کا هنگامه زار بن رها تها ۔ مسلمانوں کے دلوں پر جلیاں‌واله باغ اور پنجاب کے مظالم سے بهی زیاده گهرا چرکه ترکی کی شکست سے لگ چکا تها ، جس کی وجه سے خطره تها که ترکانِ آلِ عثمان کی آزادی و خود مختاری خاک میں ملا دی جائے گی ۔ خلافتِ اسلامیه کی مسند کے گرد فرنگی گدھ منڈلا رہے تهے ۔

مطالبات

هندوؤں اور مسلمانوں نے متحده آواز سے دو مطالبے کیے ۔ ایک جلیاں‌واله باغ کے حادثهٔ فاجعه اور مارشل لا کے سلسلے میں جن افسروں کو جور و جفا اور قتل و خون کا ملزم پایا جائے ، انهیں قرار واقعی سزائیں دی جائیں ۔ دوسرے حکومتِ برطانیه خلافتِ اسلامیه کی حفظ و بقا کے لیے ترکوں سے انصاف کرے کیوں که یه مطالبه برطانیه کی سات کروڑ مسلم رعایا کے نازک ترین مذهبی جذبات سے تعلق رکهتا ہے ۔

انهیں دنوں کا ذکر ہے ایک دن راقم خدمت میں حاضر تها ۔ علّامه خاموش بیٹهے تهے لیکن غصّے کے آثار چهرے سے ظاهر تهے ۔ ایک دم فرمایا ”سالک صاحب! دیکھیے مولوی ابوالکلام نے جو ”تذکرہ“ لکها ہے اُس کے دیباچے میں کوئی صاحب مولوی فضل الدین احمد لکهتے هیں که اقبال پہلے کافر تها ۔ ”الهلال“ نے اس کو مسلمان بنایا“ ۔ میں یه سن کر چونکا ۔ ”تذکرہ“ تو پڑها تها لیکن اس کے دیباچے پر محض سرسری نظر ڈالی تهی ۔ حضرتِ علّامه نے خود هی ”تذکرہ“ میری طرف بڑهایا ۔ میں نے دیباچه نکال کر پڑها تو لکها تها که اقبال کی مثنویاں تحریکِ ”الهلال“ هی کی آوازِ باز گشت هیں اور آگے چل کر یه بتایا تها که اقبال کے جو مذهبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے ، ان میں اور مثنویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے“ ۔ راقم نے عرض کیا که مولوی فضل الدین احمد نے حقیقتاً غلط لکها ۔ ان کو آپ کے مسلک و مذهب کے متعلق کچھ بهی معلوم نہیں ۔ انهیں

لکهنے پڑهنے سے کیا سروکار ۔ وه تو مطبع ”الهلال“ کے مہتمم تهے ۔ اس کے بعد راقم نے چند ایسے فقرے کہے جن سے مقصود یه تها که علّامه کے دل میں مولانا ابوالکلام کے متعلق کوئی کدورت باقی نه رهے ۔ خدا جانے یه مقصود حاصل هوا یا نہیں ۔ بہر حال چوں که راقم نظم و نثر اور جذباتِ اسلامی میں ان دونوں هستیوں سے یکساں مستفید هوا تها ، اس لیے اپنی طرف سے کمی نه کی :

دل کو میں روؤں یا جگر کو میر میری دونوں سے آشنائی ہے

اس کے بعد علامه نے مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھ کر ان سے بهی اس بات کی شکایت کی۔[1]

اس زمانے میں حضرت علامه نے مولانا سید سلیمان ندوی سے مستفیدانه خط و کتابت کا سلسله جاری کر رکها تها جو کئی سال تک جاری رها ۔ اور اس میں ادب ، لغت ، فلسفه ، تفسیر ، حدیث ، فقه وغیره کے بیسیوں مسائل زیر بحث آئے ۔ یه تمام خطوط (یعنی جو علامه نے لکهے) ”اقبال نامے“ میں جمع کر دیے گئے هیں ۔ علامه کا یه قاعده تها که جب کبهی انهیں فقه یا تفسیر وغیره میں کوئی الجهن هوتی ، وه اپنے دوست مولویوں کو خطوط لکهتے ۔ ان کو تلاش کرا کر بلواتے اور ان سے باتیں کرتے ۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرت سر کے مقام پر کانگرس ، مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانه اجلاس قرار پائے ۔ اس موقع پر گاندهی ، تلک ، مسز بیسنٹ ، موتی لال نهرو اور دوسرے بڑے بڑے رهنما کانگرس میں شریک هوئے ۔ پنڈت موتی لال نهرو نے صدارت کی ۔ مسلم لیگ کا اجلاس منڈوه کنهیا لال میں هوا ۔ حکیم اجمل خاں نے صدارت فرمائی ۔ اس موقع پر مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بهی بیتول (سی ۔ پی) جیل سے رها هو کر آپہنچے ۔ علامه اقبال اور مرزا جلال الدین نواب سر ذوالفقار علی خان کی

۱- اقبال نامه عطا اللہ صفحه ۱۱۰-۱۱۱-

موٹر کار میں لاہور سے چلے کہ امرت سر کے ہنگاموں کو دیکھ آئیں ۔

اقبال اور علی برادران

وہاں پہنچ کر جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران کے ساتھ بغل گیر ہوئے ، تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا ۔ اکثر لوگ اشکبار تھے ۔ علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعارِ آبدار فرمائے ، جو اُسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے :

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
کیں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

ترکِ موالات

امرت سر کے ان اجلاسوں کا اثر یہ ہوا کہ ہندو اور مسلم عوام گاندھی جی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ۔ کانگرس کے ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے مطالبۂ تحفظِ خلافت کی علی الاعلان حمایت شروع کر دی اور کانگرس اور لیگ نے مل کر فیصلہ کیا کہ ۱۹۱۹ء کی قسط اصلاحات کو مسترد کر دیا جائے اور کوئی ہندوستانی ان اصلاحات کے ماتحت کسی کونسل کی ممبری کا امیدوار نہ ہو۔ جب حکومت نے جلیاں والا باغ اور مارشل لاء کے حوادثِ ہائلہ کی تحقیقات کرا کر متعلقہ افسروں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی تو ملک بھر میں بددلی پھیل گئی اور ۱۹۲۰ء میں عدمِ تعاون یا ترکِ موالات کی تحریک کا اعلان کر دیا گیا ۔ پانسو علماء نے ترکِ موالات بہ کفار کا فتویٰ دے دیا ۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ، سرکاری خطابات ، سرکاری مدارس ، سرکاری کونسلوں اور سرکاری عدالتوں کا ترک ، یہ اس تحریک کے اجزا تھے ۔

مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، مولانا ابوالکلام ، مولانا ظفر علی خان نے مسلمانوں میں اس تحریک کو مقبول بنانے کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا ۔ گاندھی جی پورے ملک کے واحد لیڈر تسلیم کیے گئے ۔ اس تحریک میں ہزارہا انسان گرفتار ہو کر قید و بند کے سپرد ہوئے ۔ چوں کہ عدمِ تعاون سب کا مسلک تھا اس لیے کوئی گرفتار بلا عدالت میں صفائی پیش نہ کرتا اور مقدمے کی تفصیلات کے آخر میں سزائے قید سن کر ہنسی خوشی جیل کر روانہ ہو جاتا ۔

وفدِ خلافت یورپ میں

تحریک کے زور میں آنے سے پہلے مولانا محمد علی ایک وفدِ خلافت لے کر یورپ گئے تا کہ حکومتِ برطانیہ ، برطانوی عوام اور جمہور ممالک فرنگ کو اس مسئلے میں مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ بتائیں ۔ منظور یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح یورپ اور خاص کر برطانیہ کے اربابِ حکومت مسلمانوں کی مذہبی تالیفِ قلوب ہی کے نقطۂ نظر سے خلافتِ اسلامی یعنی سلطنتِ ترکانِ عثمانی سے انصاف کریں ۔ اس پر علامہ اقبال نے لکھا :

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے تُو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

" مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی "

یہ وفد ناکام و نامراد لوٹا اور ہندوستان میں انگریز کے خلاف تحریک اور بھی زیادہ شدت اختیار کر گئی ، لیکن فرنگی ٹس سے مس بھی نہ ہوئے ۔ انھیں بار بار وعدے یاد دلائے گئے جو انھوں نے جنگ کے دوران میں ترکی سلطنت کی بقا کے لیے کیے تھے ، لیکن کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ جب

موٹر کار میں لاہور سے چلے کہ امرت سر کے ہنگاموں کو دیکھ آئیں۔

اقبال اور علی برادران

وہاں پہنچ کر جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران کے ساتھ بغل گیر ہوئے، تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ اشک بار تھے۔ علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعارِ آب دار فرمائے، جو اُسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہو گئے تھے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو فطرت ہو بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشک ازفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
کیں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

ترکِ موالات

امرت سر کے ان اجلاسوں کا اثر یہ ہوا کہ ہندو اور مسلم عوام گاندھی جی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ کانگرس کے ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے مطالبۂ تحفظِ خلافت کی علی الاعلان حمایت شروع کر دی اور کانگرس اور لیگ نے مل کر فیصلہ کیا کہ ۱۹۱۹ء کی قسط اصلاحات کو مسترد کر دیا جائے اور کوئی ہندوستانی ان اصلاحات کے ماتحت کسی کونسل کی ممبری کا امیدوار نہ ہو۔ جب حکومت نے جلیاں والا باغ اور مارشل لا کے حوادثِ ہائلہ کی تحقیقات کرا کر متعلقہ افسروں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی تو ملک بھر میں بددلی پھیل گئی اور ۱۹۲۰ء میں عدمِ تعاون یا ترکِ موالات کی تحریک کا اعلان کر دیا گیا۔ پانسو علما نے ترکِ موالات بہ کفار کا فتویٰ دے دیا۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ، سرکاری خطابات، سرکاری مدارس، سرکاری کونسلوں اور سرکاری عدالتوں کا ترک، یہ اس تحریک کے اجزا تھے۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خان نے مسلمانوں میں اس تحریک کو مقبول بنانے کے لیے ملک بھر کا دورہ کیا۔ گاندھی جی پورے ملک کے واحد لیڈر تسلیم کیے گئے۔ اس تحریک میں ہزارہا انسان گرفتار ہو کر قید و بند کے سپرد ہوئے۔ چوں کہ عدمِ تعاون سب کا مسلک تھا اس لیے کوئی گرفتار بلا عدالت میں صفائی پیش نہ کرتا اور مقدمے کی تفصیلات کے آخر میں سزائے قید سن کر ہنسی خوشی جیل کو روانہ ہو جاتا۔

وفدِ خلافت یورپ میں

تحریک کے زور میں آنے سے پہلے مولانا محمد علی ایک وفدِ خلافت لے کر یورپ گئے تاکہ حکومتِ برطانیہ، برطانوی عوام اور جمہور ممالک فرنگ کو اس مسئلے میں مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ بتائیں۔ منظور یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح یورپ اور خاص کر برطانیہ کے اربابِ حکومت مسلمانوں کی مذہبی تالیفِ قلوب ہی کے نقطۂ نظر سے خلافتِ اسلامی یعنی سلطنتِ ترکانِ عثمانی سے انصاف کریں۔ اس پر علامہ اقبال نے لکھا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تُو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

" مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی "

یہ وفد ناکام و نامراد لوٹا اور ہندوستان میں انگریز کے خلاف تحریک اور بھی زیادہ شدت اختیار کر گئی، لیکن فرنگی ٹس سے مس بھی نہ ہوئے۔ انھیں بار بار وعدے یاد دلائے گئے جو انھوں نے جنگ کے دوران میں ترکی سلطنت کی بقا کے لیے کیے تھے، لیکن کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جب

استنبول پر انگریزوں کا فوجی قبضہ ہوگیا ، خلیفۃ المسلمین فرنگی کی قید میں اسیر ہوگئے اور ترکانِ احرار شدید ترین تشدّد کا نشانہ بننے لگے تو ان غیور و شجاع نوجوانوں نے استنبول سے دور انا طولیا میں مصطفیٰ کمال پاشا کے زیرِ قیادت اپنے شکستہ و سوختہ ، مجروح اور ماتم زدہ ملک کی قوتوں کو جمع کرنا شروع کیا ، تاکہ ترکوں کو محکومی کی ذلّت سے نجات دلا کر پھر آزاد اور آبرو مند قوموں کی صف میں کھڑا کر دیں ، لیکن استنبول میں اتحادیوں کے اشارے سے خلیفۃ المسلمین نے مصطفیٰ کمال پاشا کی موت کے حکم پر دستخط کر دیے جو سلطنت اور خلافت کا باغی تھا ۔

معاہدۂ سیورے

ادھر مصطفیٰ کمال پاشا نے اناطولیا میں ترکی کی ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھ کر یونانیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا ، جن کو اتحادیوں نے اکسا کر ترکوں پر حملہ آور کرا دیا تھا اور ادھر سیورے کے مقام پر اتحادیوں نے اپنے قیدی خلیفہ سے ایسی شرائطِ صلح پر دستخط کرا لیے جو حقیقت میں ترکوں کے لیے پیغامِ اجل تھیں ۔ مثلاً تھریس اور سمرنا یونانیوں کے حوالے کر دیے گئے ۔ استنبول آرمینیا کے علاقے میں شامل کرکے اتحادیوں کے سپرد کر دیا گیا اور ترکی کو صرف پندرہ ہزار فوج رکھنے کی اجازت دی گئی ۔ معاہدۂ سیورے سے ساری دنیائے اسلام تڑپ اٹھی ۔ ہر طرف سے شورِ احتجاج بلند ہوا ۔ مصطفیٰ کمال کے بہادر اور جاں باز ساتھیوں کو دنیا بھر کی حمایت نصیب ہوگئی ۔ ہندوستان میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کو بڑا فروغ ہوا ۔ ہزاروں مسلمان سول نافرمانی کرکے جیلوں میں چلے گئے ۔

اقبال کی بے تعلقی

علامہ اقبال ان تمام ہنگاموں سے الگ تھلگ '' پیامِ مشرق '' کی ترتیب میں مصروف تھے ۔ انھوں نے اس زمانے کی پُرشور سیاسیات سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ۔ بلاشبہ

وہ اس امر سے بے حد مسرور و مطمئن تھے کہ فرنگی کے مقابلے میں ہندی مسلمان کی خودی بیدار ہو رہی ہے اور وہ طلبِ حرّیت میں قدم آگے بڑھا رہا ہے ۔ لیکن انھیں ایک تو '' قومیتِ متحدۂ ہند '' کے نصب العین اور وطنیت کے سیاسی تصور سے کوئی امیدِ خیر نہ تھی ، دوسرے وہ اس بات کے قائل بھی نہ تھے کہ ہندوستان میں کوئی ایسی قوم موجود ہے یا بن سکتی ہے جس کو ہندوستانی قوم کہا جا سکے ۔ چناں چہ صرف ایک ہی سال بعد اس تحریک کے خاتمے پر شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کے ہنگاموں نے علامہ کے اس خیال پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی کہ محض انگریز دشمنی کی بنا پر کسی قومیت کی تعمیر نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے دوسرے عناصر و شروط ضروری ہیں ۔

۱۹۲۰ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شریک تو ہوئے لیکن کوئی مستقل نظم نہ سنائی بلکہ دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں پڑھ کر سٹیج سے اتر آئے ۔ 'پیسہ اخبار'[1] اور امتیاز علی تاج کے رسالہ '' کہکشاں '' میں یہ نظمیں درج ہوئیں ۔

خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام

ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں مسلمانوں کو جن کوائف و حوادث سے سابقہ پڑ رہا تھا اور علامہ اقبال کو قدرت سے جو درد مند اور حسّاس دل عطا ہوا تھا ، ان دونوں کا تقاضا یہی تھا کہ اقبال کا دل پھوڑا بن کر پکے اور پھر پھوٹ بہے ، لیکن وہ جانتے تھے کہ اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے شدید اور شورانگیز انداز اختیار کرنا کسی حال میں مفید اور نتیجہ خیز نہیں اور اس شورانگیز اظہار کا کھوکھلا پن وہ تحریکِ ترکِ موالات کے دوران میں دیکھ ہی چکے تھے ۔ لہٰذا انھوں نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کا انتظار کیا ۔ اور جب اپریل ۲۲ء میں یہ جلسہ ہوا تو علامہ نے ہزاروں درد رسیدہ

۱۔ پیسہ اخبار ۱۵ اپریل ۲۰ء '' ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز '' الخ ۔

اور غم زدہ مسلمانوں کے مجمع میں ''خضرِ راہ'' پڑھی ۔ راقم الحروف اس جلسے میں موجودہ تھا ۔ ایک تو اس نظم میں اقبال کے شاعرانہ تخیّل اور بدیع اسلوبِ بیان کا جمال پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا اور ایک ایک شعر پر اربابِ ذوقِ سلیم وجد کر رہے تھے ، دوسرے اس میں علامہ نے جنگ عظیم کے سلسلے میں فاتح اقوام کی دھاندلی ، ان کی ابلیسانہ سیاست ، سرمایہ دار کی عیّاری ، مزدور کی بیداری ، عالمِ اسلام ، خصوصاً ترکانِ آلِ عثمان کی بےدست و پائی پر موثر اور بلیغ تبصرہ کیا ہے اور اسی سلسلے میں نسلی قومیت اور امتیازِ رنگ و خون کے تصورات پر بھر پور چوٹ کی ہے ۔ اس نظم کے حسن اور اس کے درد و اثر میں کلام نہیں لیکن اس کی ترکیب زیادہ تر واقعات و حقائق کو بیان کرنے پر مبنی ہے اور آخری چند اشعار کے سوا کامرانی و شادمانی اور امید اور امنگ کے آثار کم ہیں ۔ اس لیے کہ حالات ہی ایسے تھے ۔ ترکی موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھا اور ہندوستان کے مسلمان جوش و خروش کے عالم میں ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس کا انجام انھیں معلوم نہ تھا ۔[1]

لیکن جب ۱۹۲۳ء میں علامہ نے انجمن ہی کے اجلاس میں '' طلوعِ اسلام '' پڑھی تو حالات بدل چکے تھے ۔ ترکانِ احرار اپنی آزادی کے جہاد میں کامیاب ہوچکے تھے یعنی ان کی فتح و ظفر میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا ، ترکی کے لیے آبرومندانہ زندگی کا سر و سامان ہو رہا تھا ، اس لیے اس نظم کا لہجہ پہلے ہی شعر سے امید افزا ، ولولہ انگیز اور روشن و درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور یہ درخشانی آخر تک نور بکھیرتی چلی گئی ہے ۔ سرمایہ داری کی مخالفت ، مزدور کی حمایت ، ایشیا اور اسلام کے امید افزا حالات اس نظم کے نمایاں خد و خال ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ '' خضرِ راہ '' اور '' طلوعِ اسلام '' نے اُس زمانے میں مسلمانوں کو بہت

۱۔ خضر راہ ، بانگ درا ۲۸۸۔

بڑا سہارا دیا اور ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراطِ مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا ۔[1]

احیائے لیگ کی کوشش

ترکِ موالات اور سول نافرمانی کے جوش و خروش نے عامتہ المسلمین کو آتش زیرِ پا کر رکھا تھا ۔ مجاہد اور سرفروش قسم کے رہنما سیاست کے میدان پر قابض تھے ۔ آئین پسند ، تعاون پرست اکابر ان حالات پر مضطرب ہو رہے تھے اور اوپر کے طبقوں میں کوشش کی جا رہی تھی کہ مسلم لیگ کو جو اب کانگرس کا دُم چھلا بن کر اپنی ہستی کو گم کر چکی تھی ، از سر نو زندہ کرکے آئینی طور طریقے اختیار کیے جائیں۔چناں چہ سر آغا خان اور مشیر حسین قدوائی ایک طرف خلافت کی حمایت میں بیان دے رہے تھے اور دوسری طرف مسٹر محمد علی جناح کی وساطت سے مسلم لیگ کے احیا کا اہتمام بھی کر رہے تھے ۔ اقبال کو اس فرسودہ و محکومانہ سیاست سے اختلاف تھا ۔ انھوں نے '' صدائے لیگ '' کے عنوان سے چند اشعار لکھے :

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر	اترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہیگی بتا ہمیں	اے جانِ بر لب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیالِ دشت و بیاباں نکال دے	مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب	اس دین میں ہے ترکِ سواد حرم مباح

بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ است
یعنی حجاب ''غیبت کبریٰ'' دریدہ است[2]

اقبال اور گاندھی

یعنی اگرچہ علامۂ اقبال کو قومیتِ متحدہ کے تصور سے اختلاف تھا ، لیکن چوں کہ وہ استعمار کے سخت مخالف تھے ، اس لئے اختلاف کے باوجود مجاہدینِ حرّیت کی

۱۔ طلوع اسلام ، بانگ درا ۳۰۳۔
۲۔ زمیندار ۹ نومبر ۱۹۲۱ء۔

بہادری اور اولوالعزمی اور ایثار پیشگی ان کے نزدیک محبوب تھی اور وہ ان کے مخالفین کی حمایت کسی حال میں نہ کر سکتے تھے ۔ انھیں دنوں علامہ نے گاندھی جی کے عزمِ بلند اور ان کی بے سرو سامانی پر نہایت خلوص و قدر دانی کے جذبے سے چند اشعار آب‌دار ارشاد فرمائے:

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کمزور کی کمند ہے دنیا میں نا رسا
نازک یہ سلطنت صفتِ برگِ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا
گاڑھا ادھر ہے زیبِ بدن اور ادھر زرہ
صرصر کی رہ گزار میں کیا عرض تو تیا
پس کر ملے گا گردِ رہِ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ہوا قوت آزما
بولا یہ بات سن کے کمالِ وقار سے
وہ مردِ پختہ کار و حق اندیش و با صفا
"خارا حریف سعیٔ ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ ایست در بنِ دنداں خلال را"[1]

اسی زمانے میں علامہ نے اکثر ظریفانہ اشعار لکھے جو وقتاً فوقتاً 'زمیندار' میں شائع ہوتے رہے اور "بانگ درا" کے آخر میں درج ہیں ۔ ان میں سے بعض اشعار و قطعات ترتیبِ "بانگِ درا" کے وقت نظر انداز کر دیے گئے ۔ لیکن بعض لوگوں نے وہ بھی نومبر ۱۹۲۱ء ، فروری ۱۹۲۲ء ، اپریل ۱۹۲۲ء، مئی ۱۹۲۲ء کے "زمیندار" کے فائلوں میں سے نقل کر کے چھاپ دیے ہیں ۔

رات بھر میں تعمیرِ مسجد

مئی ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے ، لاہور میں شاہ عالمی دروازے کے باہر ایک مندر تعمیر ہوا ۔ مسلمانوں

۱- زمیندار ۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء-

نے مطالبہ کیا کہ اس کے پاس ہی ایک مسجد بھی بنی چاہیے ۔ یہ مطالبہ آگ کی طرح پھیل گیا ۔ جوش و خروش کا زمانہ تھا ۔ مسلمانوں نے خود ہی ایک قطعۂ زمین (ملکیت بلدیۂ لاہور) تجویز کیا ۔ صدہا نوجوان نماز عشاء کے بعد عمارتی مسالے کی فراہمی بنیادوں کی کھدائی اور تعمیر میں مصروف ہوگئے اور نماز فجر تک دو دکانیں اور ان کے اوپر مسجد کی منزل پوری کر دی (پھر کئی سال بعد انجمنِ اسلامیہ پنجاب نے اس مسجد کو مناسب و موزوں آرائش اور تزئینِ تعمیر سے مکمل کیا)۔ علامہ نے مسلمانوں کے اس جذبۂ دینی سے متاثر ہو کر چند اشعار لکھے ۔ پہلا شعر یہ تھا :

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے ، برسوں میں نمازی بن نہ سکا[1]

میری جیل سے مراجعت

حضرتِ علامہ ۱۹۲۲ء میں انارکلی بازار کے بالا خانے سے اٹھ کر میکلوڈ روڈ کی ایک پرانی کوٹھی میں منتقل ہوگئے ۔ یہ کوٹھی پربھات سنیما اور رتن سنیما کے درمیان واقع ہے ۔ راقم الحروف جب تحریکِ خلافت میں ایک سال کی قید کاٹ کر واپس آیا اور حسبِ عادت علامہ سے ملنے کے لیے انارکلی کو چلا تو احباب نے بتایا کہ وہ میکلوڈ روڈ کے فلاں مکان میں چلے گئے ہیں ۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ میکلوڈ روڈ سے اندر جا کر ایک فرسودہ مکان ہے اور دائیں ہاتھ اس مکان کا ایک چھوٹا سا "ضمیمہ" بھی ہے ۔ یہاں علی بخش بیٹھا تھا ۔ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا اور جھٹ علامہ کو اطلاع دی ۔ میں اسی "ضمیمے" کے ایک کمرے میں جس کو علامہ نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا ، داخل ہوا ہی تھا کہ علامہ اپنے معمول کے خلاف اٹھ کر لپکے اور مجھے سینے سے لگا لیا ۔ اس کے بعد بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ۔ مجھ سے جیل کی زندگی کی تفصیلات دریافت کیں اور یہ سن کر کہ وہاں صبح سے

۱: ان اشعار کے لیے دیکھو "بانگ درا" ۳۳۶ -

شام تک ایک ضبط و نظم کی شدید پابندی کرنی پڑتی ہے ، فرمایا : ”الدنیا سجن المومن وجنۃالکافر،، کا غالباً یہی مطلب ہے : جس طرح قیدی ہر کام مقررہ وقت پر انجام دیتا ہے، محنت مشقت میں مصروف رہتا ہے اور روکھی سوکھی کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر خدا کا شکر کرتا ہے اور ہمیشہ نیک نامی کے ساتھ جیل سے نجات پانے کی دعائیں کرتا ہے ، اسی طرح مومن دنیا میں پابندی ، محنت ، سادگی ، فرض شناسی کی زندگی بسر کرتا ہے، تعیّش سے مجتنب رہتا ہے اور آبرو کے ساتھ اس تیرہ خاک داں سے رخصت ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں حاضر ہونے کا خواہاں رہتا ہے ۔ کافر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے ۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے اسی قسم کی بصیرت افروز باتیں ہوتی رہیں ۔ پھر میں نے عرض کیا ”حضرت! کیا لاہور میں اس سے بہتر کوٹھی نہ ملتی تھی؟ یہ تو بہت ہی پرانی ہے“۔ ہنس کر فرمانے لگے ”جی ہاں ! یہ تو صرف میری دعاؤں ہی کے سہارے کھڑی ہے ، ورنہ اس میں قائم رہنے کی کوئی بات باقی نہیں ،،۔

سید محمد علی جعفری اس زمانے میں علامہ سے اکثر ملتے تھے ۔ ان کا بیان ہے کہ جب سے علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہنے لگے ، ان کی حالت میں ایسا تغیّر پیدا ہوا ، گویا وہ بالکل ایک نئے شخص بن گئے ؛ میں بارہا جاتا اور کہتا کہ سیر کیا کیجیے تا کہ صحت اچھی رہے لیکن وہ ہلنے جلنے سے متنفر تھے اور ہر وقت سوچ میں ڈوبے رہتے تھے ، حقہ بہت پیتے تھے ۔ جب علامہ نے وہ نظم پڑھی: ع
”کبھی اے حقیقتِ منتظر“ . . . . . . تو اس میں ایک شعر کا مصرع ثانی تھا: ع

جو وطن ہے دشمنِ آبرو تو اماں ہے ملکِ حجاز میں

بعض لوگوں کے نزدیک یہ اخبار ”وطن“ (مدیر : مولوی انشاءاللہ) پر چوٹ تھی جس میں علامہ کے خلاف ایک مضمون چھاپا گیا تھا ۔

علّامہ ہروی سے ملاقات

اُس زمانے میں علامہ اقبال بہت سے علمی و دینی مسائل پر غور و خوض اور مطالعے میں مصروف تھے ۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون ، فقہ اور اجتہاد کے بہت سے مسئلوں کے علاوہ زمان و مکان کے متعلق بھی تحقیق و تدقیق کر رہے تھے ؛ چناں چہ سید سلیمان ندوی ، مولانا احمد دین امرتسری ، مولانا غلام مرشد اور دیگر علماء سے دریافت کرتے رہتے تھے کہ قدیم و جدید مسلمان علماء و فلاسفہ نے زمان ومکان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا سراغ لگائیں ۔ سید محمد علی جعفری نے ایران کے ایک فاضل علامہ عبدالعلی ہروی الطہرانی سے جو اُس وقت لاہور میں مقیم تھے ، علامہ کی ملاقات کرائی ؛ علامہ بے حد ذہین و طباع اور نہایت لسّان آدمی واقع ہوئے تھے ، عقائد میں کچھ بابیت اور کمیو نزم کی طرف مائل تھے یعنی جامد مولویوں میں سے نہ تھے لیکن ان سے متعدد ملاقاتوں کے بعد بھی علامہ کا اطمینان نہ ہوا ۔ پھر جعفری صاحب نے مولوی حشمت علی خیر اللہ پوری سے بھی علامہ کی ملاقات کا بندوبست کیا ۔ یہ صاحب حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے خالہ‌زاد بھائی اور ڈاکٹر محمد طفیل سول سرجن کے والد ماجد تھے ۔ فلسفے میں درخور وافی رکھتے تھے اور زمان و مکان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی ۔

نوابانِ کرنال کا مقدّمہ

مرزا جلال‌الدین فرماتے ہیں کہ ”اُس زمانے میں نوابانِ کرنال سجاد علی خان، لیاقت علی خان اور عمر دراز علی خان کی جائداد کے متعلق جھگڑا شروع ہو گیا تھا ۔ جب کمشنر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مقدمہ رکوا دیا اور تصفیے کے لیے نواب سر ذوالفقار علی خان ، نواب محمد حیات خان نون اور ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کو ثالث مقرر کر دیا ۔ فریقین نے اپنے اپنے وکیل بھی تجویز کر لیے ۔عمر دراز علی خان کے وکیل اور قانونی مشیر علامہ اقبال تھے اور سجاد علی خان کا وکیل میں تھا ۔ نواب ذوالفقار علی خان نے کہا ”بھئی

میں سے تھے ، علامہ کو ایک خط لکھا جس میں اندیشہ ظاہر کیا کہ اب آپ شاید آزادیٔ اظہار سے کام نہ لے سکیں ۔ اس پر علامہ نے ان کو خط لکھا جس میں تحریر فرمایا : ”قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان و آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں ، دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی ، انشا اللہ - اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے“[1] راقم الحروف نے بھی جو اس سے دو ماہ قبل ترکِ موالات میں سال بھر کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا ، ”زمیندار“ میں چند اشعار شائع کیے اور ایک دو کالم ”افکار و حوادث“ کے بھی لکھ دیے ، وہ اشعار زبان زدِ عام ہو گئے لیکن وہ ایک فوری جذبہ تھا ۔ اشعار چھپ جانے کے بعد راقم پر ندامت کا غلبہ ہوا اور چند ہفتے علامہ کی خدمت میں حاضری کی جرأت نہ کر سکا لیکن جب آخر ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا تو علامہ کے طرزِ تپاک اور محبت آمیز سلوک میں کوئی فرق نہ آیا تھا بلکہ وہ شاکی تھے کہ اتنی مدت تک ملنے کیوں نہ آئے ۔

مبارک باد پارٹی

عطائے خطاب پر اقبال کو مسلم ، ہندو ، سکھ معززینِ لاہور کی طرف سے مقبرۂ جہانگیر (شاہ درہ ، لاہور) میں ایک عظیم الشان پارٹی دی گئی جس میں پنجاب کے تمام سرکاری وغیر سرکاری عمائد و حکام شامل ہوئے۔ اقبال نے اس موقع پر انگریزی میں تقریر کی اور اس میں یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ گوئٹے کے دیوانِ مغرب کے جواب میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا نام ”پیامِ مشرق“ ہوگا ۔

اکتوبر ۲۳ء میں پنجاب ہائی کورٹ کا افتتاح وائسرائے نے کیا ۔ چیف جسٹس سر شادی لال کی تقریر کے بعد وائسرائے نے اس کا جواب دیا ۔ اس جواب میں انھوں نے نہایت شان دار الفاظ میں اقبال کی تعریف کی[2]

۱- اقبال نامہ عطاءاللہ ۲۰۶ - ۲-شاد اقبال -

اکٹھے چلیں گے“ ۔ چناں چہ ہم سب مل کر گئے ۔ وہاں ہم اکٹر لونی ہاؤس میں ٹھیرائے گیے ۔

”ہم نے کہا ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم سب پہلے سجاد علی خاں کے ہاں اور پھر عمر دراز علی خاں کے ہاں ٹھہریں گے ؛ چناں چہ یہی ہوا ۔ پنچوں نے اپنے بستر الگ کمروں میں لگوائے ، میں اور علامہ پاس پاس دو کمروں میں مقیم ہوئے ۔ جب صبح کو ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے میں جمع ہوئے تو علامہ نے کہا ”بھئی میز کی ترتیب دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی لیڈی کا ہاتھ ہے“ ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی اس میز کو ایک لیڈی ہی نے آراستہ کیا تھا جس کو لیاقت علی خاں انگلستان سے ہاؤس کیپر بنا کر ساتھ لائے تھے ۔

”ہم نے فریقوں کے کاغذات دیکھے اور بات چیت کے لیے تیار ہو گئے ۔ چھٹے ساتویں دن فریقین میں مصالحت ہو گئی ۔ علامہ اقبال کی روزانہ فیس دو سو روپے تھی اور میری ڈیڑھ سو روپے “

یہ ۱۹۲۲ء کے واقعات ہیں ؛ اسی سال لیاقت علی خاں انگلستان سے بیرسٹر بن کر آئے تھے ۔ جب ان کے برادرِ بزرگ نواب سجاد علی خاں نے انھیں پنجاب ہائی کورٹ میں ایڈووکیٹ کے طور پر درج کرانا چاہا تو درخواست پر میاں سر محمد شفیع اور مرزا جلال الدین ہی کے سرٹیفکیٹ پیش ہوئے تھے ۔

سر کا خطاب

۱۹۲۳ء کے پہلے ہی دن علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیا گیا ۔ چوں کہ تحریکِ ترکِ موالات کی وجہ سے عوام میں سرکاری خطابات کے خلاف ایک گونہ نفرت پیدا ہوچکی تھی اس لیے مسلمان علامہ اقبال جیسی محبوبِ عام شخصیت کا خطاب یافتہ ہونا تصور بھی نہ کرسکتے تھے ۔ طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہونے لگیں یہاں تک کہ میر غلام بھیک نیرنگ نے جو علامہ کے قدیم اور مخلص ترین احباب

پس منظر

بعد میں حضرتِ علامہ اور ان کے بعض گہرے دوستوں سے عطائے خطاب کا پس منظر تفصیل سے معلوم ہوا۔ ہمارے نزدیک صحیح ترین قصہ یہی ہے کہ سب سے پہلے اس زمانے کے چیف جسٹس سر شادی لال نے علامہ کو بلا کر ان سے کہا کہ حکومت نے مجھ سے خطابات کے لیے سفارشیں طلب کی ہیں اور میں آپ کے لیے ''خان صاحب'' کے خطاب کی سفارش کر رہا ہوں۔ علامہ نے بگڑ کر کہا کہ میں کسی خطاب کا خواہاں نہیں ہوں۔ آپ ہرگز سفارش کی زحمت نہ فرمائیے۔ سر شادی لال نے کہا کہ اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجیے، مزید غور کر لیجیے۔ علامہ نے فرمایا ''میں غور کر چکا ہوں۔ مجھے خطاب کی ضرورت نہیں''۔

دو تین دن بعد پھر سر شادی لال نے علامہ کو بلا بھیجا۔ آپ نے قاصد کے ہاتھ کہلا دیا کہ اگر خطاب کے سلسلے میں گفتگو کرنا مقصود ہے تو میرا جواب آپ کو معلوم ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔ ہاں اگر کوئی اور بات کرنی ہے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

اس زمانے میں پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن تھے جن سے نواب سر ذوالفقار علی خان کے گہرے تعلقات تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے گورنر صاحب سے ذکر کیا کہ مشہور بنگالی شاعر ٹیگور کو خطاب مل چکا ہے لیکن اقبال جو بہت بڑے شاعر اور مسلمانوں کے ہر دل عزیز لیڈر ہیں، اب تک قدر دانی سے محروم ہیں۔ گورنر نے کہا ''بہت اچھا، انہیں خان بہادر بنا دیا جائے گا''۔ نواب صاحب نے کہا کہ یہ اقبال کی ہتک ہے۔ پھر گورنر نے کہا کہ شمس العلماء کیسا رہے گا؟ نواب صاحب نے فرمایا ''یہ بھی مناسب نہیں''۔

اتنے میں ایک دن گورنر پنجاب نے علامہ کو گورنمنٹ ہاؤس میں دعوت دی۔ جب علامہ وہاں پہنچے تو گورنر نہایت تپاک سے ملے اور بتایا کہ ''لندن ٹائمز'' کے ایک مشہور مقالہ نگار آئے ہوئے ہیں اور میرے ہی پاس مقیم ہیں؛ وہ آپ سے ملاقات کے بے حد خواہاں تھے اس لیے آپ

کو تکلیف دی گئی ہے۔ اس مقالہ نگار نے "اسرار خودی" کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا تھا* اور مشرق وسطیٰ کے جن جن ملکوں میں گیا تھا، ان کے علمی و ادبی حلقوں میں علامہ اقبال کے کمالات کا چرچا بھی سن آیا تھا؛ اس کے علاوہ اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کے متعلق علامہ کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہ صحبت دو تین گھنٹے تک جاری رہی، آخر میں سر ایڈورڈ میکلیگن نے علامہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں آپ کے لیے "سر" کے خطاب کی سفارش کروں۔ علامہ نے انکار کیا اور کہا کہ میں خطابات و اعزازات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ علامہ نے دیکھا کہ ان کے انکار سے گورنر کی طبیعت مکدّر سی ہو گئی ہے اور یہ قدرتی بات تھی اس لیے کہ ملک کے عوام میں سیاسی لیڈروں نے خطابات کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی اور لوگ عام طور پر خطاب کو غیر ہر دل عزیزی کا سامان سمجھنے لگے تھے۔ گورنر سمجھے کہ اقبال بھی اس معاملے میں عوام ہی کے ہم خیال ہیں لیکن جب علامہ نے کہا کہ اگر آپ کو اصرار ہے تو خیر، یوں ہی سہی تو گورنر صاحب کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

شمس العلماء

اس کے بعد میکلیگن نے علامہ سے دریافت کیا کہ آیا آپ کی نظر میں اس وقت کوئی شخص شمس العلماء کے خطاب کے لیے موزوں ہے؟ علامہ نے فرمایا: "میں ایک شرط پر نام پیش کرنے کو تیار ہوں کہ صرف اسی نام کو پیش نظر رکھا جائے، کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے۔" میکلیگن نے کسی قدر تأمل کے بعد شرط قبول کر لی۔ علامہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک مولوی میر حسن شاہ پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اس خطاب کے

* اس وقت تک پروفیسر نکلسن کا ترجمہ "اسرار خودی" شائع ہو چکا تھا؛ مشہور نقاد ای۔ ایم فارسٹر نے اس پر مشہور علمی صحیفے اتھینیم میں مفصل تنقید لکھی تھی۔ اس کے علاوہ کیمبرج کے پروفیسر ڈکنسن نے ''نیشن'' میں بھی تبصرہ لکھا: غرض علامہ کا نام اور ان کا فلسفہ مغرب کے علمی حلقوں میں خاصا متعارف ہو چکا تھا؛ صرف ہندوستان کے فرنگی حکمران ہی علامہ اقبال سے بے خبر تھے۔

بہترین مستحق ہیں۔ میکلیگن نے کہا: "میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ہے۔ کیا انھوں نے کچھ کتابیں لکھی ہیں؟" علامہ نے فرمایا کہ انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ہوں، وہ میرے استادِ محترم ہیں۔

اس موقع پر علامہ نے گورنر کو خوب سمجھا دیا تھا کہ شاہ صاحب سرکار دربار کے قصے نہیں جانتے اس لیے ایسا بندوبست فرما دیجیے گا کہ اعلانِ خطاب کے بعد ان کو سیال کوٹ سے لاہور آ کر کسی رسم میں حصہ نہ لینا پڑے؛ چناں چہ جب خطاب کا اعلان ہوا تو سر ایڈورڈ میکلیگن نے مولوی صاحب کی سند خطاب ان کے صاحب زادے سید علی نقی شاہ کے حوالے کر دی جو گورنمنٹ ہاؤس ہی میں ڈاکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔*

میاں عبدالعزیز کی خاطر دست بردار

علامہ کے احباب اور دوسرے نیاز مند ہمیشہ انھیں پنجاب کونسل میں بطور امید وار کھڑے ہونے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے انتخابات کا وقت آیا تو دوستوں نے اصرار کیا، اخباروں نے اپیلیں شائع کیں، عوام نے وفود بھیجے؛ غرض ان کو بے حد مجبور کیا گیا کہ وہ لاہور سے کونسل کی ممبری کے لیے امید وار کھڑے ہو جائیں، لیکن چوں کہ اسی حلقے سے میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء کی امید واری کا اعلان ہو چکا تھا اور علامہ سے میاں صاحب کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے اس لیے علامہ کی مروّت نے ان کے مقابلے میں کھڑے ہونا گوارا نہ کیا۔†

۱۹۲۳ء ہی کا ذکر ہے کہ علامہ کی لودھیانہ والی بیگم کا انتقال ہو گیا؛ ان کے بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ کسی اندرونی پیچیدگی کی وجہ سے فوت ہو گئیں۔ لودھیانے کے بڑے قبرستان میں مرحومہ کی لوحِ قبر پر اقبال کا لکھا ہوا قطعۂ تاریخ کندہ تھا (غالباً اب تو وہ قبرستان ہی صاف ہو چکا ہوگا):

* ماخوذ از "روز گار فقیر" (کرنل فقیر سید وحید الدین)۔
† "امروز" اقبال نمبر، ۲۲ اپریل ۵۰ء۔

المبطون شہید (حدیث)

اے دریغا ز مرگ ہم سفرے — دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم — سخنِ پاک مصطفیٰ آورد
بہرِ سالِ رحیلِ او فرمود — بہ شہادت رسید و منزل کرد

(اقبال) ۱۳۴۲ھ

پیامِ مشرق

یکم مئی ۱۹۲۳ء کو "پیامِ مشرق" شائع ہو گئی جو جرمنی کے نامور شاعر گوئٹے کے "دیوانِ مغرب" کے جواب کے طور پر لکھی تھی اور علامہ تین چار سال سے اس کی ترتیب میں مصروف تھے۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں چودھری محمد حسین، ایم۔اے نے اس کتاب کے تعارف کے لیے رسالہ "ہزار داستان" میں ایک مفصّل مضمون لکھا جو ۱۷ مارچ کے "زمیندار" میں نقل کیا گیا۔ چوں کہ اُس زمانے میں "زمیندار" کی ادارت سالک اور مہر کے سپرد تھی اور ان دونوں کو حضرتِ علامہ کی شخصیت سے خاص محبت اور ان کی علمی جلالتِ قدر سے مخصوص عقیدت تھی اور ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیے مخلصانہ جوش رکھتے تھے اس لیے "زمیندار" میں علامہ کی تصانیف کے متعلق اطلاعات اور ان پر تنقیدی و تقریظی مقالات اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ خود حضرت علامہ بھی بے حد شفقت فرماتے تھے اور کبھی کبھی "زمیندار" کو اپنے غیر مطبوعہ کلام سے بھی مشرف فرماتے رہتے تھے۔

دو ترک فوجی لاہور میں

اب تک علامہ اقبال کی تین کتابیں "اسرار خودی"، "رموزِ بے خودی" اور "پیامِ مشرق" بزبانِ فارسی شائع ہو چکی تھیں اور آپ کے کمالات کے غلغلے سے ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، عراق اور ترکی کی فضائیں بھی لبریز ہو رہی تھیں۔ اتحاد عالم اسلامی کا جذبہ روز افزوں ہو رہا تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے

ترکی کے مردِ بیمار میں از سرِ نو زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ لوزان کے مقام پر عصمت پاشا کی تدبیر نے لارڈ کرزن کی سیاست کو شکست دے کر ترکوں کے لیے آبرومندانہ زندگی کا سر و سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ انھیں دنوں ترکانِ احرار کی طرف سے دو متین و سنجیدہ فوجی ترک افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اُس وقت ترکانِ احرار سلطان وحید الدین معزول کی جگہ خلیفہ عبدالمجید خاں کو خلیفۃ المسلمین نامزد کر چکے تھے۔ میجر حیدر عصمت بے اور لفٹنٹ الیاس آفندی اوائل فروری ۱۹۲۴ء میں وارد لاہور ہوئے۔ یہاں کے مسلمانوں نے اپنے ان بھائیوں کی پزیرائی میں بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ یہ دونوں مجاہد نیڈوز ہوٹل میں ٹھیرے تھے، وہاں بھی ہر وقت مسلمانوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لیکن یہ دونوں علامہ اقبال کا نیاز حاصل کرنے کے لیے بے حد مضطرب تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ علامہ کی طبیعت کل نا ساز تھی، لیکن آج وہ اندرونِ لاہور آپ لوگوں کی رسمِ پزیرائی کی ایک تقریب میں تشریف لارہے ہیں۔ چناں چہ رنگ محل مشن سکول لاہور کے سامنے نوجوانانِ اسلام نے مہمانانِ محترم کی دعوت وضیافت کا انتظام کیا۔ کوچہ چابک سواران میں محرابیں بنی ہوئی تھیں، بینڈ باجا خیر مقدم کا ترانہ بجانے کے لیے مستعد تھا اور علامہ اقبال، مولوی محبوب عالم، مرزا جلال الدین، حاجی شمس الدین، مدیرانِ ''انقلاب'' اور دوسرے ممتاز حضرات نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ یہ دونوں ترک مجاہد حضرت علامہ کے ادب و احترام میں بچھے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اپنے تمام ترک بھائیوں سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ ہم نے حضرت علامہ کی زیارت کی ہے * (اس سے کچھ عرصے بعد ہی مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کو منسوخ اور عبدالمجید خاں کو خارج البلد کر دیا)۔

* ''زمیندار'' ۷ فروری ۱۹۲۴ء۔

کمالی اصلاحات

مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں جو نئی معاشری اصلاحات نافذ کیں، ان کی عمومی روحیت سے تو علامہ اقبال مطمئن تھے لیکن بعض تفصیلات سے شدید اختلاف رکھتے تھے، مثلاً ان کو اس امر سے اتفاق نہ تھا کہ وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے کے برابر ہو: چناں چہ انھوں نے اپنے انگریزی لکچر ''اسلام کے اصول حرکت'' میں اس مسئلے پر خاصی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے کہ علامہ نے ایک دفعہ فرمایا: ''مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی اصلاحات کو محض بلند آہنگی اور ہنگامہ آرائی کے باعث دنیائے اسلام میں غیر مقبول بنا دیا حالاں کہ اگر وہ ان اصطلاحات کے لیے قرآن حکیم سے اصولِ اساسی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو قرآن انھیں ضرور صحت مند بنیادیں مہیا کر دیتا اور قرآن کی بنیاد پر ہونے والی اصلاحات دنیائے اسلام کے لیے بڑی با برکت ثابت ہوتیں۔''

بانگِ درا

مارچ ۱۹۲۴ء میں علامہ کی کتاب ''پیامِ مشرق'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا، یعنی ملک میں شعر فارسی کا چرچا نا کافی ہونے کے باوجود آٹھ نو مہینے کی مدت میں ایک ایڈیشن ختم ہو گیا۔ دوسرے ایڈیشن میں متعدد ایسی نظمیں بھی شامل کی گئیں جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا گیا کہ علامہ اقبال اپنے دوستوں اور مداحوں کے تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے اردو کلام کا مجموعہ بھی مرتّب کر رہے ہیں۔ چناں چہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں ''بانگ درا'' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا* اور ملک میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ ''بانگِ درا'' کی ترتیب پر علامہ نے کوئی چار مہینے صرف کیے۔ بہت سی نظمیں نظری کر دی گئیں، یعنی مجموعے میں شامل کرنے کے قابل نہ سمجھی گئیں۔ بعض نظموں کے اکثر اشعار قلمزد کر کے صرف چند اشعار باقی رکھے گئے اور بعض پرانی نظموں کے بعض مصرعوں اور شعروں کے

* ''زمیندار'' ۷ ستمبر ۱۹۲۴ء۔

الفاظ بدل دیے گئے ، حالاں کہ وہ بچے بچے کی زبان پر چڑھ چکے تھے -

اس وقت تک نواب ذوالفقار علی خاں انجمن حمایت اسلام کے صدر اور علامہ اقبال رحہ اس کے سیکرٹری چلے آتے تھے - لیکن مئی ۱۹۲۴ء میں جب نئے عہدہداروں کا انتخاب ہونے والا تھا ، ان دونوں حضرات نے اپنے عہدوں سے استعفا دے دیا - ۲۱ مئی کو نیا انتخاب ہوا - علامہ اقبال رحہ انجمن کے صدر اور خان صاحب شیخ عبدالعزیز (پریس برانچ) سیکرٹری منتخب ہوئے -*

سلطان ابنِ سعود

۱۹۲۴ء میں جب سلطان ابنِ سعود خاندان شریفی کو حجاز سے بے دخل کر کے خود قابض ہو چکے تھے تو ملک میں حجاز کے مستقبل کے متعلق طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہو رھی تھیں - بعض بزرگ یہ کہ رہے تھے کہ حجاز میں جمہوری حکومت ہونی چاہیے ؛ وہاں شاہ و سلطان کا کوئی کام نہیں - بعض کا خیال تھا کہ حجاز پر تمام عالمِ اسلامی کے نمائندوں کی ایک کمیٹی حکومت کرے اور اس کمیٹی کا صدر رئیسِ مملکت سمجھا جائے ؛ ''زمیندار'' اخبار اور بے شمار اہلِ علم و فکر کی رائے یہ تھی کہ حجاز کے حسنِ انتظام کے لیے سلطان ابنِ سعود پر بھروسا کرنا چاہیے اور ایک مسئلے کو جو سلجھ گیا ہے ، خواہ مخواہ از سرِ نو الجھانا مناسب نہ ہوگا - ''مسلم آؤٹ لک'' (انگریزی روز نامہ) کے ایڈیٹر مسٹر داؤد اپسن نہایت پُر جوش نو مسلم انگریز تھے اور علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے ؛ انھوں نے مسئلۂ حجاز کے متعلق بعض اکابر کی رائیں حاصل کر کے اپنے اخبار میں شائع کیں -

علامہ اقبال کے خیالات

اسی سلسلے میں علامہ اقبال سے بھی انٹرویو کیا : ''مسلم آؤٹ لک'' ایک تجویز پیش کر چکا تھا کہ سابق خلیفۃ المسلمین عبدالمجید خاں کو حاکمِ حجاز بنا دیا جائے تو بہتر ہے کیوں کہ دنیائے اسلام میں ان کی شخصیت کو بہت احترام و اعتماد حاصل ہے -

* ''زمیندار'' - ۲۲ مئی ۱۹۲۴ء -

علامہ اقبال نے فرمایا کہ یہ تجویز میرے نزدیک نامناسب ہے - اگر اس پر زیادہ زور دیا گیا تو دنیائے اسلام میں مزید الجھنیں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے کیوں کہ ابنِ سعود وھابیوں کا نمائندہ ہے اور عبدالمجید خاں سنی دنیا کے دینی پیشوا رہ چکے ہیں ؛ اس تجویز سے مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں کے درمیان کش مکش کا خطرہ ہے -

مزید استفسارات کے جواب میں علامہ نے فرمایا ''میں حجاز کی موجودہ صورتِ حالات سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور سلطان ابنِ سعود پر بدونِ تذبذب اعتماد رکھتا ہوں - سلطان نجد ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطان سے ملے ہیں ، وہ میری اس رائے کے مؤید ہوں گے - امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب ''الاسلام'' میں سلطان نجد کو ایشیا کا بہترین حاکم اور سر زمین نجد کو زوال آمادہ دنیائے اسلام کا صاف ترین اور پاک ترین خطہ بتاتا ہے'' - اس کے بعد آپ نے فرمایا ''ممکن ہے عرب میں ابنِ سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشو و نما پا جائے اور اس کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں - ہمیں اس احساس خودی کا دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے - اگرچہ اس کی تہ میں تجرید و تفرید کی نشو و نما کا بھی اندیشہ ہے لیکن ہمیں کچھ مدت تک اس تفرید کو بھی برداشت کرنا چاہیے - عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں اور سر زمینِ عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک پھول پھل نہیں سکتی'' -

خلیفہ عبدالمجید خاں اور تبلیغ

علامہ اقبال رحہ نے ایک نہایت دلچسپ تجویز پیش کی ؛ آپ نے فرمایا کہ اگر مسلمان سابق خلیفہ عبدالمجید خاں سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ بغرضِ تبلیغِ اسلام ایک وسیع بین الاقوامی تنظیم قائم کریں اور خلیفۂ سابق کو اس تنظیم کا رئیسِ اعلیٰ مقرر کریں ؛ تمام اسلامی دنیا اس تنظیم کو مالی امداد دے ، مبلّغین کی ایک وسیع بین الملّی تبلیغی درس گاہ قائم کی جائے - اسلام کے محاسن کو دنیا پر روشن کرنے کے لیے تبلیغی

لٹریچر تمام زبانوں میں شائع کیا جائے؛ میرے نزدیک خاندان عثمان کے اس آخری خلیفہ کی شخصیت اس تنظیم کی کامیابی کی بہت بڑی ضامن ہوگی۔*

۱۹۲۳ء میں انجمنِ حمایتِ اسلام کا سالانہ اجلاس ۳۰ اکتوبر کو بھاٹی دروازہ اسلامیہ ہائی سکول میں منعقد ہوا جس میں صاحب‌زادہ آفتاب احمد خان، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، سید طفیل احمد اور بعض دوسرے اکابر شریک ہوئے؛ اس میں علامہ اقبال نے اپنے وہ چند اشعار سنائے جن میں پہلا شعر یہ ہے:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آذری

چوں کہ قوم کا مذاق از سر تاپا سیاسی ہو چکا تھا، سیاسی قیادت مسلمانوں پر قابض تھی اس لیے انجمن بے حد کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی اور اس کے سالانہ اجلاس بھی محض بغرضِ ”خانہ پُری“ ہی منعقد ہوتے تھے۔ تحریک خلافت سے قبل کا جوش و خروش مفقود تھا۔ مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کا بیان ہے۔ ایک دفعہ میں کراچی گیا ہوا تھا؛ وہاں جسٹس شادی لال بھی موجود تھے۔ اُن سے باتیں ہوئیں تو کہنے لگے ”مرزا صاحب! میاں شفیع اقبال کو بہت سخت سست کہا کرتے ہیں اور ہر جگہ اُن کے کردار پر حملے کرتے پھرتے ہیں۔

عدالتِ عالیہ کی ججی

یہ بات اقبال کے مستقبل کے لیے بہت مضر ہے۔ اگر وہ میرے ساتھ مل کر کام کریں تو بہت ہی اچھا ہو“۔ جب لاہور واپس آکر میں نے علامہ اقبال سے اس گفتگو کا ذکر کیا تو کہنے لگے ”مرزا صاحب! شادی لال کا اپنا ذاتی مطلب ہے؛ وہ میاں فیملی کا حریف ہے اور بعض مسلمانوں کو ساتھ ملا کر اس خاندان

* ”زمیندار“ (ماخوذ از مسلم آؤٹ لک)، ۳ نومبر ۱۹۲۳ء۔

کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم ان لوگوں کے جھگڑوں میں اُلجھیں؟ ہم شادی لال کا ساتھ نہیں دے سکتے“۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۵ء میں سر شادی لال چیف جج تھے۔ ایک مسلمان جج کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا اور صوبے کی اسلامی انجمنوں، وکیلوں، اخباروں اور عام تعلیم یافتہ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ ”ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی، بیرسٹر ایٹ لاء کو ان کی بے نظیر قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالتِ عالیہ کا جج مقررہ کیا جائے“* تو انھیں سر شادی لال نے علامہ کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ”ہم اقبال رح کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، قانون دان کی حیثیت سے نہیں“؛ چناں چہ علامہ جج نہ ہوسکے اور ان کی جگہ یو۔ پی سے سیّد آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا۔

استفتا بابت علّامہ اقبال

یہ وہ زمانہ تھا جب ترکِ موالات کے بعد ہندوؤں میں شدھی اور سنگھٹن کا جوش و خروش برپا تھا اور مسلمان اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کے ادارات منظم کر رہے تھے۔ پھر سلطان ابنِ سعود کی تطہیرِ حجاز کے غلغلے نے ہندوستان میں مسلمانوں کو دو مذہبی کیمپوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان سخت کش مکش ہو رہی تھی۔ دونوں طرف کے علماء نے تکفیر کا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ علامہ اقبال سلطان ابنِ سعود کی حمایت میں بیان دے چکے تھے اور بدعتی علماء ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے؛ اتنے میں ایک خوش طبع مسلمان کو دل لگی سوجھی۔ اس نے ایک استفتا مرتّب کر کے مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ خطیبِ مسجد وزیر خاں لاہور کو بھیج دیا۔ یہ صاحب اپنے شوقِ تکفیر کے لیے بے حد مشہور تھے؛ چناں چہ متعدد اکابر مسلمین کو کافر بنا چکے تھے۔ اس خوش طبع مسلمان نے اپنا نام ”پیر زادہ محمد صدیق سہارن پوری“ تجویز کیا اور

* ”زمیندار“ ۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء

یہ استفتا لکھا :

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور حامیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے ، آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزا کرے ، علماے کرام اور پیرانِ عظام پر آوازے کسے اور انہیں برے خطابات سے یاد کرے ، ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں ، "امام" اور "چراغِ ہدایت" کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو ۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین ، نشست برخاست اور ہر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا و توجروا ۔ اشعار حسبِ ذیل ہیں :

آفتاب

۱- اے آفتاب ہم کو ضیاے شعور دے — چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو — یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری — آزاد قید اول و آخر ضیا تری
(ترجمہ گایتری منتر)

۲- کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

۳- خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں!

۴- غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

۵- رام کی تعریف میں فرماتے ہیں :

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

(المستفتی پیر زادہ محمد صدیق سہارن پوری)"

فتوےٰ

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسم پروردگار اور یزداں عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں ؛ اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے ۔ علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہینِ موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہینِ بزرگانِ دین فسق لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائلِ اشعارِ مذکور توبہ نہ کرے، اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں ورنہ سخت گناہ گار ہوں گے ۔ ابو محمد دیدار علی الخطیب فی مسجد وزیر خان المرحوم *"

* "زمیندار" ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء ۔

اس فتوے پر ملک بھر میں شور مچ گیا ۔ مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی ۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے " زمیندار " میں اس جاہلانہ فتوے کی چتھاڑ کر دی ۔ خود " زمیندار " نے فتوے پر تبصرہ کیا ۔ ایک گمنام مقالہ نگار (غالباً چودھری محمد حسین ، ایم ۔ اے) نے ایک مدلّل مضمون میں اس فتوے کا جواب دیا یعنی اشعارِ منقولہ کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے ثابت کیا کہ ان سے ہرگز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا ۔ مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا ، کیوں کہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی ، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان ، عاشقِ رسولؐ ، درد مندِ ملّت ، حامیِ دین اسلام تسلیم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے ؟

حضرت میاں شیر محمد اور اقبال

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے معلوم ہوا کہ علماء و مشائخ کے طبقے میں جو اہلِ دل ہیں ، وہ انتہائی پابندیٔ شریعت کے باوجود علامہ اقبال کے پایہ شناس ہیں ۔ لاہور سے چند میل کے فاصلے پر قصبہ شرق پور میں ایک بزرگ میاں شیر محمد رح رہتے تھے (چند سال ہوئے انتقال ہو گیا) ؛ نہایت نیک ، پرہیز گار اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے ۔ احترامِ شریعت پر بے حد مصر تھے اور جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، انہیں ڈاڑھی رکھنے کی سخت تاکید کیا کرتے تھے ۔ علامہ اقبال کو متقی اور پرہیز گار بزرگوں سے ملنے کا ہمیشہ ہی سے شوق تھا ۔ ایک دن وہ میاں شیر محمد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے ۔ میاں صاحب مسجد میں بیٹھے تھے ۔ پوچھا کیسے آئے؟ اقبال نے کہا "میرے لیے خدا سے دعا کیجیے "۔ میاں صاحب نے فرمایا : " تم ڈاڑھی منڈاتے ہو ، میں تمھارے لیے دعا نہیں کر سکتا " ۔ مجلس دم بخود رہ گئی ۔

علامہ اقبال رح یہ سن کر اٹھے اور مسجد سے باہر نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف چلے ۔ اڈا ذرا دور تھا ۔ ادھر حاضرینِ مجلس میں سے ایک شخص نے حضرت میاں صاحب سے پوچھا "آپ نے پہچانا یہ شخص کون تھا ؟" فرمایا " نہیں "۔ وہ کہنے لگا " ڈاکٹر اقبال " ۔ یہ سن کر حضرت میاں صاحب کی عجیب حالت ہوئی ۔ مسجد سے نکل کر ننگے پاؤں اڈے کی طرف دوڑے ۔ علامہ تانگے پر سوار ہو ہی رہے تھے کہ یہ آن پہنچے ۔ بے حد معذرت کی اور کہا کہ میں عام لوگوں کو ڈاڑھی رکھنے کی تاکید کرتا رہتا ہوں ، لیکن میرے نزدیک آپ جیسے شخص پر جس نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان اور عمل کے چراغ روشن کر دیے ہیں ، ڈاڑھی کے معاملے میں سختی کرنا مناسب نہیں ۔ اس کے بعد علامہ کے لیے دعا کی اور علامہ مسرور و مطمئن واپس لاہور آئے ۔

نیشنل لبرل لیگ اور چنتامنی کانفرنس

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک کا زمانہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے فسادات کا زمانہ تھا ۔ اس دوران میں مختلف قوموں کے لیڈروں نے فسادات کو روکنے اور امن و اتحاد قائم کرنے کی غرض سے کانفرنسیں بھی کیں ۔ اسی غرض سے بعض مخصوص اور ہنگامی جماعتیں بھی قائم ہوئیں ۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا ۔ لاہور میں " نیشنل لبرل لیگ "، کے نام سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترک انجمن قائم کی گئی ۔ علامہ اقبال بھی اس میں شامل ہوئے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مستعفی ہو گئے ۔ اس کے بعد مسٹر چنتامنی نے بھی اسی مقصد سے بمبئی میں ایک نیشنلسٹ کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے داعیوں میں نام درج کرنے کے لیے علامہ اقبال سے اجازت طلب کی ۔ علامہ نے اجازت دے دی ۔ اس پر بعض احباب نے سوال کیا کہ نیشنل لبرل لیگ اور چنتامنی کی کانفرنس کے متعلق آپ کے رویّے کی علّت کیا ہے ؟

علامہ اقبال نے ایک بیان شائع کیا جس میں بتایا کہ:

”پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کے باعث جو شرم ناک حالات پیدا ہو رہے ہیں، اور صوبے کی فضا جیسی مکدر ہو رہی ہے، اسے کوئی مخلص انسان اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دور کر کے ملک میں بھائیوں کی طرح سے رہیں۔ اور بات بات پر ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں۔ میرے بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کی مختلف اقوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ایک متحدہ کوشش ضروری ہے جس میں ہر جماعت کے افراد شامل ہوں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پیش نظر فی الحال کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے، تاہم اخلاقی اعتبار سے اس میں شرکت کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ چناں چہ میں ان کی اس کوشش میں شریک ہوا لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ گوہرِ مقصود یہاں بھی مفقود ہے اور ملک میں ابھی حصولِ مقصد کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس بنا پر میں نے اس جماعت سے استعفا دے دیا۔

اس کے بعد چنتامنی کی نیشنلسٹ کانفرنس کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میری مراد کسی سیاسی جماعت کی موافقت یا مخالفت نہ تھی۔ نہ مسٹر چنتامنی کے تار میں ایسے الفاظ تھے جن سے معلوم ہوتا کہ ان کا جلسہ کسی سیاسی جماعت کی مخالفت کے لیے ہے: اب معلوم ہوا کہ ان کے جلسے کا مقصود بالخاصہ ”سوارا جی جماعت“ کی مخالفت تھا۔

میں اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ میں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علحدہ رہا ہوں، البتہ میری خواہش یہ

رہی ہے اور ہے کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں کہ موجودہ فضا ملک کے لیے بالبداہت باعثِ ننگ ہے اور مختلف اقوام کی اخلاق اور معاشری زندگی کے لیے نہایت مضرّت رساں ہے۔ کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں؛ ہاں اہل ہند کے باہمی تعلقات کی درستی میں ہر مخلص شخص کے ساتھ ہوں۔“*

اس بیان کے اقتباسات درج کرنے سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ علامہ اقبال رح ہندوستانی سیاسیات میں اپنا مخصوص نقطۂ نگاہ رکھنے کے باوجود ملک کی مختلف جماعتوں کے درمیان صلح و امن کے بے حد خواہش مند تھے اور اس مقصد کے حصول کی کوشش میں بلا امتیاز مذہب و سیاست ہر شخص کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ رہتے تھے لیکن ان کو ہمیشہ یہ ہی تجربہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امن و مصالحت کی کوششوں کے پردے میں ہر لیڈر اپنا یا اپنی قوم ہی کا آلو سیدھا کرنا چاہتا ہے، محض نفسِ مصالحت کے لیے کسی کے دل میں درد مندانہ خواہش موجود نہیں۔

کونسل کے انتخاب میں کامیابی

اپریل ۱۹۲۶ء کے اواخر میں علامہ اقبال رح نے احباب کے اصرار پر حامی بھر لی کہ وہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے آئندہ انتخاب میں بطور امید وار کھڑے ہوں گے؛ چناں چہ قرار پایا کہ آپ شہر لاہور ہی کے مسلم حلقے کی طرف سے کھڑے ہوں۔ اگرچہ اخبارات نے بہم یہ لکھا کہ علامہ کی شخصیت اس قدر جلیل القدر ہے کہ ان کو بلا مقابلہ کونسل کا ممبر ہو جانا چاہیے † لیکن لاہور میں جاہ پرستی اور برادری نوازی کا مرض عام ہونے کی وجہ سے دو تین حضرات مقابلے میں کھڑے ہوگئے۔ بہر کیف افہام و تفہیم کے بعد دو امید واروں نے تو اپنے نام واپس لے لیے لیکن خان بہادر ملک محمد دین آخر تک ڈٹے رہے؛ چناں چہ علامہ اقبال رح کو

* روز نامہ ”زمیندار“ مورخہ ۹ اپریل ۱۹۲۶ء۔
† ”زمیندار“ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۲۶ء۔

انتخاب کی جنگ لڑنی پڑی - یہ عجیب جوش و خروش کے دن تھے ؛ لاہور
کے ہر محلے میں علامہ کے نیاز مند اور مداح جلسے منعقد کر رہے تھے ؛
شہر کی تمام برادریاں علامہ کی حمایت میں پمفلٹ شائع کر رہی تھیں ۔ جو
لوگ ملک محمد دین کے لیے کام کر رہے تھے ، ان میں بھی اکثر ایسے تھے
جن سے علامہ کی جلالتِ قدر اور عظمتِ علمی ہرگز پوشیدہ نہ تھی،
مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولوی محرم علی چشتی لیکن دھڑے بندی
کا برا ہو جس کی وجہ سے یہ صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی ۔ علامہ کے
نیاز مندوں کی کوشش یہ تھی کہ حتی الامکان علامہ کا پیسہ خرچ نہ ہو ؛
چناں چہ علامہ معمولی سی رقم صرف کر کے اپنے حریف کے مقابلے میں تین
ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کام یاب ہوئے اور ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو
"ایم ، ایل ، سی" بن گئے ۔ *

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آ گیا ۔ انتخاب میں علامہ کی کامیابی پورے
صوبے کے لیے باعثِ مسرت تھی ؛ چناں چہ بعض مقامات سے ان کو دعوتیں
موصول ہو رہی تھیں کہ تشریف لائیں ۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر تصدق حسین
خالد فیروز پور میں ای ۔ اے ۔ سی تھے اور علامہ سے گہری عقیدت
رکھتے تھے ؛ ان کی تحریک پر معززینِ فیروز پور نے علامہ کو "استقبالیہ" دینے
کا فیصلہ کیا اور کہلا بھیجا کہ یہاں آپ کا جلوس نکالا جائے گا ، اس کے
بعد تیسرے پہر آپ کو ایک مشاعرے کی صدارت کرنی ہوگی اور شام کو
گارڈن پارٹی دی جائے گی ۔ علامہ نے فرمایا میں جلوس میں ہرگز شامل نہ
ہوں گا ، یہ میرے ذوق کے خلاف ہے ؛ مشاعرے کی صدارت میری جگہ
سالک صاحب کریں گے البتہ گارڈن پارٹی میں شریک ہو جاؤں گا ۔

چناں چہ یہ ہی ہوا ؛ جلوس کے انتظامات منسوخ کر دئے گئے ؛ راقم
کی صدارت میں مشاعرہ ہوا جس میں پنڈت دتا تریہ کیفی ، مولانا تاجور ،
میلا رام وفا ، حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، منوہر سہائے انور وغیرہم

---

* نیرنگ خیال اقبال ۴۰ - ملفوظات اقبال ۹۵ -

شریک ہوئے ۔ گارڈن پارٹی میں علامہ شامل ہوئے ۔ حاضرین کے بے حد
اصرار پر تقریر کی لیکن انگریزی میں ۔ جب کلام سنانے کی فرمائش ہوئی
تو انکار کر دیا اور کہا شعر سننے سنانے کی چیز نہیں ، تنہائی میں بیٹھ کر
پڑھنے کی چیز ہے ۔ معززین فیروز پور نے راقم سے کہا کہ آپ سفارش
کر دیجیے ۔ میں نے منت سماجت کی تو فارسی کے یہ دو شعر سنائے :

دریں صحرا گزار افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نالہ ہائے ساربانے را
اگر یک یوسف از زندان فرعونے بروں آید
بغارت می تواں بردن متاعِ کاروانے را

تیسری فصل

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک

یوں تو اس سے قبل بھی نظریاتی اعتبار سے علامہ اقبال رح مسلمانانِ ہند کی سیاسیات میں خاصا مؤثر حصہ لے رہے تھے، لیکن ۱۹۲۶ء کے بعد تو آپ عملی سیاسیات کے خار زار میں بھی گامزن ہو گئے۔ ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ہندوستان کی آئندہ اصلاحات کے متعلق حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ایک شاہی کمیشن کا اعلان ہوا جس کے صدر سر جان سائمن کے نام پر اس کو "سائمن کمیشن" کہتے تھے۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر اہلِ ہند اپنے ملک کے لیے ایک آئین متحدہ طور پر تیار کر لیں تو ہم اس کو قبول کر کے نافذ کر دیں گے۔ اس پر کانگرس نے پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے "نہرو رپورٹ" مرتب کر لی۔گویا اپنی طرف سے ایک متحدہ آئین پیش کر دیا۔ لیکن چند ہی روز میں مسلم لیگی حلقوں نے تو درکنار خود مرکزی خلافت کمیٹی اور جمعیت العلمائے ہند نے جو کئی سال سے کانگرس کا دُم چھلا بنی ہوئی تھیں، نہرو رپورٹ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سے قبل گاندھی جی نے دہلی میں مسلمان رہنماؤں کو گفتگو کی دعوت دی، علامہ اقبال بھی تشریف لے گئے۔ جب گاندھی جی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ اگر مسلمانانِ ہند متفقہ طور پر اپنے مطالبات معین کر دیں تو کانگرس ان کو منظور کر لے گی۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ یہ تو آپ نے بالکل لارڈ برکن ہیڈ کی سی بات کی۔ اس پر گاندھی جی بے حد سٹپٹائے اور ان سے کوئی جواب بن نہ آیا۔

مسلمان اور مقاطعہ

کانگرس نے سائمن کمیشن کو بائی کاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور عذر یہ پیش کیا کہ اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی ممبر شامل نہیں کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ملا کہ ہندوستانیوں میں فرقہ وار اختلاف اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے نمائندوں کا کمیشن میں شامل کرنا محال ہے۔ اس موقع پر نواب ذوالفقار علی خان، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور مولانا محمد علی امیرِ جماعتِ احمدیہ لاہور نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا جس میں یہ لکھا کہ "رایل کمیشن میں ہندوستانی ممبروں کے مقرر نہ کرنے کے جو وجوہ لارڈ برکن ہیڈ نے بیان کیے ہیں، فرقہوار اختلافات ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ ہم ان وجوہ کو بادلِ ناخواستہ قبول کر لیں۔ ہندو مسلمانوں کے مشترکہ پروگرام سے پہلے فرقہوار اختلافات کا تصفیہ ہونا ضروری ہے۔ ہم اپنے ہم وطنوں اور مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ کمیشن کو بائی کاٹ کرنے سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔" *

"انقلاب" مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۲۷ء میں کمشن کے متعلق علامہ اقبال کا ایک انٹرویو شائع ہو چکا تھا جس میں انہوں نے کمیشن کی ترکیب پر اظہارِ افسوس کیا لیکن اس کا ذمہ‌دار ہندوستانیوں کے اختلافات کو ٹھیرایا۔ کمیشن کے بائی کاٹ کی مخالفت کی اور اس امر پر زور دیا کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیۂ حقوق نہ ہو گا، ملک ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکے گا۔ اس زمانے میں "انقلاب" نہایت زور شور سے تصفیۂ حقوق پرپُرزور مقالات لکھ رہا تھا اور علامہ اقبال کی اعانت و سرپرستی اس کو بوجہِ اَتم حاصل تھی۔ "زمیندار" نے کانگرس کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور اس میں آئے دن "انقلاب" کے مدیروں اور خود علامہ اقبال کے خلاف زہریلے مقالات چھپ رہے تھے۔

* "پیسہ اخبار"، ۱۰ دسمبر ۱۹۲۷ء

مولانا گرامی کاانتقال

۱۹۲۷ء میں ۳۰ مئی کو علامہ اقبال کے مخلص دوست اور فارسی کے شیوا بیان شاعر مولانا غلام قادر گرامی (شاعرِ خاص حضورِ نظام) کا انتقال ہو گیا۔ علامہ کو ان کے انتقال سے بےحد صدمہ ہوا۔ انہوں نے اس حادثے پر ذیل کے چند اشعار لکھے جو ''انقلاب'' کے صفحۂ اول پر شائع ہوئے:

آہ مولانا گرامی از جہان بربست رخت — آنکہ زد فکرِ بلندش آسمان را پشت پائے
معنیِ مستورِ او در لفظِ رنگینش نگر — مثلِ حورے بےحجاب اندر بہشتے دلکشائے
از نوائے جانفزائے او عجم را زندگی — جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمائے
یاد ایامے کہ با او گفتگو ہا داشتم — اے خوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنائے
برمزارش پست تر کن پردہ ہائے ساز را — تا نہ گردد خواب او آشفتہ ازشور نوائے

سیاسیات کا رنگ

ملکی سیاسیات کا رنگ یہ تھا کہ ایک طرف مختلف مقامات پر ہندو اور مسلم عوام کے درمیان ذبیحۂ گاؤ، مساجد کے سامنے باجا بجانے اور جلوس نکالنے اور شُدھی اور تبلیغ کے سلسلے میں فسادات ہو رہے تھے اور دوسری طرف دونوں قوموں کے رہنما دستوری مسائل میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ ہندو اور ان کے نیشنلسٹ مسلمان ساتھی مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور مسلمان لیڈر جداگانہ انتخاب پر زور دے رہے تھے۔ ہندو لیڈر مسلمانوں کو وہ زائد از استحقاق نشستیں دینے پر آمادہ نہ تھے جو میثاق لکھنؤ میں منظور کی گئی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ بعض مسلم لیگی قائدین بھی جن میں مسٹر محمد علی جناح پیش پیش تھے، مخلوط انتخاب کو قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ جب مارچ ۲۷ء میں دہلی کے مقام پر زیر صدارت مسٹر جناح مسلم ارکان اسمبلی اور دوسرے مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں یہ تجاویز منظور کی گئیں کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک مستقل صوبہ قرار دیا جائے، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات دی جائیں،

پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلم اکثریت محفوظ و مسلم قراردی جائے، مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت دی جائے۔ اگر یہ تجاویز قبول کر لی جائیں تو مسلمان نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے۔ مئی ۲۷ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز کو منظور کر لیا اور دسمبر ۲۷ء میں ڈاکٹر انصاری کے زیر صدارت کانگرس کا جو سالانہ اجلاس ہوا، اس میں ان تجاویز کو منظور کر لیا گیا۔ مسلم لیگ نے بھی ۳۰ دسمبر کے اجلاس میں ان تجویزوں کی تصدیق کر دی۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ان تجاویز کے سر گرم حامی تھے لیکن سر محمد شفیع اور ان کے رفقاء نے مسلم لیگ کی اس ''مخلوطی'' پالیسی سے اختلاف کیا اور لیگ دو ٹکڑوں میں بٹ گئی؛ ایک کے صدر مسٹر محمد علی جناح اور سیکرٹری ڈاکٹر کچلو قرار پائے اور دوسرے کے صدر سر محمد شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال مقرر ہوئے۔

علامہ بھی قابو میں نہ آئے

مولانا محمد علی، سر محمد شفیع سے تو مایوس تھے، لیکن علامہ اقبال کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ انہیں اپنا ہم خیال بنا کر تجاویزِ دہلی کی حمایت پر آمادہ کر سکیں گے؛ چناں چہ مولانا لاہور آئے اور مولانا عبدالقادر قصوری کی وساطت سے علامہ پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ مقصود یہ تھا کہ علامہ بھی سائمن کمیشن کے بائی کاٹ کے حامی بن جائیں۔ علامہ نے فرمایا کہ اگر کانگرس اور ہندو لیڈر مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر کے ان سے سمجھوتا کر لیں تو میں کمیشن سے تعاون نہیں کروں گا بلکہ سر محمد شفیع کو بھی مقاطعے پر رضامند کر لوں گا۔ مولانا حسرت موہانی بھی علامہ کے نقطۂ نگاہ کے حامی تھے لیکن چوں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مطالبات کی تائید پر آمادہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے مولانا محمد علی، علامہ کو رضا مند نہ کر سکے۔

گول میز کانفرنس

کانگرس نے ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرکے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ مرتّب کرنے کی کوشش کی ۔ مسٹر جناح والی مسلم لیگ کو دستور کے اس خاکے کی بعض دفعات سے اختلاف ہوا ۔ اس پر نہرو کمیٹی مقرر کی گئی جس کی رپورٹ کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے ۔ اس موقع پر مزید تفصیلات کے بیان کی ضرورت نہیں ۔ مختصر یہ کہ ملک بھر کی سیاسی جماعتوں نے اپنی کانفرنسیں منعقد کرکے سیاسیاتِ ہند پر اپنے نقطہ ہائے نگاہ پیش کیے ۔ کانگرس نے اگرچہ بظاہر سائمن کمیشن سے مقاطعہ کیا لیکن اندر ہی اندر اس کو نہرو رپورٹ کی کاپی بھیج کر لکھ دیا کہ ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق اہلِ ہند کے زیادہ سے زیادہ اہل الرائے طبقوں کا اتفاق اسی دستاویز پر ہے ۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں سائمن کمیشن نے مختلف نقطۂ نگاہ کے نمائندوں کی شہادتیں لے کر اپنا کام مکمل کر دیا اور اکتوبر ۲۹ء میں لارڈ ارون وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے آئندہ آئین کی ترتیب کے لیے برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے والی ہے ۔

سیکرٹری شپ سے استعفا

سر محمد شفیع اور دوسرے حضرات کے ساتھ علامہ اقبال کی شرکتِ کار حقیقت میں ملک و قوم کی مخصوص سیاسی کیفیت کا نتیجہ تھی ، ورنہ فی الحقیقت علامہ کی طبیعت کا آدمی رجعت پسند طبقوں کے ساتھ مل کر زیادہ مدت تک کام نہ کر سکتا تھا ۔ شفیع اقبال لیگ کی طرف سے جو یادداشت سائمن کمیشن کو بھیجی گئی ، اس کا مسودہ مرتّب کرنے کے لیے سر محمد شفیع کے مکان پر جو اجلاس مئی ۲۸ء میں ہوا ، اس میں علامہ نے بعض اہم امور کے متعلق جن میں صوبائی خود اختیاری کا مسئلہ بھی شامل تھا ، اپنا اختلاف ظاہر کر دیا ۔ یہ مسودہ عارضی سا تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ لیگ کے دوسرے معزز ممبروں کی رائیں بھی حاصل کر لی جائیں ۔ جب کچھ عرصے میں آراء موصول ہو گئیں تو ان کے پیش نظر ایک

آخری مسودہ تیار کر لیا گیا ۔ اسی دوران میں علامہ اقبال کو دردِ گردہ نے آن دبوچا ، یہ علامہ کی پرانی بیماری تھی ۔

دردِ گردہ کا دورہ

اس سے قبل ایک دفعہ ۱۹۱۷ء میں بھی وہ اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے ، اب کے تکلیف کسی قدر زیادہ ہوئی ۔ لالہ لاجپت رائے علامہ سے ملنے آئے تو ان کو مشورہ دیا کہ آپ حکیم نابینا صاحب دہلوی (حکیم عبدالوہاب انصاری برادرِ ڈاکٹر انصاری) سے علاج کرائیے ؛ چناں چہ وہ دہلی تشریف لے گئے اور لیگ کی یاد داشت کے آخری مسودے کی ترتیب میں شریک نہ ہو سکے ۔ جب دہلی سے واپس آئے تو اخباروں میں اس یاد داشت کا ملخّص شائع ہوا جس کے مطالعے کے بعد علامہ بہت بیزار ہوئے ؛ چناں چہ انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں مندرجہ بالا واقعات درج کرنے کے بعد لکھا :

لیگ کی یاد داشت

"لیگ نے مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ ایک وحدتی صوبائی نظام کی تجویز پیش کر دی ہے جس کے رو سے قانون ، امن اور عدل کے محکمے براہ راست گورنر کو سونپ دیے جائیں گے ، یعنی مجوّزہ نظام در پردہ دو عملی (ڈا یار کی) پر مبنی ہوگا جو کسی اعتبار سے آئینی ترقی کا مترادف نہ ہوگا ۔"

"چوں کہ میں ابھی تک اس رائے پر قائم ہوں جو میں نے مسودہ مرتّب کرنے والی مجلس کے پہلے اجلاس میں پیش کی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ پیش کرنا چاہیے (اور میرے خیال میں تمام مسلمانانِ پنجاب کی یہی رائے ہے) ، مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری نہ رہنا چاہیے ؛ از راہ کرم میرا استعفا منظور فرمایا جائے ۔"*

* "حرفِ اقبال" ، 'خطبات و تقاریر' صفحہ ۱۷۹ ۔

اس استعفا سے سر محمد شفیع بے حد پریشان ہوئے۔ انھوں نے فی الفور مسلم لیگ کی یاداشت میں ترمیم کی اور صوبائی خود اختیاری کے مطالبے کو اس میں شامل کرنا پڑا؛ چناں چہ اس کے بعد علامہ نے بھی یاداشت پر دستخط کردیے (اس یاداشت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۹، ''اقبال کا سیاسی کار نامہ'')۔ ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو مسلم لیگ کا ایک وفد جس میں علامہ اقبال بھی شامل تھے، سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دینے کے لیے پیش ہوا۔ سر محمد شفیع اس وفد کے رئیس تھے لیکن سوالات کا جواب دینے میں علامہ بھی شریک تھے؛ چناں چہ سائمن کمیشن نے بہت سے معاملات میں وفد کے نقطۂ نگاہ کی تائید کی۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

۲۹-۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ ہندوستانی سیاسیات کا سب سے بڑا مبحث بنی رہی؛ کانگرس اور ہندو سبھا اس کے کلیۃً حامی تھے لیکن مسلمانوں میں تین گروہ پیدا ہو گئے تھے؛ ایک گروہ اس رپورٹ کا حامی تھا، دوسرا جس کے قائد مسٹر جناح تھے، اس میں کچھ ترمیمات کرانے کا خواہش مند تھا اور تیسرا گروہ کلیۃً اس کا مخالف تھا کیوں کہ اس میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم نہ کی گئی تھی اور ان کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا گیا تھا؛ اس گروہ کے لیڈر سر محمد شفیع اور علامہ اقبال تھے۔ مسٹر جناح کی طرف سے نہرو رپورٹ میں معمولی سی ترمیمات کے لیے جو کوششیں کی گئیں، وہ سب ناکام رہیں۔ چناں چہ علامہ اقبال اور بعض دوسرے بزرگوں کی تحریک سے جنوری ۱۹۲۹ء میں بمقام دھلی ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی گئی جس میں مجلس مرکزیہ خلافت کی طرف سے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور دوسرے اکابر خلافت؛ جمعیۃ العلماء کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید اور دوسرے جلیل القدر علماء؛ مسلم لیگ کی طرف سے علامہ اقبال، سر ابراہیم رحمت اللہ، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر اور دوسرے اکابر اور ہندوستان بھر کی کونسلوں اور اسمبلیوں کے منتخب شدہ ممبر شریک ہوئے۔

سر آغا خاں اس کانفرنس کے صدر تھے۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کے تمام سیاسی مطالبات کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی جس کا چرچا ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہوا اور بعد میں مسٹر محمد علی جناح نے بھی اپنے چودہ نکات اسی قرار داد کے اصول پر مرتب کیے اور دونوں مسلم لیگیں دوبارہ ایک ہو گئیں۔ سیاسیاتِ ہند کی اس طویل بحث میں ہم نے اس مسئلے کو مؤخر کر دیا ہے کہ علامہ اقبال نے پنجاب کی مجلسِ قانون ساز میں کیا کام کیے۔ اگرچہ علامہ کا یقین تھا کہ ان کونسلوں میں کوئی مؤثر قومی خدمت انجام دینا بے حد دشوار ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے بعض مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار پوری قوت اور سرگرمی سے کیا۔

علامہ اقبال اور سپیکر شپ

پنجاب کونسل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اپنی اکثرت کی وجہ سے برسر اقتدار تھی۔ سر فضل حسین کے صاحب‌زادے میاں عظیم حسین نے اپنے والد محترم کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:

"سر فضل حسین نے یہ تجویز کی کہ کونسل کے سپیکر (صدر) چودھری شہاب الدین کی میعادِ صدارت ختم ہونے کے بعد یونینسٹ پارٹی علامہ اقبال کو صدر منتخب کر لے لیکن چوں کہ علامہ نے پارٹی کی پالیسی پر تنقید کر کے اور اخباروں میں اس کے خلاف لکھ کر اس کی ہم‌دردی کھو دی تھی اس لیے یونینسٹ پارٹی کی اکثریت نے ان کو کونسل کا صدر منتخب کرنے سے انکار کر دیا۔"

مالیۂ اراضی پر علامہ کے خیالات

۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو علامہ اقبال نے مالیہ اراضی کے مسئلے پر کونسل میں ایک تقریر کی جس میں آپ نے فرمایا کہ مالیہ وصول کرنے کا موجودہ طریقہ سراسر غیر منصفانہ ہے۔ حکومت مالیہ وصول کرنا اس بنا پر اپنا حق سمجھتی ہے کہ وہ زمین کی مالک ہے حالاں کہ یہ نظریہ بالکل فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس

کے بعد علامہ نے بعض یورپی مصنفین کے نظریات کے حوالے دیے اور ثابت کیا کہ تاریخِ ہند کے کسی دور میں بھی مملکت نے زمین پر اپنے مالکانہ حقوق کا دعویٰ نہیں کیا ۔ لارڈ کرزن کے زمانے میں یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا لیکن محصول کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ اس نظریے کی کوئی بنیاد نہیں ۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرمایا کہ انکم ٹیکس محصول ادا کرنے والے کی استطاعت کے مطابق کم اور زیادہ وصول کیا جاتا ہے اور جن لوگوں کی آمدنی ایک خاص حد سے کم ہو، ان سے ٹیکس لیا ہی نہیں جاتا لیکن مالیے کی یہ کیفیت ہے کہ:

> اگر کوئی شخص زمیندار ہو تو خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا ، اس کو لازماً مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص زمین کے سوا کسی اور ذریعے سے دو ہزار روپے سالانہ سے کم آمدنی حاصل کرے تو آپ اس پر ٹیکس عائد نہیں کرتے ۔

علامہ اقبال نے تجویز پیش کی کہ جس شخص کے پاس پانچ بیگھے سے زیادہ زمین نہ ہو اور جس میں آب‌پاشی نہ ہو سکتی ہو اور جس کی پیداوار معین مقدار میں ہوتی ہو ، اس سے کوئی مالیہ نہ لیا جائے ۔

حکومت پنجاب نے منٹگمری کی نیلی بار میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ اراضی زیادہ تر سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کیا تھا ۔ علامہ نے تحریک پیش کی کہ اس اراضی کا نصف حصہ مزارعین کے لیے مخصوص کیا جائے ۔

مذہبی توہین کے خلاف قانون

پنجاب میں مذہبی پیشواؤں کے خلاف توہین آمیز لٹریچر شائع کرنے والی ایک جماعت ہمیشہ قوموں کے درمیان تکدّر اور کش مکش پیدا کرتی رہتی تھی ۔ علامہ نے تجویز پیش کی کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی جائے کہ ان ذلیل حملوں کے انسداد کے لیے ایک قانون نافذ کیا جائے ؛ چناں چہ ۱۹۲۷ء میں یہ قانون نافذ ہو گیا ۔

۱۹ جولائی ۲۷ء کے اجلاس میں سردار اجل سنگھ نے تجویز پیش کی کہ آئندہ سرکاری ملازمت کے عہدوں پر کھلے مقابلے کے بعد تقررات ہوا کریں ۔ علامہ نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا ''کھلا مقابلہ بعض بے انصافیوں کا موجب ہوگا کیوں کہ قومیت پرستی کے صرف دعوے ہی دعوے ہیں ، حقیقت میں فرقہ پرستی زوروں پر ہے ، اس لیے مقابلہ ، نامزدگی اور انتخاب کا ملا جلا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تا کہ تمام فرقوں کو سرکاری ملازمت کا یکساں موقع مل سکے ۔

دوسری تجویزیں اور تقریریں

۱۹۲۷-۱۹۲۸ء کے بجٹ پر علامہ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے دو تجویزیں پیش کیں ؛ ایک یہ تھی کہ دیہات میں صفائی اور حفظانِ صحت کا بہتر انتظام کیا جائے اور ایک رقم خالص عورتوں کی طبی امداد کے لیے مخصوص کی جائے ؛ دوسری تجویز یہ تھی کہ جس حالت میں حکومت ہند نے ۸۶ لاکھ روپے کی رقم صوبے کو دینے کا وعدہ کیا ہے ، حکومت پنجاب کو چاہیے کہ مالیے میں تخفیف کرے اور اسے انکم ٹیکس کی طرح تدریجی قابلیت ادائی کے مطابق عائد کرے ۔

اس کے علاوہ آپ نے لازمی ابتدائی تعلیم پر بے حد زور دیا اور فرمایا کہ صرف چند مدرسوں میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دینے سے مقصد پورا نہیں ہوتا بلکہ پورے صوبے میں یہ قاعدہ نافذ کرنا چاہیے اور اس پر سختی سے عمل کرانا چاہیے ۔

۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو علامہ نے بجٹ پر سیر حاصل تبصرہ کیا ؛ چوں کہ بجٹ خسارے کا تھا اس لیے حکومت ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے قرض لینے کی خواہاں تھی ۔ علامہ نے اس کی مخالفت کی اور صوبے کی مالی حالت کو بہتر بنانے کی بعض عملی تجاویز پیش کیں ۔ مثلاً مرکزی حکومت سے کہا جائے کہ وہ انکم ٹیکس کو صوبائی محاصل میں شامل قرار دے ، محصول فوتی (ڈیتھ ڈیوٹی) ان لوگوں سے وصول کیا جائے جن کو بیس

تیس ہزار کی جائداد ترکہ میں حاصل ہو ، بڑے سرکاری افسروں کی تنخواہیں کم کی جائیں اور مشینری سستی منڈیوں سے خریدی جائے ۔

۷ مارچ ۳۰ء کو بھی علامہ نے بجٹ سیشن میں ایک جامع اور دل چسپ تقریر کی ، جس میں آمدنی کو بڑھانے اور مصارف کو کم کرنے کے لیے ضروری تجاویز پیش کیں ، صنعتی ترقی پر بے حد زور دیا ، تعلیم کے سلسلے میں جو مصارف کیے گئے ، ان پر نکتہ چینی کی اور اس سلسلے میں نہایت معلومات افزا خیالات ظاہر کیے ۔

اس کے علاوہ علامہ اقبال رح نے تعلیم کی عام اشاعت ، شراب کے انسداد ، غریب طبقے کی فلاح و بہبود ، شمشیر کی آزادی ، یونانی اور آیورویدک طریق علاج کی ہمت افزائی اور تعمیر قوم کے دوسرے شعبوں کے متعلق نہایت سلجھے ہوئے انداز سے اپنے خیالات کو پیش کیا ۔ اگرچہ حکومت وقت ان کے بعض مشوروں پر عمل کرنے کی اہلیت اپنے آپ میں نہ پاتی تھی لیکن تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اور غریبوں میں بھی علامہ اقبال رح کی ان تقریروں کا بہت چرچا ہوتا تھا (ملاحظہ ہو خطبات و تقاریر'' حرف اقبال '' اور '' اقبال کا سیاسی کارنامہ '') ۔

تعزیری چوکی اٹھوائی

نومبر ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے ، رنگ محل (لاہور) میں ایک ہندو مسمی نانک چند قتل ہو گیا ، حکومت نے اس علاقے میں تعزیری چوکی بٹھا دی جس کا خرچ اہل محلہ پر ڈال دیا ۔ علامہ نے حکومت پنجاب کو اس کے متعلق ایک سوال بھیجا تاکہ کونسل میں اس کا جواب دیا جائے ، اس کے علاوہ انہوں نے بعض حکام سے ملاقات بھی کی ۔ ۹ نومبر کی شام کو لاہور کے کپتان پولیس نے علامہ کو اطلاع دی کہ آپ کے ارشاد کے مطابق حکومت نے رنگ محل سے تعزیری چوکی اٹھا لی ہے، اس پر علامہ نے کونسل کے سیکرٹری کو لکھ کر اپنا سوال منسوخ کرا دیا ۔ *

* "پیسہ اخبار'' ۱۰ نومبر ۲۷ء ۔

کتابِ امدادِ باہمی

مارچ ہی کا ذکر ہے کہ پنجاب کونسل میں محکمۂ امداد باہمی کی رقم زیر بحث تھی کہ اتنے میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے اس بنا پر کاٹ تجویز کی کہ حکومت کے شعبۂ اطلاعات نے '' امداد باہمی '' پر ایک کتاب شائع کی ہے جس کے بعض مضامین پر ازالۂ حیثیتِ عرفی اور دفعہ ۱۵۳ کے ماتحت مقدمہ چلایا جا سکتا ہے ، حکومت کو اپنی سر پرستی میں ایسی کتاب شائع نہ کرنی چاہیے تھی ۔

اس پر علامہ اقبال رح اٹھے ، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی بے خبری کا بے حد مضحکہ اڑایا اور کونسل کو بتایا کہ کتاب '' امداد باہمی'' شعبۂ اطلاعات پنجاب نے شائع نہیں کی بلکہ ایک پرائیویٹ کارخانہ دار مولوی ممتاز علی صاحب مالک دارالاشاعت پنجاب نے شائع کی ہے اور عبدالمجید سالک ایڈیٹر '' زمیندار '' اس کتاب کے مصنف ہیں ۔

اس وقت '' زمیندار '' سے سالک کا تعلق منقطع ہو چکا تھا لیکن جب علامہ اقبال رح نے ان کو کونسل کی اس بحث کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے اخبار میں لکھا کہ اس کتاب میں ساہوکاروں کے ظلم اور کاشت کاروں کی مظلومی کے متعلق وہی باتیں لکھی ہیں جو مسٹر کیلورٹ ، مسٹر ڈارلنگ اور مسٹر تھار برن اس سے پیش تر واشگاف طور پر لکھ چکے ہیں ۔ اگر ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے تھے تو میں بھی حاضر ہوں ۔ *

مدراس میں علامہ کے لیکچر

دسمبر ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے ، علامہ اقبال مدراس کے علمی حلقوں کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور آپ نے اعلیٰ درجے کے فلسفیوں اور عالی پایہ اہلِ علم کے مجمع میں اپنے وہ چھ لیکچر بزبان انگریزی ارشاد فرمائے جو وہ دو تین سال سے لکھ رہے تھے ۔ † علامہ دسمبر کے آخری ایام میں مدراس پہنچے ، تین دن وہاں قیام رہا ؛ مدراس کی انجمن ترقی اردو ، ہندی پرچارنی

* پیسہ اخبار ، ۱۷ مارچ ۲۷ء

† یہ چھ لکچر Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے ۔

سبھا اور دیگر ادبی و اسلامی اداروں نے سپاس نامے پیش کیے ۔ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو آپ بنگلور پہنچے تو بے شمار لوگوں نے آپ کا پُرجوش استقبال کیا ۔ مسلم لائبریری کی طرف سے زیرِ صدارت سر مرزا اسماعیل وزیر اعظم ریاست میسور ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا جس میں علامہ کو سپاس نامہ پیش کیا گیا ۔ اس کے بعد ایک اور جلسہ ڈاکٹر سبرائین وزیر تعلیم میسور کی صدارت میں ہوا ۔ اس اجتماع میں بھی بنگلور کے تمام معززین اور اکابرِ علم موجود تھے ۔

میسور

مہاراجہ صاحب میسور کی طرف سے علامہ کو دعوت موصول ہو چکی تھی ؛ چناں چہ آپ ۱۰ جنوری ۲۹ء کو میسور تشریف لے گئے ۔ میسور یونیورسٹی نے علامہ سے ایک بڑے علمی مجمع میں لیکچر کرایا ، پھر ٹاؤن ہال میں مسلمانانِ میسور کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا گیا ۔ یونیورسٹی کے غیر مسلم پروفیسروں نے بھی حضرت علامہ کی پذیرائی میں انتہائی خلوص کا اظہار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں مگر وہ کسی مذہب اور جماعت کی ملک نہیں ہو سکتے ، وہ ہم سب کے ہیں ؛ اگر مسلمانوں کو ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہمیں بھی فخر ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے ۔ *

سلطان ٹیپو

حضرت علامہ ٹیپو سلطان کے عاشق تھے اور متعدد بار ان کی تعریف میں اشعار بھی لکھ چکے تھے ۔ اب سفرِ دکن پیش آیا تو حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کے مزاروں پر بھی پہنچے ۔ سلطان شہید کے مزار پر ایک میسوری شاعر نے ایک نظم سنائی جس سے علامہ بے حد متاثر ہوئے اور اول سے آخر تک آبدیدہ رہے ۔ علامہ فرماتے ہیں " میسور میں جہاں کہیں بھی گیا ، لوگوں کی زبانوں پر ایک ہی نام تھا یعنی سلطان شہید کا نام ۔ جہاں دو تین آدمیوں کی محفل

---

* سیرتِ اقبال' طاہر فاروق ' ۳۷ ۔

گرم ہوتی ، ایک ہی قصہ تھا ، ایک ہی رنگین داستان تھی جسے ہر کوئی بیان کرتا اور سب لوگ ادب سے سر جھکائے سنتے اور وہ سلطان شہید کی معرکہ آرا زندگی کا ماجرا تھا ؛ بازاروں میں دکان داروں کا موضوعِ سخن بھی یہ ہی تھا ۔ دو تین مجلسوں میں جہاں جانے کا مجھے اتفاق ہوا ، یہ ہی باتیں ہوتی رہیں ؛ میں نے عمداً کئی مرتبہ گفت گو کا رخ دوسری باتوں کی طرف پھیرا لیکن ہر بار پھر سلطان ٹیپو کا تذکرہ آ جاتا ۔ *

حیدرآباد دکن میں

میسور سے حضرت علامہ رحہ ۱۴ جنوری کو حیدرآباد دکن پہنچے ، سٹیشن ہی پر ان کو بتا دیا گیا کہ آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے خاص مہمان ہیں ۔ پلیٹ فارم پر صدہا اشخاص جمع تھے ۔ معززینِ حیدر آباد ، یونیورسٹی کے پروفیسر اور طلبا اور دوسرے اہلِ ذوق اور مداح ۔ بچے قطار باندھے اقبال کا قومی ترانہ گا رہے تھے ۔ علامہ رحہ مہمان خانۂ شاہی میں تشریف لے گئے اور ۱۸ جنوری ۲۹ء کو گیارہ بجے قبل دوپہر اعلیٰ حضرت کی حضور میں باریاب ہوئے ۔

لیگ کے اجلاسِ الہ باد کی صدارت

۱۹۳۰ء تک دونوں مسلم لیگیں ایک ہو چکی تھیں ۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار داد مطالبات اور مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات دونوں ایک ہی مطلب رکھتے تھے لیکن چوں کہ مسلمانوں کی سیاسیات میں قائدین کے اس گروہ کی برتری ثابت ہو چکی تھی جو روز اول سے جدا گانہ انتخاب کا حامی تھا اور علاوہ بریں علامہ اقبال رحہ کئی سال سے مسلم سیاست کی نہایت مؤثر خدمات انجام دے رہے تھے ، اس لیے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس کے صدر منتخب کیے گئے جو دسمبر ۱۹۳۰ء میں بمقام الہ آباد منعقد ہونے والا تھا ۔ اس موقع پر حضرت علامہ رحہ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ خیالات کی وسعت و بلندی ، لہجے کی

---

* ملفوظات اقبال (عبدالرشید طارق) ۔

صداقت ، زبان کی دل فریبی اور مطالبِ سیاسی کی فراوانی کے اعتبار سے
بے نظیر دستاویز تھی ؛ پھر حسنِ اتفاق سے یہ ھی تقریر تھی جس میں علامہ
اقبال نے تجویزِ پاکستان کی بنیاد رکھ دی اور فرمایا :

"مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع اُن تمام مطالبات کی نہایت شد و مد
سے تائید کرے گا جو اس قرار داد میں موجود ھیں (آل
مسلم پارٹیز کانفرنس کی قرار داد) ۔ ذاتی طور پر تو میں ان
مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاھتا ھوں ؛ میری
خواھش ہے کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان
کو ایک ھی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست
سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے یا
باھر رہ کر ۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی
ھندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست
قائم کرنی پڑے گی"*

یہ ھی وہ پیرِ مشرق کا خواب تھا جس کی تعبیر بعد میں قائد اعظم محمد علی جناح
کے ھاتھوں ھوئی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ھوگیا ۔

علامہ اقبال رح نے جس دن سے خار زار سیاست میں قدم رکھا ، اپنے
نصب العین کے معاملے میں ذرہ بھر مفاھمت بھی گوارا نہیں کی ۔ وہ اول
و آخر ظاھر و باطن مسلمان تھے اور مسلمانوں کی جدا گانہ ملّی حیثیت کے سوا
اور کسی لائن پر سوچنے کے عادی ھی نہ تھے ؛ چناں چہ ۱۹۲۶ء سے
لے کر جب وہ پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ھوئے ، تادمِ آخر مسلمانوں کے
ملّی مطالبات اور جداگانہ انتخاب کے حامی رہے ۔ ایک دفعہ سر محمد شفیع جیسے
بزرگ بھی اس معاملے میں تھوڑی دیر کے لیے متزلزل ھو گئے تھے + لیکن
اس راستے پر اقبال رح کا قدم کبھی نہ ڈگمگایا ۔ آنھوں نے نہرو رپورٹ کی

* مفصل خطبۂ صدارت کے لیے ملاحظہ ھو خطبات و تقاریر ''حرفِ اقبال'' ۔

+ اقبال کا سیاسی کارنامہ ' ۱۱۵۔

مخالفت کی ، سائمن کمیشن سے تعاون کیا ، آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد
کا بندوبست کیا ، دونوں لیگوں کو دوبارہ متحد کرنے کے لیے کوشش
کی ؛ ان تمام اقدامات کا مطلب صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنی علٰحدہ اور
جداگانہ ملّی ھستی کو محفوظ کرنے کے لیے یک سو اور متحد ھو جائیں اور
قومیتِ متحدہ کے دامِ فریب میں گرفتار نہ ھونے پائیں ۔ پھر آخر میں
۱۹۳۰ء کے اجلاسِ مسلم لیگ میں مسلمانوں کو ایک نصب العین بھی
دے دیا جس کا نتیجہ پاکستان کی صورت میں ظاھر ہے ۔

چوتھی فصل

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک

اب شاعر اقبال رح اور فلسفی اقبال رح زیادہ تر استراحت میں مصروف تھا اور علامہ کی پوری زندگی سیاسیات کے لیے وقف ہو رہی تھی، اس لیے کہ ہندوستان کی سیاست ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکی تھی جس پر اگر مسلمان اپنے نصب العین اور لائحۂ عمل کو نہایت وضاحت سے متعین نہ کر لیتے تو ان کا مستقبل نہایت اندیشہ ناک ہو جاتا ۔ علامہ اقبال رح روزِ اول ہی سے قومیتِ متحدۂ ہند کے مخالف اور ملّتِ اسلامی کے انقطاع و استقلال کے سرگرم حامی تھے اور ان کی مساعی اب برگ و بار لا رہی تھیں، اس لیے انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ اپنے تمام تر اوقات ایسی تحریکات میں صرف کریں گے جن سے مسلمانوں کو ہندوستان میں آزاد اور آبرو مند زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے ۔

ملک کی سیاسی فضا

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد میں علامہ اقبال رح نے آزاد مسلم مملکت کی جو تجویز پیش کی، وہ کانگرس کی نیشنلزم اور ہندوؤں کی فرقہ پرستانہ منصوبہ بندی کے لیے ایک خوف ناک بم کا گولہ ثابت ہوئی؛ چناں چہ جہاں مسلمانوں نے اس تجویز کو اپنا نصب العین اور علامہ اقبال رح کو اپنا رہنما تسلیم کیا، وہاں ہندوستانی پریس نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نالہ و فریاد سے قیامت برپا کر دی، اور محض اپنی تسلی کی خاطر علامہ رح کی تجویز کو خیالی، موہوم، غیر عملی ظاہر کرنا شروع کیا ۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ کانگرس نے اپنے سالانہ اجلاس لاہور (دسمبر ۲۹ء) میں آزادی' کامل کی قرار داد منظور کر دی تھی اور نہرو رپورٹ کو موقوف و منسوخ قرار دیا تھا ۔ اس کے بعد ۲۶ جنوری

۱۹۳۰ء کو یومِ آزادی منایا اور مارچ ۱۹۳۰ء میں نمک سازی کی سول نافرمانی ڈانڈی کے مقام سے شروع کر دی ۔ چوں کہ کانگرس نے حقوق کے معاملے میں مسلمانوں سے کوئی سمجھوتا نہ کیا تھا اس لیے مسلمان من حیث القوم اس سول نافرمانی سے الگ رہے ۔ دوسری طرف مسلمانوں نے الہ آباد مسلم لیگ کانفرنس میں آزاد مسلم مملکت کا نصب العین پیش کر دیا تھا اور تیسری طرف حکومت برطانیہ اپنے من مانے آدمیوں کو بٹھا کر لندن میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد کر رہی تھی ۔

کانگرس اور حکومت

پہلی گول میز کانفرنس ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی ۔ حکومتِ برطانیہ اب ہندوستان کے آئندہ دستور کی بحث میں کانگرس کا تعاون بھی حاصل کرنا چاہتی تھی اور سول نافرمانی کا زور شور بھی ختم ہو چکا تھا لہٰذا جنوری ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی رہا کر دیے گئے ۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدہ ہوا ۔ کانگرس نے سول نافرمانی سے دست برداری کا اعلان کر دیا؛ سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے اور دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی شرکت قریب قریب یقینی ہو گئی ۔ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتے کی ایک اور کوشش بھی کی گئی؛ گاندھی جی نے کہا کہ اگر قومیت پسند مسلمان مسلم مطالبات سے اتفاق کر لیں تو ہم بھی انھیں تسلیم کر لیں گے؛ چناں چہ شملے میں جون ۱۹۳۱ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے نمائندوں کی ایک مشترک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن دفعتاً گاندھی جی نے ایک اور قلا بازی لگائی کہ مسلمان آپس میں اتفاق کر کے سکھوں کو بھی رضا مند کریں ۔ اس پر فضا بالکل بگڑ گئی اور صاف نظر آ گیا کہ کانگرسی رہنما مسلمانوں کے متحد ہو جانے پر بھی مسلم مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے ۔

چوں کہ اب حکومتِ برطانیہ اور کانگرسی رہنماؤں میں گاڑھی چھننے لگی تھی اور معاہدے کے بعد صلح صفائی ہو چکی تھی اس لیے مسلم لیگ اور اقلیتوں کی دوسری جماعتیں خائف ہو رہی تھیں کہ حکومتِ برطانیہ کانگرس کو خوش کرنے کے لیے اقلیتوں کو قربان کر دے گی اور ان کے حقوق نظر انداز ہو جائیں گے ۔ اس موقع پر علامہ اقبال رح نے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک کھلا مکتوب شائع کیا جس میں نہایت شائستہ اور مدلّل انداز میں انگریزوں کو ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جو ہندوستان کے متعلق ان پر عائد ہوتی تھیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ:

ہم وہ ہی حربہ استعمال کریں گے

آئندہ گول میز کانفرنس میں اگر برطانیہ نے دونوں قوموں کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو آخرکار یہ بات دونوں ملکوں کے لیے تباہ کن ہوگی ۔ اگر برطانیہ اپنے کسی مادی مفاد کے پیش نظر ہندوؤں کو سیاسی اختیارات سونپ دے اور انہیں بر سر اقتدار رکھے تو ہندوستان کے مسلمان اس پر مجبور ہوں گے کہ سوراج یا اینگلو ہندو سو راج کے خلاف وہی حربہ استعمال کریں جو گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف کیا تھا ؛ مزید برآں اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمیونزم کی آغوش میں چلے جائیں اور اس طرح مشرق میں برطانوی تفوّق و اقتدار کو سخت صدمہ پہنچے ۔

اُس زمانے میں انگریز عام طور پر یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے کہ مسلمان روس کی طرف مائل نہیں ہوسکتے کیوں کہ کمیونزم مذہب اسلام کے خلاف ہے ؛ علامہ رح نے ان کے اس خیال کو بھی کم زور کرنے کی کوشش کی ۔

کمیونزم ، اسلام اور روس

"میرا ذاتی خیال ہے کہ روسی عوام فطرۃً لا مذہب نہیں ہیں بلکہ میری رائے میں وہاں کے مردوں عورتوں میں مذہبی میلان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے ۔ روس کے مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معین عرصے تک نہ رہے گی ، کیوں کہ کسی معاشرے کا نظام زیادہ دیر تک دہریت پر قائم نہیں رہ سکتا ۔ جوں ہی حالات معمول پر آئے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملا ، وہ یقیناً اپنے نظام کے لیے کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے ۔ اگر بولشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بولشوزم اسلام کے بہت قریب آ جاتا ہے اس لیے میں متعجب نہ ہوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر ؛ اس چیز کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہوگا کہ نئے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت کیا ہوگی ۔

دوسری گول میز کانفرنس

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی اور علامہ اقبال رح اس میں شریک ہوئے ۔ اس کانفرنس کے تمام ممبر حکومت کے نام زد کردہ تھے جو اس نے خود ہی کانگرس ، لیگ اور دوسری جماعتوں میں سے چن لیے تھے ۔ گاندھی جی نے انتہائی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح مشہور کانگرسی مسلمان لیڈر ڈاکٹر انصاری بھی گول میز کانفرنس کے ممبر نام زد ہو جائیں تاکہ مسلم مطالبات کے معاملے میں ان کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جا سکے لیکن حکومت برطانیہ نے گاندھی جی کی یہ استدعا تسلیم نہ کی ۔ علامہ اقبال رح کی نامزدگی تو لازمی تھی اس لیے کہ اُس زمانے میں مسلم حقوق و مطالبات کے متعلق کوشش کرنے والے اور ہندوستان کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کی مستقل انفرادیت کی حفاظت کرنے والے لیڈروں میں علامہ اقبال رح سب سے زیادہ ممتاز تھے اور ملّتِ اسلامیہ کی عظیم اکثریت ان کی ہم خیال و ہم آہنگ ہو چکی تھی ۔

مہر صاحب کی معیت

علامہ اقبال رح دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہوئے تو مولانا غلام رسول مہر (''مدیرِ انقلاب'') ساتھ ہو لیے۔ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ اول علامہ رح کے لیے ایک مخلص رفیقِ سفر اور ہم خیال دوست کی ہم راہی موجبِ آسائش ہو گی؛ دوم مہر صاحب اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے پرائیویٹ طور پر علامہ اقبال رح اور دوسرے ارکانِ کانفرنس کے لیے موجبِ تقویت رہیں گے؛ سوم وہ روز نامۂ ''انقلاب'' کے لیے گول میز کانفرنس کی روداد قلم بند کر کے بھیجا کریں گے۔ گول میز کانفرنس کی دو کمیٹیاں تھیں؛ ایک اقلیتوں کے مسائل کی کمیٹی، دوسری وفاق نظام پر غور کرنے والی کمیٹی۔ علامہ رح اول الذکر کمیٹی کے ممبر تھے۔

سر آغا خان

گول میز کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں کا نظام کار یہ تھا کہ ان میں ممبر تو سب کے سب شریک ہوتے تھے لیکن گفت گو کا فرض رئیسِ وفد ہی کو ادا کرنا ہوتا تھا۔ وفد کے ممبر اپنے رئیس کو مختلف امور کے متعلق مشورہ دیتے رہتے تھے۔ مسلم وفد کے سرگروہ سر آغا خان تھے؛ علامہ اقبال رح عام طور پر سر آغا خان کو مسائل کے متعلق مشورہ دیتے رہے اور آغا خان کانفرنس اور کمیٹیوں میں وفد کی نمائندگی کا حق ادا کرتے رہے۔

گاندھی کی شرائط

اقلیتوں کی کمیٹی کے دو ابتدائی اجلاس تو محض رسمی تھے جن میں قرار دیا گیا کہ کمیٹی کے ممبر غیر رسمی طور پر بات چیت کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ گاندھی جی نے ان دنوں کہا کہ میں ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات کو قبول کرتا ہوں لیکن یہ ضمانت نہیں دے سکتا کہ کانگرس بھی ان کو قبول کر لے گی۔ علامہ رح نے کہا کہ آپ کانگرس کی مجلس عامہ کو

تار دے کر اس کی رضامندی حاصل کر لیں لیکن گاندھی جی اس پر راضی نہ ہوئے اور اعلان کیا کہ میں مسلم مطالبات کو تسلیم کرتا ہوں بشرطیکہ مسلمان بالغوں کے حق رائے دہی کو مان لیں، کامل آزادی کے نصب العین کی تائید کریں اور اچھوتوں کے حقِ انتخابِ جداگانہ کی تائید نہ کریں۔

علامہ اقبال رح کو پہلی دو شرطوں کے قبول سے انکار نہ تھا لیکن وہ تیسری شرط ہرگز تسلیم نہ کر سکتے تھے۔ جب وہ مسلمانوں کے لیے انتخابِ جداگانہ کا حق طلب کرتے تھے تو دوسری اقلیتوں کو کس منہ سے محروم قرار دیتے۔ ۱۵ اکتوبر کو پرائیویٹ گفت و شنید شروع ہوئی۔ کئی سکیمیں پیش ہوئیں؛ آخر ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو اقلیتوں کے درمیان ایک میثاق قرار پا گیا جس میں سکھ شریک نہ تھے۔ ۱۳ نومبر کو اقلیت کمیٹی کا چوتھا اور آخری اجلاس ہوا جس میں اقلیتوں کا میثاق وزیر اعظم برطانیہ کے سپرد کر دیا گیا۔

رفیقوں کی علاحدگی

گول میز کانفرنس کی دوسری کمیٹی وفاقِ ہند کی نوعیت پر غور کرنے کے لیے قائم تھی۔ علامہ اقبال رح نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء ہی میں آل انڈیا فیڈریشن کے خلاف اظہار خیال کیا تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ پہلے صوبائی خود اختیاری حکومت قائم کی جائے اور جب ان حکومتوں کا تجربہ کامیاب ہو جائے تو مرکز میں وفاق قائم کیا جائے اور اولین مرحلے پر یہ وفاق بھی صرف برطانوی ہند کے صوبوں کا ہو، ریاستیں اس میں شریک نہ کی جائیں؛ چناں چہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۱ء کو وفاقِ ہند والی کمیٹی کے مسلم ارکان نے یہ طے کیا کہ وہ اس کمیٹی کی کسی کاروائی میں حصہ نہ لیں گے۔ علامہ اسی دن سے اس کمیٹی کے ارکان سے علاحدہ ہو گئے تھے لیکن ۲٦ نومبر کو دفعتاً اس کمیٹی کے ارکان نے اپنے سابقہ فیصلے کو پسِ پشت ڈال کر وفاق

کمیٹی میں حصہ لیا اور ان کے سرگروہ نے یہ کہا کہ صوبائی خود اختیاری کے ساتھ ہی مرکز میں وفاق قائم کر دیا جائے ۔ علامہ رح کو ان ممبروں کے ناگہانی اور پُر اسرار فیصلے پر رنج ہوا اور وہ مسلم وفد سے علحدہ ہو گئے۔ یہاں مشہور ہو گیا کہ علامہ رح نے کانفرنس سے استعفا دے دیا ہے لیکن واپسی پر لاہور میں علامہ نے بتایا کہ میں نے کانفرنس سے استعفا نہیں دیا بلکہ مسلم وفد سے علحدگی اختیار کی ہے اور میرا یہ عمل آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق ہے ۔ *

مؤتمرِ عالمِ اسلامی

دوسری گول میز کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ہوگئی۔ علامہ رح مع غلام رسول مہر انگلستان سے روانہ ہو کر فلسطین پہنچے جہاں علامہ رح مؤتمر عالمِ اسلامی میں مسلمانانِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھے ۔ واپسی پر لاہور میں آپ نے فرمایا کہ ''سفرِ فلسطین میری زندگی کا نہایت دل چسپ واقعہ ثابت ہوا ہے ۔ وہاں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش ، مصر ، یمن ، شام ، عراق ، فرانس اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی ۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا ۔ ان نوجوانوں میں اس خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی جو میں نے اطالیہ کے فاشسٹ نوجوانوں کے سوا کسی میں نہیں دیکھی ۔ *

مؤتمر اسلامی کے متعلق علامہ رح نے فرمایا کہ مقامی جماعتی اختلافات کے باوجود مؤتمر شان دار طریق پر کامیاب ہوئی۔اس اجتماع میں اکثر اسلامی ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوّت اور ممالکِ اسلامی کی آزادی کے مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش و خروش کا اظہار کیا ۔ عرب پیدائشی مقرر اور خطیب ہیں اور غالباً یہ ان کی زبان کی خصوصیت ہے کہ وہ ایسے واقع ہوئے ہیں ۔ میں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھیں لیکن افسوس ہے کہ

* روزنامہ '' انقلاب '' ۳ جنوری ۱۹۳۲ء

میں ان سب میں شرکت نہ کر سکا ۔ میں نے ایک سب کمیٹی میں یروشلم میں قدیم جامعۂ ازہر کے طرز پر اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل جدید انداز پر قائم کی جائے۔ رائیٹر کے ایک مبہم سے تار کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ میں یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ عربی زبان بولنے والے صرف ایک نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علومِ جدیدہ کو زبان عربی میں منتقل کر لیں ۔ *

واپس لاہور میں

۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو حضرت علامہ رح بمعیت مولانا غلام رسول مہر لاہور پہنچ گئے ۔ ریلوے سٹیشن پر شان دار استقبال ہوا؛ جمعیت اسلام کے ارکان نے علامہ رح کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کرنا چاہا جو ہجوم کی کثرت کے باعث پڑھا نہ جا سکا؛ اس میں علامہ رح کی خدمات اسلامی کو سراہا گیا تھا اور ان کی بہ خیریت مراجعت پر ہدیۂ تبریک پیش کیا گیا تھا ۔ مذکورہ بالا انٹرویو کے دوران ہی میں علامہ رح نے فرقہ وار تصفیے کے متعلق فرمایا کہ اس سلسلے میں جن مسائل کو طے کیا جا چکا ہے، ان پر دوبارہ بحث نہ کی جائے؛ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب ، صوبہ سرحد اور سندھ کے مسائل پر عملی طور سے بحث و تمحیص ختم ہو چکی ہے اور دارالعوام میں وزیر اعظم اور سر سیموئل ہور نے ان کے متعلق واضح بیان بھی دے دیا ہے ۔ اب جس مسئلے کا تصفیہ باقی ہے وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کا مسئلہ ہے ، اب اس کو حل کرنا چاہیے ۔ *

مسلمانوں کی بدگمانی کے اسباب

دوسری گول میز کانفرنس میں پنڈت مالوی ، ڈاکٹر مونجے اور بعض دوسرے ہندو سبھائی لیڈروں نے ''اقلیتوں کے میثاق'' سے متاثر ہو کر

* '' انقلاب '' ۳ جنوری ۱۹۳۲ء ۔

اور فرقہ وار مسئلے کے حل سے عاجز ہو کر مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کو چٹھی لکھ دی کہ فرقہ وار مطالبات کا فیصلہ آپ ہی کر دیجیے، ہمیں وہ فیصلہ منظور ہوگا۔ گاندھی جی نے اس چٹھی پر تو دستخط نہیں کیے لیکن ایک علیحدہ خط اسی مضمون کا اپنی طرف سے بھی لکھ دیا۔ ہندو لیڈر جانتے تھے کہ رامزے میکڈانلڈ ہمارا پرانا دوست ہے، اس کی لیبر پارٹی کو ہم وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی دیتے رہے ہیں اور اس کا جھکاؤ بھی ہمیشہ کانگرس ہی کی طرف رہا ہے اس لیے معاملہ اسی پر چھوڑ دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم بھی میکڈانلڈ کے فیصلۂ ثالثی کو قبول کرنے پر رضا مند ہو جاؤ لیکن مسلمانوں نے صاف انکار کر دیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں جو بیان دیا اس سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ہندوؤں کی طرف مائل ہے۔ اس کے علاوہ کانگرس پھر سول نافرمانی کے لیے پر تول رہی تھی اور مسلمان گونا گوں اندیشوں میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب کانگرس اور ہندو سبھا کے لیڈر اندر ہی اندر انگریزوں سے دوستی اور اعتماد کی پینگیں بھی بڑھا رہے ہیں اور سول نافرمانی کے ذریعے سے دباؤ بھی ڈال رہے ہیں تو یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ وزیراعظم برطانیہ فرقہوار فیصلے میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کر کے اپنے دوستوں کو ناراض کر لیں؛ کانگرسی خیال کے مسلمانوں نے ملّتِ اسلامی کی متحدہ قوت میں رخنہ ڈال کر اسے اور بھی کم زور کر رکھا تھا۔

یہ سیاسی حالات تھے جن میں آل انڈیا مسلم کانفرنس* نے فیصلہ کیا کہ اس کا آئندہ اجلاس عام فروری ۱۹۳۲ء میں زیرِ صدارت علامہ اقبال رح منعقد ہوگا۔ حاجی رحیم بخش مرحوم مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔

خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس

اس کانفرنس میں علامہ اقبال رح نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اپنی علمیت، اپنے مطالب کی ہمہ گیری

* دہلی والی آل پارٹیز مسلم کانفرنس اب آل انڈیا مسلم کانفرنس کہلاتی تھی۔

اور جذبہ انگیزی کے اعتبار سے الہ آباد والے خطبے سے بھی بہتر تھا۔ اس میں علامہ نے گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کی کار گزاری سنائی اور گاندھی جی، مالوی جی، ہندوؤں اور سکھوں کے ضدی رویے کی تفصیلات پیش کیں۔ اپنے ان رہنماؤں کی بھی شکایت کی جو صوبائی خود اختیاری کے ساتھ ہی وفاق کا مطالبہ بھی کرنے لگے حالاں کہ اس سے قبل فیصلہ اس کے خلاف ہو چکا تھا۔ پھر علامہ نے مسلمانوں کے غیر منظور شدہ مطالبات کا ذکر کیا اور کانگرس کی آئندہ سول نافرمانی کا مقصد یہ بتایا کہ کسی طرح حکومتِ برطانیہ کو کانگرس کے حسب منشا فرقہوار فیصلہ صادر کرنے پر مجبور کیا جائے۔ آپ نے صوبہ سرحد، عبدالغفار خان، مسئلۂ کشمیر، ہندو مسلم فسادات، اقلیتوں کے اندیشوں اور دیگر مسائل کے متعلق نہایت عمیق خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا:

> ”یہ مناظر محض ایک آنے والے طوفان کے آثار ہیں جو سارے ہندوستان اور ایشیا کے باقی حصوں پر بھی چھا جائے گا۔ یہ قطعاً اُس سیاسی تمدن کا لازمی نتیجہ ہے جس نے انسان کو ایک ایسی ”چیز“ تصوّر کر رکھا ہے جس سے جلبِ منافع کیا جائے، حالاں کہ انسان ایک شخصیت ہے جس کو خاص کلچرل طاقتوں سے نشو و نما اور ترقی دینی چاہیے۔ اقوامِ ایشیا یقیناً اس قابوچیانہ اقتصاد کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی جس کو مغرب نے ترقی دے کر ایشیا کی قوموں پر عائد کر رکھا ہے۔ ایشیا اپنی غیرمنضبط انفرادی کیفیت کے ساتھ زمانۂ حال کی مغربی سرمایہ داری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دین کا منشا

جس دین کے تم علم بردار ہو، وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں کی خدمت میں صرف

کر دے ۔ اس دینِ قیّم کے ممکنات مضمر ابھی ختم نہیں ہوئے ؛ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں ، جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو ، جس میں ایک اچھوت ایک شہزادی سے شادی کرسکے ، جس میں ذاتی ملکیت محض ایک وقف ہو اور جس میں سرمایے کو اس طرح المضاعف ہونے کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ حقیقی دولت آفرین طبقے پر غلبہ پا جائے ۔

مُلّاؤں کے فرسودہ اوہام

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے ۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قیدخانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اوز ہم بوڑھوں کے لیے شرم کا مقام ہے کہ ہم اپنے نو جوانوں کو ان اقتصادی ، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانۂ حاضر میں آنے والے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یک سر بدل دیا جائے ، تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں ، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی آمنگ کو محسوس کرنے لگے ۔ ہندوستانی مسلمان اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں کے تجسّس کو مدت سے ترک کر چکا ہے؛ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی زندگی میں رنگ و آہنگ اور رونق و درخشانی کا نشان تک نہیں رہا اور ہر وقت اس امر کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ بعض طاقتوں سے جن کے متعلق اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ کھلی جنگ میں شکست نہیں دے سکتا ، بزدلانہ و نامردانہ سمجھوتا نہ کرے ؟"

آگے چل کر فرمایا :

شعلۂ حیات روشن کرو

مسولینی کا اصول یہ تھا کہ جس شخص کے پاس فولاد ہے ، اس کے پاس روٹی ہے لیکن میں اس

میں ترمیم کر کے کہتا ہوں کہ جو شخص خود فولاد ہے ، اس کے پاس سب کچھ ہے ؛ سخت بن جاؤ اور سخت محنت کرو ، انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہ ہی ایک راز ہے ۔ ہمارا نصب العین بالکل معیّن اور واضح ہے ؛ وہ نصب العین یہ ہے کہ آئندہ دستور میں اسلام کے لیے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے ؛ اس نصب العین کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے اور اس کی خواب دہ قوتوں کو منظم کیا جائے ۔ شعلۂ حیات دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا ، وہ صرف اپنی روح کے آتش کدے میں روشن کیا جا سکتا ہے ۔''

ان ولولہ انگیز فقروں کے بعد علامہ رہ نے مسلمان قوم کے لیے تنظیمی تجاویز پیش کیں کہ ایک ہی سیاسی انجمن ہو ، ایک ہی قومی سرمایہ ہو جس کے ماتحت یوتھ لیگیں اور رضا کاروں کے جیش منظم کیے جائیں ، کلچرل ادارے قائم کیے جائیں ، ہارٹوگ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق تعلیم کی ترویج کا انتظام کیا جائے اور سب سے بڑی تجویز یہ پیش کی کہ

علما و وکلا کی مجلس

'' ایک جمعیتِ علما قائم کی جائے جس میں وہ مسلمان قانون دان لازماً شامل ہوں جنھوں نے جدید قانونی تعلیم حاصل کی ہے ۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ شرع اسلام کی حفاظت کی جائے، اس کو وسعت دی جائے اور اگر ضروری ہو تو حالاتِ جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اس کی تعبیر و تاویل کی جائے جس میں اس کے اصولِ اساسی کی سپرٹ کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہونے پائے ۔ اس مجلسِ علما کی حیثیت آئینی اعتبار سے مسلّم ہونی چاہیے تاکہ ہر مسودۂ قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لا سے تعلق رکھتا ہو ، مجلسِ وضعِ قوانین میں زیر بحث آنے سے پیش تر اس جمعیتِ علما میں پیش ہو کر بحث و تمحیص کے تمام مراحل طے کر لے *

---

* اقتباسات خطبۂ صدارت از ''انقلاب'' مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء ۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال رح کے اس خطبۂ صدارت سے ہندوستان و انگلستان کے سیاسی حلقوں میں خاصی سنسنی پھیل گئی کیوں کہ یہ خطبہ صاف گوئی، خلوص، خود داری اور صداقت کا مظہر تھا اور ضرورياتِ وقت کے مطابق سیاسی تدبّر کا بھی شہ کار تھا ۔ اس میں علامہ نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تائید بھی کی اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی نمائندگی کا حق بھی ادا کیا ؛ کانگرس کی سول نافرمانی کے خلاف نکتہ چینی کی اور ہندوؤں کی غیر مفاہمانہ ضد پر افسوس کیا ؛ اُن مسلم مندوبین کو بھی ہدفِ ملامت بنایا جنھوں نے وفاق نظام کمیٹی میں شرکت اختیار کرلی تھی۔ علامہ رح نے نہایت بے باکی سے صاف کہ دیا کہ حکومت برطانیہ کی حکمتِ عملی متذبذبانہ ہے ؛ وہ انگریز غلطی پر تھے جنھوں نے مسلم مندوبین کو وفاق کمیٹی میں شرکت کا مشورہ دیا ۔ وزیر اعظم برطانیہ کی اختتامی تقریر افسوس ناک ہے اور فرقہ وار فیصلے کا اعلان ہونے میں تاخیر کا الزام حکومت برطانیہ پر ہے ۔ علامہ نے مسلمانوں کو جہاں کانگرس کی سول نافرمانی سے الگ رہنے کا مشورہ دیا ، وہاں یہ بھی کہ دیا کہ مسلمانوں کو حکومت پر اعتماد کی پالیسی ترک کر کے ایک آزدانہ اور خود مختارانہ حکمتِ عملی وضع کرنی چاہیے کیوں کہ اعتماد کی پالیسی نے انہیں نہ اب تک کوئی فائدہ پہنچایا ہے نہ آیندہ اس سے کوئی توقع ہے ۔

علامہ اقبال رح کے اس خطبے سے حکومت برطانیہ اور وزیر ہند بے حد آزردہ ہوئے اور اس امر کی کوئی توقع باقی نہ رہی کہ وہ آئندہ بھی علامہ کو گول میز کانفرنس میں مدعو کریں گے۔

اس کانفرنس میں مسلمانوں کے حقوق و مطالبات ، کانفرنس کی شاخوں کی تنظیم اور دیگر مسائلِ قومی کے متعلق مفید قرار دادیں منظور کی گئیں ۔ *

مسلمانانِ ہند کو حکومت برطانیہ کی طرف سے فرقہ وار فیصلے کے اعلان کا شدید انتظار تھا اس لیے کانفرنس کے اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ اگر فرقہ وار

* مفصل قرار دادوں کے لیے ملاحظہ ہو ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' ۱۵۴تا۱۵۶ ۔

فیصلے کا اعلان ۳۰ جون ۳۲ء سے قبل نہ ہو جائے تو کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا ایک اجلاس ۳ جولائی ۳۲ء کو منعقد کیا جائے جس میں ''راست اقدام'' کی تدابیر طے کی جائیں ۔ چناں چہ مولانا شفیع داؤدی سیکرٹری کانفرنس نے اس اجلاس کے دعوت نامے بھی جاری کر دیے اور الہ آباد مقامِ اجلاس قرار پایا لیکن مجلسِ عاملہ کے بعض ممبروں کے مشورے سے علامہ اقبال رح نے اس اجلاس کو آخر جولائی تک ملتوی کر دیا * ۔ اس پر ایک گروہ نے بہت شور مچایا جس کا مقصد یہ تھا کہ راست اقدام کا فیصلہ جلد سے جلد ہو ۔ انھوں نے کہا کہ اقبال رح کا یہ فعل ڈکٹیٹرانہ ہے ؛ چناں چہ ۳ جولائی کو الہ آباد ہی میں مسلم کانفرنس کے بعض مقتدر ممبروں نے ایک عام جلسہ منعقد کیا جس میں علامہ کے اس اعلانِ التوا کے خلاف احتجاج کیا گیا اور مولانا حسرت موہانی اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ تجویز کی کہ کانفرنس کے اندر ایک نئی جماعت قائم کی جائے ؛ یہ علی الاعلان کہا گیا کہ علامہ نے شملے کے اشارے پر مجلسِ عاملہ کا اجلاس ملتوی کیا ہے ۔

اس پر علامہ نے ایک بیان شائع کیا جس میں جلسۂ الہ آباد پر ناراض ہونے کی بجائے مولانا حسرت موہانی کے اقدام کو درست بتایا اور فرمایا کہ مولانا کا طرزِ عمل خود میری تجویز کے مطابق ہے کہ مسلمانوں کا ایک ہی آل انڈیا سیاسی ادارہ ہونا چاہیے جس کے اندر ہر سیاسی عقیدے کو برسرِ اقدار آنے کا موقع حاصل رہے ۔ آپ نے بتایا کہ مجلسِ عاملہ کے ایک اجلاس میں جس میں وہ خود شریک نہ تھے ، مولوی شفیع داؤدی کو اختیار دیا گیا تھا کہ اگر ان کے نزدیک فرقہ وار فیصلے کا اعلان ۳ جولائی تک اغلباً نہ ہو تو وہ اجلاسِ عاملہ کو ملتوی کر سکتے ہیں لہٰذا اس التوا کو آمرانہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا ۔

علامہ رح نے فرمایا کہ اگر فرقہ وار فیصلہ مسلمانوں کے موافق نہ ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ حکومت سے لڑیں لیکن محض اتنی سی بات پر

* روز نامہ انقلاب ۲ جولائی ۳۲ء ۔

میں انہیں لڑنے کا مشورہ نہیں دوں گا کہ حکومت برطانیہ اس فیصلے کے اعلان میں تاخیر کر رہی ہے؛ اس کھلم کھلا اظہار کے بعد مسلمان یہ اندازہ کرلیں گے کہ اجلاس عاملہ کو ملتوی کرنے کا جو مشورہ میں نے دیا تھا، وہ کہاں تک ”شملے کے اشارۂ چشم و ابرو“ سے متاثر تھا:

”میں نے اپنی پرائیوٹ اور پبلک زندگی میں کبھی دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی نہیں کی۔ ایسے وقت میں جب قوم کے اہم ترین مفادات کی بازی لگی ہوئی ہے، میں اس آدمی کو اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے: میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ التوا کی خواہش کرنے والوں کے رویے کی یہ تعبیر ہرگز نہ کرنی چاہیے کہ وہ قرارداد لاہور (یعنی راست اقدام) پر عمل کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہیں گے؛ جب تک اس عمل کی ضرورت لاحق نہ ہو، جماعت کو چاہیے کہ اپنی طاقت کو محفوظ رکھے۔“*

عین اس موقع پر مولوی شفیع داؤدی نے سیکرٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا؛† اس پر علامہ اقبال رح نے سیّد ذاکر علی سیکرٹری یو۔ پی مسلم کانفرنس (لکھنو) کو اور مولوی شفیع کو تار دیے کہ وقت بہت نازک ہے، آپس میں بیٹھ کر معاملات پر بات چیت کرلیجیے اور مولوی شفیع استعفا واپس لے لیں۔ غرض اس التوائے اجلاس کے مسئلے پر علامہ اقبال رح کو اپنے حامیوں اور مداحوں کی طرف سے بھی مخالفت برداشت کرنی پڑی لیکن وہ اس بات پر جمے رہے کہ التوا ہی مناسب ہے۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے ایک بیان میں علامہ کی تائید کی، اس الزام کو شرم ناک بتایا کہ اس میں ”شملے کا اشارہ“ تھا، مولوی شفیع داؤدی کے استعفے کو جلد بازانہ بتایا اور ظاہر کیا

* سیاسی کارنامہ ۱۵۹ ۔
† انقلاب ۴ جولائی ۳۲ ۔

کہ مجھے اور علامہ اقبال رح کو ہندوستان بھر کے گوشے گوشے سے مجالس قانون ساز کے ممبروں کی طرف سے بے شمار تار موصول ہوئے تھے کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔

یہ طوفان بہت جلد تھم گیا اور اس نئی جماعت کے بعض لیڈروں نے خود علامہ اقبال رح سے ملاقات کر کے عرض کیا کہ موجودہ حالات میں مجلس عاملہ کے اجلاس کا التوا ہی مناسب تھا اور برطانوی حکومت نے چوں کہ ہندوستانی جماعتوں کی درخواست پر فرقہ وار مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری لی ہے اس لیے ہم کو اس کے فیصلے تک انتظار کرنا چاہیے“۔* غرض علامہ اقبال رح کے خلوص اور ان کی شخصیت کے اثر نے کانفرنس کو اختلاف کی نذر نہ ہونے دیا اور آخر میں سبھی ان سے متفق ہو گئے۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اقلیتوں کے درمیان ایک میثاق ہو گیا تھا جس میں سکھ شامل نہ ہوئے تھے۔ اب کہ فرقہ وار فیصلے کے اعلان کا وقت قریب آیا، سکھوں نے بھی پر پرزے نکالے اور تیاری شروع کر دی کہ فیصلے کے اعلان کے وقت ایسی ہنگامہ آرائی کی جائے جس سے مسلمانوں کے مفاد کو صدمہ پہنچے۔ اس پر علامہ اقبال رح نے ۲۵ جولائی ۳۲ء کو ایک بیان شائع کیا جس میں سکھوں کے شائع کردہ بیانات اور منعقد کردہ جلسوں پر اظہار افسوس کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہندو قوم سکھوں کی پشت پناہی کر رہی ہے اور اس کا اثر اقلیتوں پر یہ ہو گا کہ وہ ہندوؤں کے غلبے کو اور بھی زیادہ اندیشے کی نظر سے دیکھیں گے کیوں کہ ان کو مرکز اور چھ صوبوں میں اقتدار اکثریت حاصل ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمان جس قدر اپنے جماعتی حقوق کو محفوظ کرانے کے لیے مضطرب ہیں، اسی قدر ملک کی دستوری ترقی کے لیے بھی بے چین ہیں؛ جن تحفظات کا مطالبہ انہوں نے کر رکھا ہے، وہ

* سیاسی کار نامہ ۱۶۰ ۔

ایک آل انڈیا اقلیت کی حیثیت سے ان کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں ۔*

اس وقت علامہ اقبال کے ایک پرانے اور مخلص دوست سردار جگندر سنگھ حکومتِ پنجاب میں وزیرِ زراعت تھے ۔ انہوں نے پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کا آغاز کیا ۔ اس کا مختصر قصہ علامہ اقبال رح ہی کی زبانی سنیے: "انقلاب" ۷ اگست ۱۹۳۲ء میں علامہ کے ایک انٹرویو کی کیفیت درج ہے جس میں علامہ بیان کرتے ہیں: "سر جگندر سنگھ نے ایک سکیم کے متعلق گفت وشنید کی دعوت دی ہے ؛ سکیم یہ ہے کہ صوبے کی کونسل کے ۱۷۵ ممبروں میں مسلمانوں کو صرف ایک نشست کی اکثریت پر مطمئن ہو جانا چاہیے یعنی کونسل میں ہندو سکھ وغیرہ ۸۷ ہوں اور مسلمان ۸۸ ۔ میں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا ۔ پھر سر جگندر نے ایک اور سکیم مجھے ارسال کردی ۔ جہاں تک مجھے بتایا گیا ، یہ تمام مکاتبت پرائیویٹ تھی ، پھر معلوم نہیں اس کو ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعے سے شائع کیوں کر دیا گیا ۔ بہر حال میں کسی ایسی سکیم کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں مسلمانوں کو حق اکثریت نہ دیا گیا ہو یعنی مسلمانانِ پنجاب کم سے کم اکیاون فی صدی نشستوں پر رضا مند ہو سکتے ہیں ۔ سر جگندر سنگھ نے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کے لیے تو صرف ایک نشست کی اکثریت تجویز کی تھی لیکن مسلمانوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ سکھوں کے لیے مرکزی مجلس قانون ساز میں پانچ فی صدی صوبہ سرحد میں چھ فی صدی اور مرکزی وزارت میں ایک نشست مخصوص کرنے کی تائید و حمایت کریں ، اس کے بعد سکھ اقلیتوں کے معاہدے میں شامل ہو جائیں گے" ۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ رہا شملے میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کسی گفت و شنید کا مسئلہ تو اس کے متعلق میں صاف کہ دینا چاہتا ہوں کہ:

---

* "حرفِ اقبال" ۹۹ ۱۹۵ ۔

اگرچہ میں ہر معقول تصفیے کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوں اور یہ بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ تصفیہ حکومت کے اس اعلان سے پیش تر ہی کر لیا جائے جو ۱۷ اگست کو ہونے والا ہے لیکن میں مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اس قسم کی گفت و شنید میں شریک ہونے کو تیار نہیں ہوں جب تک کانفرنس کی مجلس عاملہ کی طرف سے مجھے اس کا اختیار نہ دیا جائے ۔*

اس کے بعد مجلسِ عاملہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس ۷ اگست کو دہلی میں ہوا ، علامہ نے صدارت فرمائی ۔ اس اجلاس میں ایک تو حکومت برطانیہ سے فرقہ وار فیصلے کے جلد تر اعلان کا مطالبہ کیا گیا اور دوسرے یہ بھی قرار دیا گیا کہ اگر مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات بھی تسلیم نہ کیے جائیں تو مجلسِ عاملہ حسب ذیل اشخاص کی ایک کمیٹی مرتب کرتی ہے ، تاکہ آئندہ کے لیے قومی پروگرام وضع کر کے مجلس عاملہ کو پیش کرے :۔ سر محمد اقبال رح (صدر)، مولانا مظہر الدین، مولانا حسرت موہانی، سید حبیب ، مولانا غلام رسول مہر ، حسن ریاض ، ذاکر علی (ارکان)

۱۶ اگست کو وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وار فیصلے کا اعلان کردیا جس کا اثر یہ ہوا کہ سارا سیاسی ہندوستان بحث و نزاع کا ایک ہنگامہ زار بن کر رہ گیا ۔ ۳۲ اگست کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں زیر صدارت علامہ منعقد ہوا جس میں فرقہ وار فیصلے کے متعلق ایک قرار داد منظور کی گئی ! ۲۴ اگست کو حضرت علامہ نے قرار داد کی تائید میں ایک اہم بیان صادر فرمایا جس میں فرقہ وار فیصلے پر ذیل کے اعتراضات کیے گیے تھے :

اول : پنجاب کی مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کو واضح اکثریت نہیں دی گئی حالاں کہ صوبے میں ان کی آبادی کا تناسب ۵۵ فی صدی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ سکھوں کو زائد از استحقاق نشستیں

---

* روز نامہ "انقلاب" ۱۲/۷ اگست ۱۹۳۲ء ۔

(پاسنگ) بہت زیادہ دے دی گئی ہیں۔ پھر یہ قید لگا دی گئی ہے کہ وہ بعض نشستوں کو مشترکہ انتخاب کے ذریعے سے حاصل کریں۔

دوم: بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود انہیں ۴۸.۸ نشستیں دی گئی ہیں اور مسلمانوں کی حق تلفی کر کے یورپین جماعت کو پاسنگ دے دیا گیا ہے۔

سوم: بنگال، پنجاب اور سرحد کی غیر مسلم اقلیتوں کو پاسنگ بہت زیادہ دیا گیا ہے حالاں کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت ہیں، وہاں ان کو اتنا پاسنگ نہیں دیا گیا۔

علامہ نے ان نقصانات کی تلافی کے لیے دو تجویزیں پیش کیں: اول: چوں کہ بنگال بہت بڑا صوبہ ہے اس لیے وہاں مجلسِ قانون ساز دو ایوانی ہو۔ کابینہ ان دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس کے آگے جواب دہ ہو اور بالائی ایوان میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں؛ اس طرح مسلمانوں کو بنگال میں مستحکم اکثریت حاصل ہو سکے گی۔ دوم: صوبوں کو حقیقی اختیارات زیادہ دیے جائیں اور مرکز کو صرف چند برائے نام اختیارات حاصل ہوں۔*

مسلمانوں کے لیڈروں میں جو لوگ مخلوط انتخاب کے حامی تھے، وہ ایک طرف یہ کوشش کرتے تھے کہ مسلمان جدا گانہ انتخاب کو چھوڑ کر مخلوط انتخاب منظور کر لیں اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہتے تھے کہ تم مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کر کے انہیں مطمئن کر دو تاکہ ہندو مسلم اتحاد مکمل ہو جائے۔ ان لوگوں نے فرقہ وار فیصلے کے اعلان کے بعد بھی اپنی مساعی کو ترک نہ کیا بلکہ نئے جوش کے ساتھ گفت گوئے مفاہمت میں مصروف ہو گئے۔ مولانا شوکت علی، شیخ عبدالمجید سندھی (صدر خلافت) اور مولانا ابوالکلام کچھ ابتدائی گفت گو

* بیان علامہ اقبال — روز نامہ "انقلاب" ۲۶ اگست اور "حرفِ اقبال" ۲۰۳

پنڈت مدن موہن مالوی سے کر چکے تھے؛ انھوں نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد کر کے علامہ اقبال رح کو بھی دعوت دے دی۔ علامہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس موقع پر ایسی کانفرنس کا انعقاد صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہے، اس لیے کہ اس سے وہ اتحاد خطرے میں پڑ جاتا ہے جو بڑی زحمت کے بعد مسلم جماعت میں پیدا ہوا ہے۔ مخلوطی حضرات یہ کہ رہے تھے کہ فرقہ وار فیصلے میں پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت سے جو ناانصافی کی گئی ہے، اگر ہندو لیڈر اس کی تلافی کر دیں تو مسلمان جدا گانہ انتخاب سے دست بردار ہو کر مخلوط انتخاب اختیار کر لیں۔ علامہ اقبال رح اس بنا پر گفت گو کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور فرماتے تھے کہ جب مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی قرار دادوں میں پوری مسلم قوم جدا گانہ انتخاب کے حق میں قطعی فیصلہ صادر کر چکی ہے تو اب اس مسئلے کو از سر نو چھیڑنا دانش مندی نہیں ہے۔*

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں جو کانفرنس منعقد ہوئی، اس کی قرارداد کا منشا یہ تھا کہ اگر ہندو ان تیرہ مطالبات کو قبول کر لیں جو مسلم کانفرنس نے پیش کیے تھے تو مسلمان مخلوط انتخاب کو قبول کر لیں گے۔ چوں کہ یہ موقف بالکل وہی تھا جو ابتدا میں مسلم کانفرنس نے اختیار کیا تھا اس لیے علامہ اقبال رح نے اس پر ایک بیان دیا کہ اس قرارداد سے ہمارے قوم پرست مسلم بھائی مسلم عوام کے زیادہ قریب آگئے ہیں۔ اب انھوں نے اس امر پر رضا مندی کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ انتخاب کے معاملے میں مسلم عوام کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیں گے؛ مجھے یقین ہے کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قرار دادوں سے اسی فیصلے کا اظہار ہوتا ہے۔ جس حالت میں ہندوؤں نے تیرہ مطالبات منظور نہیں کیے، انتخاب کے متعلق مسلمانوں کو کیا مشورہ دیا جا سکتا ہے؟ لیکن قوم پرست اور مخلوطی لیڈروں کی کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور ہندوؤں نے ہندو مسلم مفاہمت کی طرف کوئی قدم نہ اٹھایا۔

* اقبال کا سیاسی کارنامہ ۱۶۸/۱۶۶-

مسلمانانِ کشمیر ڈوگرا راج کے جبر و استبداد کے ماتحت انتہائی مصیبت ناک زندگی بسر کر رہے تھے اور پنجاب کے مسلمان ہمیشہ ہی ان کی حمایت میں مصروف رہتے تھے ؛ چناں چہ کشمیری مسلمانوں کی انجمن کے ساتھ علامہ اقبال کا تعلق زمانۂ طالب علمی ہی سے چلا آتا تھا اور انگلستان سے واپس آ کر تو وہ انجمنِ کشمیری مسلمانان کے سیکرٹری مقرر ہوگئے تھے ۔ ۱۹۳۰ء میں بعض تازہ شکایات کی بنا پر لاہور میں آل انڈیا کشمیر مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں حکومت کشمیر کے نظم و نسق پر نکتہ چینی کی گئی ۔ ”انقلاب“ اخبار نے کشمیریوں کے مصائب پر پے درپے مضامین شائع کیے اور بتایا کہ اس ریاست میں مسلمان اکثریت آبادی ہونے کے باوجود پرلے درجے کے مظلوم ہیں ؛ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہیں ، تعلیمی حالت سخت افسوس ناک ہے ، مذہبی آزادی نہ ہونے کے برابر ہے ، بعض مساجد پر حکومت نے قبضہ کر رکھا ہے ، گراں اور ناواجب ٹیکسوں کے بوجھ سے کشمیری مسلمان کی کمر ٹوٹی جا رہی ہے ، غرض کشمیری مسلمانوں کی زندگی کے پہلو پیش کر کے مہا راجہ کشمیر سے استدعا کی جاتی تھی کہ وہ اپنی مسلم رعایا کی طرف توجہِ خسروانہ مبذول کریں ۔ اتنے میں ریاست کے وزرا نے ”انقلاب“ کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ۔ اور ”انقلاب“ نے اس کے جواب میں کشمیری مسلمان ، مظلوم کشمیر اور مکتوبِ کشمیر کے نام سے پے درپے ہفتہ وار پرچے نکال کر ہزاروں کی تعداد میں اندرونِ کشمیر بھیجنے شروع کر دیے ۔ اسی دوران میں متعداد اشتعال انگیز واقعات کے باعث مسلمانانِ کشمیر میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا ؛ * گرفتاریاں ، مظاہرے ، فائرنگ ، تشدّد ، غرض ایک قیامت برپا ہو گئی ۔ پنجاب کے مسلمان سخت مضطرب ہوئے ۔ ایک طرف مجلسِ احرار نے داخلۂ کشمیر کے امتناعی احکام کی خلاف ورزی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور ہزار ہا

* تفصیلات کے لیے دیکھو ”سیاسی کار نامہ“ ، سرگزشت (سالک) و سوانح چودھری غلام عباس ۔

رضا کار جیلوں میں چلے گئے اور دوسری طرف مرزا بشیر الدین محمود احمد امامِ جماعتِ احمدیہ کی صدارت میں ایک کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ؛ اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانانِ کشمیر کو ان کے حقوق دلوائے جائیں ۔ جو مسلمان کشمیر کے جیل خانوں میں محبوس تھے ، ان کی قانونی امداد کے لیے علامہ اقبال رح نے بعض نہایت معزّز و مقتدر وکلا کو کشمیر روانہ کیا ۔ علامہ کے نہایت مخلصانہ تعلقات نواب حمید اللہ خاں تاج دار بھوپال سے تھے اور تاج دار بھوپال مہا راجا کشمیر کے دوست تھے ؛ علامہ نے ان کے ذریعے سے کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کشمیر نے کشمیریوں کے آئینی مطالبات کے سلسلے میں گلینسی کمیشن مقرر کیا ۔ اس وقت علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے ۔ مسلم کانفرنس کو گلینسی کمیشن کی ترکیب پر اعتراض تھا ؛ چناں چہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کے اجلاسِ عاملہ میں مسائلِ کشمیر کے متعلق ایک قرار داد منظور ہوئی جس میں بتایا گیا کہ کمیشن کے مسلمان ممبروں کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر نام زد کیا گیا ہے لہٰذا یہ کمیشن ناقابلِ قبول ہے ۔ محمد عبداللہ اور قاضی گوہر رحمان کو جیل سے رہا کر کے موقع دیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات کمیشن کے سامنے پیش کریں ۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر کے اسیرانِ بلا کی تکالیف و مصائب اور مسلم وکلا کے حدودِ ریاست سے اخراج کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا گیا ۔

علامہ اقبال رح کشمیر کمیٹی کے ذریعے سے بھی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی مسلمانانِ کشمیر کے مسائل پر اظہار خیالات فرماتے رہے اور اسیرانِ کشمیر کی رہائی پر اصرار کرتے رہے ۔ کشمیر کمیٹی اب تک کسی دستور کی تدوین کے بغیر ہی کام کر رہی تھی اور صدر (یعنی مرزا صاحب) کو غیر محدود اختیارات دیے گئے تھے لیکن جب تحریکِ کشمیر نے طول کھینچا تو خیال پیدا ہوا کہ کشمیر کمیٹی

کا ایک باضابطہ دستور تیار کیا جائے۔ اس پر احمدیوں نے مخالفت کی کیوں کہ وہ اس ترتیبِ دستور کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ہم کو اور ہمارے امام کو بے دخل کرنا مقصود ہے۔ اختلاف پیدا ہوا تو مرزا بشر الدین محمود احمد نے صدارت سے استعفا دے دیا اور علامہ اقبال ان کی جگہ عارضی طورپر صدر منتخب ہوئے۔ لیکن مرزا صاحب کے علحدہ ہو جانے سے اُن کے احباب و مریدین نے جو کمیٹی کے اصلی کارکن تھے، کشمیر کمیٹی کے کام میں دل چسپی لینا ترک کر دیا اور یہاں کوئی اور کارکن تھے ہی نہیں لہذا علامہ نے بھی کمیٹی کی صدارت سے استعفا دے دیا اور کمیٹی ہی کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

گلینسی کمیشن کی سفارشات یہ تھیں کہ کشمیر میں پوری مذہبی آزادی ہو، عبادت گاہوں کو سرکاری قبضے سے نکال کر عوام کے سپرد کر دیا جائے، تعلیم عام کی جائے، ابتدائی مدرسے زیادہ تعداد میں کھولے جائیں، مسلم مدرسین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک خاص عہدہ دار مقرر کیا جائے، تمام ملازمتوں کا باقاعدہ اشتہار دیا جائے اور ہر فرقے کو متناسب حصہ دیا جائے*؛ ان سفارشوں پر عمل ہوا۔

ریاست الور میں بھی مسلمانوں کی حالت بے حد خراب تھی؛ ۱۹۳۲ء میں ان پر بھی بڑی آفتیں نازل ہوئیں۔ انھوں نے اپنی ایک جماعت خادم المسلمین کے نام سے قائم کی تھی جو مسلمانوں کے حقوق کی حمایت کیا کرتی تھی۔ حکامِ الور نے اس انجمن کو ممنوع قرار دے دیا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا، جلوس نکالے، گولی چلی، مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں ہجرت کی، مہاجرین کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں؛ بعض مستقل شکایات یہ تھیں کہ مسجدوں پر حکومت نے قبضہ کر رکھا تھا، اُردو فارسی کی تعلیم مدرسوں میں بیس برس سے بند تھی، مذہبی تعلیم پر قیود عائد تھیں،

* گلینسی کمیشن رپورٹ اقتباس صفحہ ۵۱۔

ملازمتوں میں مسلمانوں کو بہت ہی کم حصہ دیا جاتا تھا۔ علامہ اقبال رحہ نے مسلم کانفرنس کے اجلاس ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء میں مسلمانانِ الور کی شکایات پیش کیں؛ ایک وفد مرتّب ہوا جس کے رئیس مولوی شفیع داؤدی قرار پائے۔ احکامِ الور نے وفد کو باریاب کرنے سے انکار کر دیا۔ مجلس عاملہ مسلم کانفرنس نے ۸ جون کے اجلاس میں احتجاج کیا جس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر لارڈ ولنگڈن وائسرائے کی خدمت میں یادداشت بھیجی جس میں الور کے مظالم بیان کیے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے دنیا جانتی ہے۔ مہا راجہ الور اپنی ریاست سے بے دخل کر دئے گئے*۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اس پُر آشوب زمانے میں جب مسلمانانِ ہند کی سیاست ایک انقلابی موڑ پر پہنچ گئی تھی، مسلمانانِ ہند کی رہنائی کا فرض صرف علامہ اقبال نے انجام دیا اور پورے ملک میں کوئی ایسا مسئلہ جو مسلمانوں کی حیاتِ سیاسی سے متعلق تھا، ان کی توجہ اور کوشش سے محروم نہ رہا۔ مسلم لیگ بالکل بے روح اور بے کار ہو رہی تھی۔ مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے انتشار سے تنگ آ کر انگلستان ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ خلافت کمیٹی بھی افسردہ بلکہ مردہ ہو چکی تھی۔ مخلوط انتخاب کے حامی مسلمان قوم پرست اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر گھروں میں بیٹھے ہندوؤں کی ضد اور احسان فراموشی کا مرثیہ پڑھ رہے تھے، اور اقبال رحہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی پوری سیاست کے جہاز کا ناخدا بنا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اپنی مساعی میں کامیاب ہوئے۔ جداگانہ انتخاب کی بنیاد مستحکم ہو گئی، فرقہ وار فیصلہ زیادہ تر مسلمانوں کے منشا کے مطابق صادر ہوا۔ کشمیر و الور وغیرہ کے مسائل بھی بڑی حد تک حل ہوئے اور علامہ سیاسی مصروفیتوں کی کثرت کے باوجود دوسری ثقافتی سرگرمیوں سے بھی غافل نہ رہے۔

اس ہنگامۂ سیاست کے تذکرے میں جو چند واقعات اندراج سے چھوٹ گئے ہیں، وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

* اقبال کا سیاسی کار نامہ ۱۸۵-۱۸۴۔

۱۹۳۲ء ہی میں غازی رؤف پاشا (سابق وزیر اعظم ترکیہ) ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے اور جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ دہلی میں ان کے چھ لکچر ہوئے۔ ایک لکچر کی صدارت علامہ اقبال رح نے فرمائی۔ شام کے وقت جب علامہ ڈاکٹر انصاری اور رؤف پاشا کے ساتھ جامعہ کے ہال میں داخل ہونے لگے تو غازی رؤف رک گئے اور حضرت علامہ سے کہا کہ آپ ہمارے مقتدا و پیشوا ہیں، آپ آگے چلیے۔ رؤف پاشا کی تقریر کے بعد علامہ نے بھی ایک بصیرت افروز خطبے میں ”اتحادِ اسلامی“ کے نصب العین کی اہمیت واضح کی۔

دوسرے دن پھر علامہ ہی نے صدارت کی، لوگ متوقع تھے کہ آج پھر ایک فصیح و بلیغ خطبہ سننے میں آئے گا لیکن علامہ نے صرف چند منٹ تقریر کی اور یہ لطیفہ سنا کر بیٹھ گئے:

”جنگِ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا ہوا سگار پی رہا ہے۔ اس سے بے کاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا: آج کل مجھے بالکل فرصت ہے اس لیے کہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ہے۔“

اس سے چند ماہ بعد آپ پھر جامعۂ ملیہ میں تشریف لے گئے۔ اس وقت آپ تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آ چکے تھے۔ آپ کی تقریر کا عنوان تھا ”لندن سے قرطبہ تک“۔ شام کو آپ کے اعزاز میں جو دعوت ہوئی، اس میں مولانا اسلم جیراج پوری نے علامہ کے کلام اور ان کے علم و فضل اور ان کی خدماتِ اسلامی کا ذکر نہایت شان دار الفاظ میں کیا۔ علامہ نے اپنی تقریر میں برگساں سے ملاقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ میں نے فلسفۂ اسلامی کی بعض ایسی باتیں اسے بتائیں جن سے وہ اب تک بالکل بے خبر تھا اور اس بے خبری کی وجہ سے تاریکی میں سر گرداں تھا *۔

* ”سیرت اقبال“ طاہر فاروق ۳۹-۳۰۔

علامہ کی کتاب ”جاوید نامہ“، فروری ۱۹۳۲ء کو شائع ہو گئی اور حسبِ سابق ملک کے مقتدر اخباروں نے اس پر شان دار آرا کا اظہار کیا۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاہور نے ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ”یومِ اقبال“ منایا؛ دو اجلاس ہوئے جن کی صدارت مسٹر جسٹس آغا حیدر اور ڈاکٹر ایس۔ ایس بھٹناگر نے کی۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حکیم احمد شجاع، سید محمد عبداللہ، شیخ اکبر علی ارسطو، محمد دین تاثیر، مسٹر ایم۔ اے مجید، مسٹر ممتاز حسین نے انگریزی اور اردو میں مختلف موضوعاتِ اقبال رح پر عالمانہ تقریریں کیں۔ ۷ مارچ کو لورینگ میں علامہ کو ایک دعوتِ چائے دی گئی۔ مقامی معززین کثرت سے موجود تھے۔ اس دعوت میں علامہ نے اس تحریک کی تحسین فرمائی جو مسلمان نو جوانوں میں اسلامی ادبیات، اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کی تحقیق کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

۱۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو خان ذکاءالدین خان سشن جج کے اصرار پر علامہ اقبال رح عید میلاد النبی کی تقریب میں جالندھر تشریف لے گئے، مسلمانوں نے ان کا شان دار جلوس نکالا؛ پھر ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں خان ذکاءالدین خان نے اسلام اور تصوف پر ایک مقالہ پڑھا۔ سید حبیب نے تقریر کی اور پھر علامہ نے کوئی پون گھنٹے تک حضور سرورِ کائنات صلعم کی سیرت کے متعلق حقائق و معارف کے وہ دریا بہائے کہ اہلِ جالندھر کے ایمان تازہ ہو گئے۔ تیسرے پہر علامہ کے اعزاز میں پارٹی ہوئی؛ سپاس نامہ پیش کیا گیا جس کا علامہ نے برجستہ جواب دیا؛ شام کو واپس لاہور تشریف لے گئے۔*

لندن کی ارسٹاٹ لین (ارسطاطالیسی) سوسائٹی نے علامہ سے استدعا کی کہ کسی وقت ہمارے ہاں تشریف لا کر کسی فلسفیانہ موضوع پر لکچر دیجئے۔ علامہ نے مئی ۱۹۳۲ء میں یہ لکچر ختم کیا۔ اس کا عنوان تھا

* ”انقلاب“ ۲۰ جولائی ۱۹۳۲ء۔

Is Religion Possible? † (یہ لکچر انگلستان میں دیا گیا اور چھ لکچروں میں شامل ہو کر چھپ چکا ہے) ۔

اگرچہ علامہ کی حق گوئی اور بے باکی سے حکامِ وقت بہت آزردہ تھے لیکن جب فرقہ وار فیصلے کا اعلان ہو گیا اور آل انڈیا مسلم کانفرنس اور اس کے صدرِ محترم کی ساکھ سیاسی دنیا میں بلند تر ہو گئی تو حالات کسی قدر روبراہ ہونے لگے اور جب میاں سر فضل حسین نے جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے ، تیسری گول میز کانفرنس کے ممبروں میں علامہ کا نام بھی تجویز کیا تو حکومت بادلِ ناخواستہ ہی سہی لیکن علامہ کو دعوت دینے پر آمادہ ہو گئی ؛ چناں‌چہ آپ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لاہور سے بہ عزمِ یورپ روانہ ہو گئے ۔ چوں کہ آپ کے عزمِ سفر کی اطلاع اہلِ شہر سے پوشیدہ رکھی گئی تھی ، اس لیے صرف بیس پچیس ذاتی احباب و اعزہ ریلوے سٹیشن پر موجود تھے ۔

تیسری گول میز کانفرنس کا آغاز ۱۷ نومبر کو ہونے والا تھا ، علامہ اس سے ایک ماہ قبل روانہ ہوئے ۔ مقصود یہ تھا کہ لندن پہنچنے سے پہلے ویانا ، بوداپسٹ ، برلن وغیرہ کے علمی مراکز میں بھی دو دو چار چار دن قیام کرتے جائیں ۔ فرنٹیر میل کی روانگی سے قبل علامہ نے نمائندہ اخبارات کو یہ بیان دیا :- "لندن میں گول میز کانفرنس کا اجلاس نہایت اہم ہوگا ۔ فرقہ وار فیصلے نے ہمارے راستے سے بہت سی مشکلات دور کر دی ہیں ۔ اب ہمارا فرض ہے کہ باقی فیصلہ طلب مسائل کا مناسب حل دریافت کریں ۔ میں مسلمانانِ ہند اور اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم وفد اپنی پوری قوت اسلام اور ہندوستان کی خدمت میں صرف کر دے گا ۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس حکمتِ عملی پر سختی سے کاربند رہیں جس کا اظہار مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قرار دادوں میں کیا جا چکا ہے ۔ میں اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کا یہ بیان کردہ اصول یاد دلا دوں کہ 'فاذا عزمت فتوکّل علی اللہ' *

† "مکاتیبِ اقبال" ۳۰۹-۳۰۸ * "روز نامہ انقلاب" ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء

لندن پہنچ کر علامہ اقبال رح نے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی ۔ لیکن تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر تماشائی کی حیثیت سے حصہ لیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کانفرنس میں زیادہ بحث وفاق ہند اور اس کے متعلقہ مسائل پر ہوتی رہی اور علامہ اقبال رح نے وفاق کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر ہی دیا تھا کہ :

"ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاق ہی ہو) قائم ہی نہ کی جائے بلکہ ہر صوبے کو آزاد ڈومینین بنا دیا جائے جس کا تعلق ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کے بجائے براہِ راست لندن میں وزیرِ ہند سے ہو ۔" *

علامہ کے خیال کو عام طور پر قبول نہ کیا گیا ، پھر علامہ اس وفاق کی تشکیل کے مباحثوں میں کیا حصہ لیتے ؟ البتہ بعض اہل الرائے سے پرائیویٹ ملاقاتیں کر کے اپنی اسلامی ہند والی تجویز (خطبۂ صدارت الہ آباد مسلم لیگ) کا پروپیگنڈا کرتے رہے ۔ کیمبرج کے چودھری رحمت علی نے علامہ کے اس تخیّل کو "پاکستان" کا نام دے کر ایک "پاکستان نیشنل کانگرس" کی بنیاد بھی رکھ دی تھی اور اس کے پمفلٹ تمام سیاسی حلقوں میں تقسیم کیے جا رہے تھے ۔ بعض اہلِ فکر و نظر اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے تھے ؛ چناں چہ خود علامہ نے مسٹر جناح کے نام ایک خط میں لکھا ہے : "مجھے یاد ہے انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل تمھاری ہی سکیم میں ہے لیکن اس کے بار آور ہونے میں ابھی پچیس سال کی مدت درکار ہے" (لیٹرز ٹو جناح) ۔

لندن میں ایک نیشنل لیگ قائم تھی جس کا مقصد عالمِ اسلامی میں دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا ۔ اس انجمن کی صدر مس مارگریٹ فار کوھرسن تھیں (جن کے نام علامہ کے متعدد خطوط "مکاتیبِ اقبال" میں درج ہیں) ۔ نیشنل لیگ نے بھی ایک استقبالیہ ۲۵ نومبر کو دیا جس میں متعدد مقتدر

* "پاکستان" مؤلفہ ڈاکٹر امبیدکر ۳۲۹ ۔

برطانوی ، گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور مولانا شوکت علی بھی شامل ہوئے ۔ مس فار کوہرسن کی تقریر خیر مقدم کے بعد علامہ نے گول میز کانفرنس کے مسائل پر اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ اگر برطانیہ نے ہندوستان پر اعتماد کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ پر اعتماد کر رہا ہے ۔ علامہ اقبال نے علٰحدگی سندھ کے متعلق ایک یاد داشت ۲۲ نومبر کو پارلیمنٹ کے سب ممبروں کو ارسال کی ۔ *

۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو دارالعوام انگلستان میں ایک تاریخی جلسہ ہوا جس میں علامہ اقبالؒ کا استقبال کیا گیا ، لارڈ لیمنگٹن صدر تھے ۔ علامہ نے اپنی عالمانہ تقریر میں مسلمانوں کے مطالبات کا خلاصہ یہ بیان کیا کہ مرکز میں ایک تہائی نشستیں ، بلوچستان میں اصلاحات اور صوبائی خود اختیاری ۔ ہندوستان اور ایشیا میں اسلام کی حیثیت واضح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مشرق و مغرب میں اتحاد کا قیام مسلمانوں کی تنظیم اور قوت پر منحصر ہے ۔ سر آغا خان اور دیگر مسلم ارکان وفد نے بھی تقریریں کیں ، کرنل ایپلسن ممبر پارلیمنٹ نے اظہار تشکر کے ساتھ ہی پارلیمنٹ کی طرف سے اسلامی مطالبات کی حمایت کا یقین دلایا ۔ †

تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد علامہ اقبالؒ پیرس پہنچے اور علمی حلقوں کے علاوہ برگساں سے ملاقات کی اور ان دونوں اکابرِ علم کے درمیان نہایت گہرے علمی مسائل پر مذاکرہ ہوا ۔ اس کے بعد علامہ نے ہسپانیہ کا رخ کیا ؛ میڈرڈ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے آپ سے درخواست کی کہ ''ہسپانیہ اور عالمِ اسلام کا ذہنی ارتقا'' کے عنوان پر لکچر دیجیے ۔ حضرت علامہ نے جو لکچر دیا ، وہ عام طور پر بے حد پسند کیا گیا ؛ پروفیسر آسین نے جو ''ڈیوائن کامیڈی اینڈ اسلام'' کے مصنف ہیں ، علامہ کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر دیا ۔ ‡ ہسپانیہ میں ایک عرب ریسرچ سکالر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے متعلق علامہ نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو

* روز نامہ انقلاب ۲۱ و ۲۸ نومبر ۱۹۳۲ء ۔ ‡ روزنامہ انقلاب ۲۲ دسمبر ۳۲ء ۔
† مکاتیبِ اقبال ۳۲۱/۳۲۲ ۔

ایک خط میں لکھا ہے کہ ''محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا ، وہ اس وقت فقہِ اسلامیہ پر ریسرچ کر رہے تھے ۔ نہایت نیک نوجوان ہیں ، مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ نصیر الدین طوسی پر مقالہ پڑھیں گے ۔ ان سے کہیے کہ نصیر الدین طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جس میں طوسی نے اقلیدس کے Parallel postulate ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ، بالخصوص مطالعہ کریں ۔ اس تحقیق سے ان کو معلوم ہو گا کہ مسلمان ریاضی دان قرونِ وسطیٰ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ممکن ہے مکان کے ابعاد (Dimensions) تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعددِ زمان و مکان کے قائل ہیں ۔ یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمنی کے فلسفی کانٹ نے پیدا کیا تھا لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پانچ چھ سو سال پہلے اس نکتے سے آشنا تھے ۔ عراقی کے رسالے کا قلمی نسخہ غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک رسالے کا جو خاص طور پر زمان و مکان پر ہے ، اپنے لکچروں میں ملخّص بھی دیا ہے ؛ اگر محمود خضیری بھی اس مضمون پر ریسرچ کریں تو مجھ کو یقین ہے یورپ میں نام پیدا کریں گے ۔'' *

علامہ اپنے سفر ہسپانیہ کے متعلق لکھتے ہیں ''میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا ، وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر بھی لکھی ۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی'' ۔ †

علامہ نے ایک صحبت میں اسلامی فن تعمیر کی قوت و ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا '' اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فنِ تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قویٰ

* مکاتیبِ اقبال دوم، صفحہ ۳۴۳/۳۴۴ ۔ † مکاتیب اقبال دوم، ۳۲۱ ۔

شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا ۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا ؛ "قصرِ زہرا"، دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے ، "مسجدِ قرطبہ"، مہذب دیووں کا ، مگر "**الحمرا**" محض مہذب انسانوں کا" ۔ پھر فرمایا : "میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی ، دیوار پر "ھو الغالب"، لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا یہاں تو ہر طرف خدا غالب ہے ، کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ہو ۔* علامہ نے بے اختیار چاہا کہ مسجدِ قرطبہ میں تحیۃ المسجد کےنفل ادا کریں ، اس عمارت کے نگران سے پوچھا ۔ اس نے کہا "میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں"۔ آدھر وہ پوچھنے گیا ادھر علامہ نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پہلے ادائے نماز سے فارغ ہو گئے ۔

ہسپانیہ سے علامہ اٹلی تشریف لائے ۔ یہاں بھی علمی حلقوں نے آپ کی پذیرائی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا ۔ ڈاکٹر سکارپا نے جو ہندوستان میں اطالوی سفیر رہ چکے تھے اور علامہ کے بے حد معتقد تھے ، متعدد استقبالی تقریبات کا اہتمام کیا ؛ علاوہ بریں مسولینی نے خود خواہشِ ملاقات ظاہر کرکے علامہ کو مدعو کیا اور علامہ اس سے مل کر اس کی شخصیت خصوصاً اس کی آنکھوں کی مخصوص اور بے نظیر چمک سے بے حد متاثر ہوئے۔

فروری ۳۳ء میں علامہ اقبال رح کوئی چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئے اور آتے ہی ۲۶ فروری ۳۳ء کو ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے فرمایا کہ میں گول میز کانفرنس میں صرف اس مقصد کے لیے شریک ہوا تھا کہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں مسلمان دوسری اقوام میں مدغم نہ ہونے پائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مسئلے کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی دوسری کاروائی میں حصہ نہیں لیا (ملفوظاتِ اقبال) ۔ اس کے بعد مارچ ۳۳ء میں حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان

* ملفوظاتِ اقبال، بیان پروفیسر حمید احمد خان، ۱۸۵ ۔

کے آئندہ دستور کا خاکہ قرطاسِ ابیض (وائٹ پیپر) کے نام سے شائع کر دیا۔ اس پر اربابِ سیاست نے سخت نکتہ چینی کی اور علامہ اقبال نے بھی ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو ایک بیان جاری کرکے قرطاسِ ابیض پر متعدد اعتراضات کیے * ۔ فرقہ وار مفاہمت کی کوششیں بعض حلقوں میں اب بھی جاری تھیں ۔ ان میں سے ایک پنجاب کا فارمولا بھی تھا ، جس کے تین فقرے تھے : اول ، ہندوؤں ، مسلمانوں اور سکھوں کے حق رائے دہی میں ایسی ترمیمات کی جائیں جن سے تینوں فرقوں کی آبادی ووٹروں کی تعداد میں منعکس ہو ۔ دوم ، انتخابات مخلوط ہوں اور پورے صوبے کو علاقہ وار اور آبادی کی بنا پر یک رکنی حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم کیا جائے۔ سوم ، ہر فرقے کو ایسے انتخابی حلقے دئے جائیں جن میں اس کے ووٹروں کا تناسب سب سے زیادہ ہو ۔

اس کو خود سکھوں ہی کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے رد کر دیا اور ہندو اخباروں نے بھی اس پر نکتہ چینی کی ۔ علامہ اقبال نے ۳۱ جولائی ۳۳ء کے بیان میں اس فارمولے پر تنقید کرکے اسے مضرّت رساں ثابت کیا ۔*

کانگرس نے فرقہ وار فیصلے کے متعلق نہایت مہمل رویہ اختیار کیا ۔ وہ نہ اسے علی الاعلان قبول کر سکتی تھی ، کیونکہ ہندوؤں کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا،اور نہ اس کو مسترد کر سکتی تھی ، اس لیے کہ اس کے بعد قوم پرست مسلمان بھی اس کے ساتھ نہ رہتے ۔ چناں چہ اس نے یہی قرار دیا کہ کانگرس اس فیصلے کو نہ رد کرتی ہے نہ قبول کرتی ہے۔علامہ اقبال اس پر بے حد برہم ہوئے اور انھوں نے اپنے ایک بیان میں مسلمانوں کو پُر زور مشورہ دیا کہ اگرچہ اس فیصلے میں ہمارے بعض مطالبات منظور نہیں کیے گئے ، لیکن تاہم ایک باعمل جماعت کی حیثیت سے وہ ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں کہ اس فیصلے کو جرأت کے ساتھ قبول کرلیں اور اس کی حمایت کریں ۔

ماہ ستمبر ۳۳ء میں اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہِ افغانستان کی طرف سے

* تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ۱۷۳/۱۷۵

علامہ اقبال ، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو دعوت نامہ پہنچا کہ آپ حضرات چند روز کے لئے افغانستان تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائیں اور ہماری وزارتِ معارف کو کابل میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور تعلیمات کو جدید اصول پر منظم کرنے میں مشورے دیں۔ چناں‌چہ یہ تینوں حضرات اکتوبر کے آخری ہفتے میں کابل پہنچ گئے ۔ وہاں شاہی مہمان رہے ۔ اعلیٰ حضرت نے ان کو باریابی سے مشرّف فرمایا ۔ امراء وزراء سے ملاقاتیں رہیں۔ انجمنِ ادبی کابل نے تمام اکابر ادبا و فضلائے افغانستان کے ایک شان‌دار اجتماع میں معزز مہمانوں کو سپاسنامہ دیا ۔

کوئی تین ہفتے کے قیام کے بعد علامہ اقبال غزنی اور قندھار گئے۔غزنی کے آثار میں سلطان محمود غزنوی، حکیم سنائی اور حضرت داتا گنج بخش علی ھجویری کے والدِ محترم کے مزارات پر بطور خاص فاتحہ خوانی کی ۔ پھر قندھار پہنچ کر خرقہ شریف کی زیارت کی ۔ واپسی پر علامہ نے مثنوی ''مسافر'' میں اپنے سفرِ افغانستان کے جذبات و احساسات نظم کئے ۔

۱۹ اکتوبر اور ۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو علامہ‌اقبال نے افغانستان کی ایک مجوزہ یونیورسٹی اور افغانستان کے حالات و کوائف کے متعلق نہایت حوصلہ افزا اور خیر خواہانہ بیانات شائع کیے ۔ *

اگرچہ اس زمانے میں علامہ اقبال اکثر علیل رہنے لگے تھے اور آنکھوں میں بھی موتیا اتر رہا تھا ، لیکن اس کے باوجود ان کی علمی مصروفیتوں کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ، ان سب میں زمان و مکان کے متعلق مختلف کتابوں کا سراغ لگانے کی استدعا کی ہے ۔ فلاں فلاں امام نے زمان پر کیا لکھا ہے ۔ امام رازی کی "مباحثِ شرقیہ" کہاں سے ملیگی۔ "اتقان فی ماھیۃالزمان"، "تسویلات فلسفہ" اور "شرحِ مواقف" دیکھ چکا ہوں ۔

* حرفِ اقبال ۲۲۲/۲۲۹

نورالاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان رام پور کے کتب خانے میں مل جائے گا ۔ مُلا محب اللہ بہاری کی "جوہر فرد" اگر آپ کے پاس ہو تو عاریتاً بھیج دیجئے ۔ غرض ملک بھر میں زمان و مکان کے مسائل کے متعلق اکابر اسلام کی کتابوں کا تجسّس جاری تھا اور مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ ان مسائل کے متعلق یورپ کے بڑے بڑے فضلا جس نتیجے پر آج پہنچے ہیں وہ مسلمانوں کے اکابرِ علم کو صدیوں پہلے معلوم تھا ۔ غرض علامہ کا مقصد ہر حال میں یہ ہی تھا کہ ہر شعبۂ علم میں مسلمانوں کی برتری کا سکّہ جمایا جائے ۔

نواب سر ذوالفقار علی خان علامہ اقبال کے قدیم ترین اور مخلص دوستوں میں سے تھے اور ان کے تعلقات حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ بے تکلف اور مخلصانہ تھے ۔ نواب صاحب نے اس زمانے میں علامہ کے کمالاتِ شاعری پر انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی ۔ علامہ کے حاسد ہمیشہ حکام اعلیٰ کو علامہ سے بدظن کرنے میں مصروف رہتے تھے ۔ لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں کا سدباب نواب ذوالفقار علی خان کرتے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح علامہ عدالتِ عالیہ کے جج یا کوئی اور ایسے ہی اونچے عہدہ دار بن جائیں ۔ لیکن خدا جانے کیا پیچ پڑا کہ بعض خود غرض افراد کی در اندازیوں کی وجہ سے ان دونوں دوستوں کے درمیان بعض غلط فہمیاں حائل ہو گئیں ۔ یہاں تک کہ ان دنوں ایک دفعہ علامہ شملہ گئے تو ملک فیروز خان نون کے ھاں ٹھیرے ۔ نواب صاحب کو معلوم ہوا تو روئے اور کہا کہ میرے دوست کا کسی دوسری جگہ قیام کرنا کبھی میرے تصوّر میں بھی نہیں آسکتا تھا ۔ مرزا جلال الدین دونوں کے مشترک دوست تھے ۔ انھوں نے ان کے درمیان مصالحت کرانے کا انتظام کیا اور ایک تاریخ مقرر کر کے دونوں کو دعوت چائے دے دی ۔ لیکن کرنا خدا کا کیا ہوا، اس تاریخ سے قبل نواب صاحب اچانک سخت بیمار ہوگئے اورپیشتر اس کے کہ یہ دونوں ان سے ملتے ، وہ اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے ۔

علامہ اور مرزا جلال الدین دونوں کو اس مدۃ العمر کے مخلص دوست کی وفات (اور پھر اس قدر ناگوار حالات میں) پر شدید صدمہ ہوا ۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ کم از کم نوابؒ صاحب کی نماز جنازہ میں تو شامل جائیں ۔ چناں چہ دونوں موٹر کار میں مارا مار مالیر کوٹلہ پہنچے ۔ لیکن میت اس سے قبل سپردِ خاک کی جا چکی تھی ۔ ناچار بادلِ حسرت زدہ فاتحہ پڑھ کر واپس آ گئے ۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ کو علامہ اقبال سے نہایت گہری عقیدت تھی، آن سے بطور خاص اشعار لکھوائے اور ان کے دستخط کو حرز جاں بنا کر رکھتے ۔ احمد یار خاں کی شادی میاں غیاث الدین کے والد کے ذریعے سے ہوئی تھی ۔ علامہ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خاں برات میں شریک تھے ۔ احمد یار خاں وقتاً فوقتاً علامہ کو تحائف بھیجا کرتے تھے اور بعض اوقاف بہت اچھی دودھ دینے والی گائے بھینسیں تک پیش کر دیتے تھے ۔ علامہ کو احمد یار خان کے ساتھ ان کے خلوص کی وجہ سے بے حد لگاؤ تھا ۔ یونینسٹ پارٹی کے شاکی ہونے کے باوجود اس کے مقتدر رکن یعنی احمد یار خان کو ہمیشہ محبت سے یاد کرتے تھے ۔

علامہ اقبال کچھ مسلمانوں کے انتشار کی وجہ سے اور کچھ اپنی ناسازیِ طبع کے باعث مسلم کانفرنس کی صدارت سے سبکدوش ہو چکے تھے ، اور سیاسیات سے زیادہ تر کنارہ کش ہی رہتے تھے ۔ سید سلیمان ندوی کو لکھا : ''میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بے حد درد مند ہوں ، اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کر دیا ‡ ۔ '' اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام مکتوب میں تحریر فرمایا : ''گذشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے درد مند کر دیا ہے ، اس لیے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی ۔ میں کہیں نہیں جا رہا ۔ نہ پٹنہ ، نہ کان پور '' ۔ ‡

: ملفوظاتِ اقبال" بیان مرزا جلال الدین ۱۲۹/۱۳۰ ‡ مکاتیبِ اقبال اول ۱۶۹
‡ مکاتیب اقبال اول ۹۴۳

پانچویں فصل

۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء

اسیرانِ کشمیر کی قانونی امداد

اگرچہ علامہ اقبال اس زمانے میں سیاسیات سے علی العموم کنارہ کش اور گوشہ گیر ہو رہے تھے لیکن اسیرانِ کشمیر کے مقدمات کی پیروی کے لئے اپنے وکیل دوستوں کو برابر آمادہ کر رہے تھے ۔ ملک برکت علی ایڈووکیٹ علامہ سے پورا تعاون کر رہے تھے ، لیکن چوں کہ فروری ۱۹۳۴ء میں انھیں انتخابات در پیش تھے اس لیے صوبہ بہار کے وکیل مسٹر نعیم الحق کو حضرتِ علامہ نے بعض مقدمات کی پیروی پر آمادہ کر لیا تھا ۔ شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ (صدر کشمیر کانفرنس جموں) ان تمام قانونی مساعی کے مرکز تھے اور علامہ نے مسٹر نعیم الحق کو بھی انھی کے سپرد کیا تھا ۔ جب دو مقدموں کی پیروی کا کام مسٹر نعیم الحق کو تفویض کیا جا چکا تو میر پور کے دوسرے مقدمے کے کاغذات بھی علامہ کو موصول ہو گئے ۔ وہ یہ مقدمہ بھی مسٹر نعیم الحق ہی کے سپرد کر دینا چاہتے تھے ، لیکن دفعتاً معلوم ہوا کہ اس کی پیروی چودھری ظفراللہ خاں کریں گے ۔ چوں کہ اس وقت تک علامہ کو کشمیر کمیٹی کے سلسلے میں احمدیوں سے سوءِ ظن پیدا ہو چکا تھا ، اس لئے لکھتے ہیں :

''چودھری ظفراللہ خاں کیوں کر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں ، مجھے معلوم نہیں ۔ شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں'' *

*مکاتیبِ اقبال ۴۳۵

حالاں کہ شیخ محمد عبداللہ (شیرِ کشمیر) اور دوسرے کارکنانِ کشمیر مرزا محمود احمد صاحب اور ان کے بعض کارپردازوں کے ساتھ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ روابط رکھتے تھے - اُن روابط کا کوئی تعلق عقایدِ احمدیت سے نہ تھا ، بلکہ ان کی بنا محض یہ تھی کہ مرزا صاحب کثیر الوسائل ہونے کی وجہ سے تحریکِ کشمیر کی امداد کئی پہلوؤں سے کر رہے تھے اور کارکنانِ کشمیر طبعاً ان کے ممنون تھے - چودھری ظفراللہ خاں بھی یقیناً مرزا صاحب ہی کے اشارے سے مقدمے کی پیروی کے لیے گئے ہوں گے -

علالت کا آغاز

اس میں شک نہیں کہ علامہ کی صحت مدت سے خراب چلی آ رہی تھی - پانچ سات برس پیشتر انہیں شدید دردِ گردہ کا دورہ ہوا - بعض احباب کے مشورے سے حکیم نابینا صاحب دہلوی کا علاج کرایا گیا جس سے معتدبہ فائدہ ہوا ، لیکن دو تین سال سے ان کے قواء میں نمایاں انحطاط پیدا ہو رہا تھا اور سالِ گذشتہ سے تو بینائی پر بھی اثر پڑ رہا تھا - حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی ایک آنکھ تو اسی وقت قریب قریب بیکار ہو چکی تھی جب وہ دو سال کے تھے لیکن چوں کہ دوسری آنکھ غیر معمولی طور پر قوی تھی اس لیے عمر بھر پڑھنے لکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی - اب چند ماہ سے اسی آنکھ میں موتیا اتر رہا تھا لیکن اس کے باوجود ۱۹۳۴ء ہی وہ منحوس سال تھا جس میں علامہ کی خطرناک علالت کا آغاز ہوا - ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو عیدالفطر کا دن تھا - علامہ اقبال چودھری محمد حسین ، جاوید میاں اور علی بخش کے ساتھ شاہی مسجد گئے - ایک تو اس دن یوں بھی شاید سردی تھی، اس پر علامہ محض شلوار کوٹ پہنے ہوئے تھے - نہ کوئی کمبل تھا نہ گلوبند ، موٹر کار میں جاتے آتے وقت ٹھنڈی ہوا لگی - پھر شاہی مسجد پر اتر کر دروازے سے محرابِ مسجد تک ننگے پاؤں اس فرش پر دو دفعہ چلنا پڑا جو شدتِ سردی سے برف ہو رہا تھا - غرض سردی کے اثر سے بچنے کا کوئی تردد نہ کیا گیا - واپسی پر آپ نے اپنے

والدِ مرحوم کی تقلید میں دہی ڈال کر سویاں کھائیں -

طبیعت میں بلغمیت پہلے ہی سے تھی - گلا ہمیشہ کے خراب تھا - عید کے دوسرے دن ان کو شدید نزلے کی شکایت ہو گئی ، جس کا علاج ہوتا رہا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا - علی بخش کا بیان ہے کہ "اس تکلیف کو شروع ہوئے پندرہ دن گزرے تھے کہ شب کو میری آنکھ دفعتاً کھل گئی - اس وقت کوئی دو ڈھائی بجے کا عمل ہوگا - کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب چارپائی پر بیٹھے کھانسی سے بے حال ہو رہے ہیں - صبح تک یہی حالت رہی - اب ان کے لیے مسہل تجویز کیا گیا - پھر ایسا ہوا کہ کھانسی تو جاتی رہی مگر گلا بیٹھ گیا " -

آواز بیٹھ گئی

اور یہ گلا ایسا بیٹھا کہ پے در پے یونانی ڈاکٹر اور ریڈیائی علاج ہونے کے باوجود اس میں کوئی فرق نہ آیا - انہی دنوں ڈاکٹر انصاری نے خواہش ظاہر کی کہ بہجت وہی جامعہ ملیہ میں جو لکچر دے رہے ہیں، ان کی صدارت علامہ اقبال کریں - علامہ نے علالت کا عذر کیا - سید نذیر نیازی اُن دنوں جامعہ میں تھے - جب وہ اپریل میں لاہور آئے تو:

"میں ان کے زرد زرد چہرے کو دیکھ کر گھبرا گیا - آواز نہایت کمزور تھی جیسے کوئی سرگوشیاں کرتا ہو - اُٹھنے بیٹھنے میں ضعف و نقاہت کا اظہار ہوتا تھا "

اس کے بعد نیازی صاحب نے مفصّل کیفیت دریافت کی تو علامہ نے بتایا کہ ایکس رے کیا گیا ہے - اس سے پتہ چلا ہے کہ قلب کے اوپر ایک رسولی بن رہی ہے اور ڈاکٹروں نے رائے دی کہ زندگی خطرے میں ہے - اس پر نیازی صاحب نے کہا کہ اس سے قبل دردِ گردہ کی وجہ سے آپریشن کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا - حکیم نابینا صاحب نے آپ کا نہایت معجز نما علاج کیا تھا - موجودہ علالت میں بھی ان سے کیوں

مشورہ نہ کیا جائے۔ علامہ نے نیازی صاحب کے اس خیال کو پسند کیا، اور کہا کہ آپ دہلی واپس جاتے ہی حکیم صاحب سے میری علالت کا مفصل ذکر کریں۔ چناں چہ نیازی صاحب نے ذکر کیا اور حکیم صاحب نے علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹروں نے تو ملاحظہ و معائنہ کے متعدد نظریے قائم کیے لیکن حکیم صاحب اسی رائے پر جمے رہے کہ اعصاب میں برودت ہے، قلب ضعیف ہے، جگر میں حدّت پیدا ہو گئی ہے، ہلکا سا دمہ ہے۔ بلغم کے انجماد کو ڈاکٹروں نے غلطی سے رسولی سمجھ لیا ہے۔

علامہ نے اس زمانے میں بعض احباب کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں ڈاکٹروں کے نظریے بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ مجھے لنڈن یا ویانا جانے کا مشورہ دیا جا رہا ہے، لیکن میں حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر نہیں جا سکتا۔ علاوہ بریں یورپی علاج کے لیے روپیہ کافی چاہیے۔ جون کے آغاز میں علامہ ایک دن کے لیے خود بھی دہلی گئے۔ حکیم نابینا صاحب نے ان کی حالت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ دوائیں جاری رہیں۔ علامہ کی صحت روز بروز بہتر ہو رہی تھی، اور لوگ اسے طب یونانی کا معجزہ سمجھتے تھے، لیکن آواز کی حالت بدستور تھی۔

بد پرہیزی

علامہ کو اپنی صحت پر اس قدر اعتماد پیدا ہو گیا کہ وہ روڈس لیکچرز کے لیے آکسفورڈ جانے کو تیار ہو گئے، جن کے متعلق وہ لارڈ لوتھین سے وعدہ کر چکے تھے۔ پھر جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے ان کو تشریف آوری کی دعوت دی۔ جرمنی سے اطلاع موصول ہوئی کہ ترکی کی طرف سے عنقریب دعوت آنے والی ہے۔ اگر علامہ حکیم صاحب کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرتے رہتے تو ان کی حالتِ صحت میں ترقی جاری رہتی اور ممکن تھا کہ وہ یورپ اور جنوبی افریقہ کا سفر اختیار کر سکتے، لیکن پرہیز کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے کمزور تھے۔ اس کے علاوہ دوا ہو یا غذا ایک خاص معیارِ نفاست

مد نظر تھا۔ مثلاً حکیم صاحب نے کہا کہ مغزِ عصفور یا مغزِ خرگوش مفید رہیگا، لیکن علامہ نے کہا "معاذ اللہ! مغز تو ایک طرف رہا، مجھے تو دل، کلیجی، گردے وغیرہ بھی کھانے سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔" غرض مغز کسی صورت میں استعمال ہی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ ایک خط مؤرخہ ۲۲ جون میں لکھتے ہیں:

"آواز میں کوئی فرق نہیں، بلکہ ترقیِ معکوس ہے....اس کے سبب تین ہوسکتے ھیں؛ (۱) میں نے دھی کھایا اور لسی پی۔ (۲) فالودہ پیا برف ڈال کر (۳) دوا کی خوراک بڑھ جانے سے تو ایسا نہیں ہوا؟"

سفرِ سرھند

لیکن چوں کہ عمومی صحت اچھی تھی، اس لیے شدید گرمیوں میں سرھند شریف جانے کے لیے تیار ہو گئے، کیوں کہ جب جاوید پیدا ہوا تھا، علامہ نے عہد کیا تھا کہ ذرا بڑا ہولے تو اسے حضرت کے مزار پر لے جاؤں گا۔ ۲۹ جون کو سر ھند گئے اور ۳۰ جون کو واپس آگئے۔ ۳ جولائی کے ایک خط میں لکھتے ھیں:

"مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ بڑا پاکیزہ مقام ہے۔ پانی اس کا سرد و شیریں ہے۔ سر ھند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آگیا، جس کی بنا حضرتِ عمر بن العاص نے رکھی تھی۔ اگر کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے تک بحال تھا اور موجودہ لاہور سے وسعت اور آبادی میں دگنا۔"

اس کے بعد علامہ کو یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹروں کا وہ رسولی والا نظریہ بالکل غلط ہے۔ ۵ جولائی کے خط میں لکھتے ہیں کہ.....

جاوید منزل

"کہتے ہیں کہ ٹیومر یا گروتھ کا نظریہ صحیح نہیں کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو عام صحت اس قدر اچھی نہ ہوتی، بلکہ اس سے حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی"۔

عام صحت عمدہ

اس کے بعد علامہ نے سید نذیر نیازی کو جتنے خطوط لکھے ان میں یہ لکھا کہ اگر میری آواز اصلی حالت پر عود کر آئی تو میں اس ششں ماہ بیماری کو خدا کی رحمت تصور کروں گا۔ کیوں کہ اس بیماری نے حکیم صاحب کی وہ ادویہ استعمال کرنے کا موقع پیدا کیا، جنھوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا کہ تمام عمر میری صحت کبھی ایسی اچھی نہ تھی جیسی اب ہے۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں: "ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا بدن نئے سرے سے تعمیر ہو رہا ہے، مگر تعجب ہے آواز میں کوئی تبدیلی نہیں"

حکیم نابینا صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ ہمیں سب سے پہلے علامہ کے قلب اور اعصاب کی تقویت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ صحت درست ہوگئی تو گلا خود بخود ٹھیک ہو جائے گا، لیکن اس کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔ عام لوگوں کی کیفیت سب کو معلوم ہے کہ مریض کو اپنے خاص نسخوں اور ٹوٹکوں سے پریشان کرتے ہی رہتے ہیں اور علامہ ان ٹوٹکوں کا تعاقب شروع کردیتے تھے۔ مثلاً:

"کہتے ہیں کشمیر کی پرانی گلقند اس مرض کے لیے اکسیر ہے۔"
"جراحوں کے ایک پرانے خاندان کے پاس شرطیہ لیپ ہے۔"
"مشک کا استعمال کیسا رہے گا؟"

"عراق کے ایک تُرک طبیب کے پاس شرطیہ علاج ہے۔ تمبا کو میں چرس رکھ کر کھلائی جائے۔ شکر کی بجائے گڑ استعمال کیا جائے۔ دو تین روز میں آواز صاف ہو جائے گی۔"

حکیم صاحب علامہ کی ان نئی نئی تجویزوں سے بہت پریشان ہوتے اور ان کے پاسِ خاطر سے (لیکن محض بر سبیلِ دفع الوقتی) کوئی لیپ یا آواز کشا گولیاں بھیج دیتے۔

چھوٹے چھوٹے عوارض

اُن دنوں علامہ نے ایک دو نئی شکایتیں محسوس کیں۔ وسط اگست میں ان کا سر دفعتاً چکرایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ یہ غالباً ابتدائی علامت موتیابند کی تھی۔ دونوں شانوں کے درمیان کبھی کبھی ہلکا سا درد رہنے لگا جو روغنِ اوجاع کی مالش سے دور ہو جاتا، لیکن سال چھ مہینے کے بعد اس کا دورہ ضرور ہوتا۔ کبھی کبھی دن میں ایک آدھ ہچکی آ جاتی جس نے رفتہ رفتہ ایک ہلکی سی چیخ کی صورت اختیار کرلی۔ لیکن چوں کہ عام صحت بہتر ہو رہی تھی، اس لیے علامہ ان چھوٹے چھوٹے عوارض کو وقعت نہ دیتے تھے۔

اس زمانے میں علامہ کو اپنی صحت کی طرف سے اس قدر اطمینان تھا کہ انہوں نے اپنے مشاغلِ ادبی کو ازسرِنو شروع کردیا۔ اول، سیاحتِ افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات کو "مسافر" کے عنوان سے مرتب کیا۔ بالِ جبریلؑ کے بعض اجزا ابھی نامکمل پڑے تھے، ان کی ترتیب و تکمیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ سید نذیر نیازی نے ان کے انگریزی خطبات کا ترجمہ اُردو میں کر رکھا تھا، جس کی نظرِ ثانی حضرتِ علامہ خود کرنا چاہتے تھے۔ خالص اسلامی ادبیات کی تخلیق کے لیے ایک ادارۂ نشر و اشاعت کے قیام پر بھی غور کر رہے تھے۔

جاوید منزل کی تعمیر

۱۹۳۴ء کے اواخر میں علامہ نے میوروڈ پر سات کنال کا ایک قطعۂ اراضی خریدا اور اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو سیال کوٹ سے بلوا کر اس قطعے پر کوٹھی تعمیر کرنے کا کام سپرد کیا۔ شیخ صاحب نے نہایت محنت، انہاک اور نگرانی سے یہ کوٹھی بنوائی۔ علامہ نے اس کو آغاز سے انجام تک جا کر نہیں

دیکھا۔ بس آسی دن گئے جب کوٹھی ان کو مکمل ہو گئی۔ وصیت کے متعلق علامہ اپنے رفیقِ معتمد چودھری محمد حسین کو ضروری ہدایات دے چکے تھے اور چودھری صاحب کے نام ایک مکتوب بھی لکھ چکے تھے۔ جس میں بچوں کے دیکھ بھال کے علاوہ علی بخش کے نام چند ضروری ہدایات بھی شامل تھیں۔ آخر میں مسلمانوں سے دعائے خیر کی استدعا کی تھی۔

۱۸ دسمبر کو جب حضرتِ علامہ علی گڑھ جاتے ہوئے دہلی سے گزرے اور سید نذیر نیازی ان سے اسٹیشن پر ملے تو علامہ کی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ واپسی پر انہوں نے حکیم نابینا صاحب سے ملاقات فرمائی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر ہر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا اور معمولی پرہیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی*۔

بجلی کا علاج

حضرت علامہ کو سر سید کے پوتے ڈاکٹر سر راس مسعود سے بڑی الفت تھی اور وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ علامہ بھوپال تشریف لا کر بجلی کا علاج کرائیں۔ جس کا بہترین انتظام بھوپال ہی میں ہے چناں چہ علامہ اواخر جنوری ۱۹۳۵ء میں دہلی پہنچے۔ وہاں خالدہ خانم ادیب نے جامعہ ملیہ میں ایک لکچر دیا۔ جس کی صدارت حضرت علامہ نے کی۔ اور اس کے بعد بھوپال روانہ ہو گئے۔ جہاں اوائل مارچ تک قیام رہا۔ یعنی کوئی چار ہفتے وہاں مقیم رہے علامہ بھوپال کے مناظر اور اس کی پاکیزگی ہوا کے بہت مداح اور اپنے ڈاکٹروں اور میزبانوں کی مہربانیوں کے بے حد احسان مند تھے ۵ فروری ۳۵ء کو انہوں نے سید نذیر نیازی کو لکھا کہ طبی معائنہ نہایت مکمل ہوا۔ جس سے حکیم صاحب ہی کی بہت سی باتوں کی تائید ہوئی۔ آج گیارہ بجے ماوراء بنفشی شعاعوں کا عمل شروع ہوگا۔

---

*اس فصل کی زیادہ تر معلومات سید نذیر نیازی کے رسالہ "اقبال کا مطالعہ" کے آخری باب سے ماخوذ ہیں۔

بھوپال سے واپسی پر آپ دھلی میں دو روز ٹھیرے ۔ حکیم صاحب کو نبض دکھائی اور علاج انھی کا جاری رکھا ۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ برق علاج خاصی مدت تک جاری رہے گا تو آواز پر اثر پڑے گا ۔

والدہ جاوید کا انتقال

علامہ کی بیگم یعنی والدۂ جاوید یوں تو سالہا سال سے مریض چلی آتی تھیں اور جگر و طحال کی شکایات دس سال سے تھیں، لیکن اپریل ۳۵ء میں ان کو میعادی بخار ہوا جس سے حالت بے حد اندیشناک ہو گئی ۔ آخر ۲۳ مئی کو آپ نے لکھا :

"کل شام والدۂ جاوید اس جہان سے رخصت ہو گئیں ۔ ان کے آلام و مصائب کا اور میرے اطمینانِ قلب کا خاتمہ ہوا ۔ اللہ فضل کرے ۔ ''ہر چہ از دوست می رسد نیکوست''"

والدۂ جاوید کی وفات اس اعتبار سے اور بھی زیادہ درد ناک تھی کہ انھیں میو روڈ پر اپنی نئی کوٹھی میں منتقل ہوئے ابھی تین ہی دن گزرے تھے ۔ والدۂ جاوید قبرستان بیبیاں پاکدامناں (ایمپرس روڈ، لاہور) میں دفن کی گئیں ۔ ایک اونچے ٹیلے پر ان کی پختہ قبر موجود ہے جس پر یہ قطعہ تاریخ ثبت ہے :

"یا حیّ و یا قیوم

راھی سوے فردوس ھوئی مادرِ جاوید — لالے کا خیاباں ہے مرا سینۂ پُر داغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار — اقبال نے تاریخ کہی ''سرمۂ مازاغ''
۱۳۵۴ ہجری"

بھوپال سے وظیفہ

یہ وقت علامہ پر بڑا نازک تھا ۔ چار سال سے وکالت کا سلسلہ بند تھا ۔ کسی طرف سے آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی ۔ کتابوں سے جو روپیہ وصول ہوا تھا، وہ ''جاوید منزل'' کی تعمیر پر صرف ہو چکا تھا ۔ اپنی طبیعت کئی سال سے ناساز تھی ۔ بیگم بے وقت ساتھ چھوڑ گئیں ۔ بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کا مسئلہ بظاہر

لا ینحل نظر آتا تھا ۔ اگر چاھتے تو گزشتہ چند سال کی شہرت و ناموری سے فائدہ اٹھا کر لاکھوں روپے جمع کر لیتے ۔ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتے، لیکن اس درویشِ خدامست نے کبھی دولت و جاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں روزمرہ کی معیشت تک دشوار ہو گئی ۔ اس موقع پر نواب حمیداللہ خاں والیِ بھوپال نے اپنے تعلقِ خاطر اور قدر دانیِ خدمتِ اسلامی کے باعث جیبِ خاص سے حضرتِ علامہ کا پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ حینِ حیات مقرر کر دیا ۔ مئی ھی میں بیگم کا انتقال ہوا اور اسی مہینے سے بھوپال کا وظیفہ شروع ہوا ۔

۵ جولائی کو علامہ نے پھر بھوپال کا سفر اختیار کیا تاکہ برق علاج جاری رہے ۔ سر راس مسعود اور ان کی بیگم صاحبہ علامہ کی آسائش اور خاطر داری میں انتہائی خلوص و یگانگت کا سلوک روا رکھتے تھے ۔ بھوپال سے واپسی پر علامہ بتایا کرتے تھے کہ آواز میں خفیف سی ترقی ہے ۔ اگر پانچ چھ مزید کورس علاج کے پورے ہوگئے تو آواز کھل جائے گی ۔ اب یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی ڈاکٹر جمعیت سنگھ آکر قلب اور پھیپھڑوں کا معائنہ کر جاتے ۔ حکیم نابینا کا علاج اب بھی جاری تھا ۔ لیکن علامہ ان تمام علاجوں سے بے حد اکتائے ہوئے تھے، کیوں کہ وہ کسی فوری اکسیر کے خواہاں تھے اور میڈیکل سائنس اس معاملے میں عاجز تھی ۔

پانی پت میں اقبال

اکتوبر ۳۵ء میں مولانا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب پر چوں کہ نواب صاحب بھوپال تشریف لا رہے تھے، اس لیے علامہ بھی پانی پت پہنچے اور نواب صاحب کے سامنے جلسے میں یہ چار اشعار پڑھے :

مزاجِ نافہ رامانندِ عرفِ نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حُدی را تیز تر خوانم

حمیداللہ خاں اے ملک و ملّت را فروغ از تو
ز الطاف تو موجِ لالہ خیزد از خیا بانم
طوافِ مرقدِ حالی سزد اربابِ معنی را
نوائے او بہ جاں ہا افگند شورے کہ من دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضورِ او بہم سازیم
تو بر خاکش گُہر افشاں و من برگِ گل افشانم

علامہ ہمیشہ ارادے باندھتے رہتے تھے کہ فلاں مہینے انگلستان جاؤنگا ، فلاں وقت ویانا جا کر علاج کراؤں گا۔ روڈس لکچرز بھی ہو جائیں گے اور صحت کے متعلق بھی اطمینان ہوگا۔ لیکن اس دفعہ پانی پت کا سفر کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں کسی لمبے سفر کی زحمت برداشت کرنے کی اہلیت باقی نہیں۔

ضربِ کلیم

چوں کہ برقی علاج کے لیے بھوپال جانا ضروری تھا ، اس لیے مارچ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں دھلی ہوتے ہوئے بھوپال پہنچ گئے۔ دھلی کے ہر سفر میں علامہ کے عاشقِ زار سردار صلاح الدین سلجوقی ان کو ایک دو روز کے لیے روک لیتے اور مخصوص اور خوش ذوق اصحاب کا ایک پاکیزہ حلقہ حضرت علامہ کے ارشادات اور علامہ سلجوقی کی بذلہ سنجیوں اور شعر خوانی سے بہرہ اندوز حلاوت ہوتا ۔ ۹ اپریل کو علامہ بھوپال سے واپس آگئے اور "ضرب کلیم" شائع فرمائی اور چند ہی ماہ بعد ستمبر میں "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کو مکمل کرکے شائع کردیا ۔

۱۹۳۶ء کی سردیوں میں علامہ کی طبیعت فی الجملہ بہتر تھی ۔ لیکن چارپائی سے اٹھکر دو قدم چلتے ، بلکہ غسل خانے میں اپنے ھاتھ سے اپنے بدن کو ملتے تو اتنے ہی میں ھانپنے لگتے اور سانس پھول جاتا ۔ اب حکیم نابینا صاحب کے علاوہ شفاالملک حکیم محمد حسن قریشی کا علاج یا مشورہ بھی شاملِ حال تھا اور علامہ کو ان کی علمیت اور حذاقت پر پورا اعتماد تھا ۔

علامہ اقبال ۱۹۳۶ء میں آخری دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے۔ ان کی وہ آواز بیٹھ چکی تھی ، جس کے شیریں نغمے سالہا سال تک فرزندانِ توحید کے لیے فردوس گوش رہے تھے ۔ سٹیج پر ایک کرسی بچھا کر اس پر علامہ بٹھا دیے گئے تاکہ مسلمان ان کی زیارت سے شاد کام ہوں اور علامہ کے ارشاد پر محمد صدیق اور محمد امین نے انکے وہ چند اشعار گا کر سنائے جن کا مطلع ہے :

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الاّ اللہ
خودی ہے تیغ فساں، لا الٰہ الاّ اللہ

مسلم لیگ کا اِحیا

۱۹۳۴ء تک مسلم لیگ ایک جسمِ بےروح تھی ۔ اگر ملک کی فضا میں اسلامی سیاست کا کچھ غلغلہ باقی تھا تو وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور اسکے صدر محترم کی وجہ سے تھا ۔ آخر اسی سال مسٹر محمد علی جناح اپنی خلوت انگلستان سے چار سال بعد واردِ ہندوستان ہوئے اور مسلم لیگ کی جدید ساخت پر داخت میں مصروف ہوگئے ۔ ۱۹۳۵ء میں جدید آئین نافذ ہوگیا اور انتخابات سر پر آگئے ۔ اب اگر ملک بھر میں مسلمانوں کو منظم نہ کیا جاتا تو ان مساعی کے رائیگاں ہو جانے کا خطرہ تھا جو اکابرِ ملّت سالہا سال سے مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کے لیے انجام دے رہے تھے ۔ اس لیے مسٹر جناح نے ملک بھر کا دورہ شروع کردیا ۔ لیکن اگر انہیں کچھ کامیابی ہوئی تو وہ انہی صوبوں تک محدود تھی جن میں مسلمان اقلیت تھے ۔ اکثریت کے صوبوں کی کیفیت یہ تھی کہ پنجاب میں سر فضل حسین یونینسٹ پارٹی کے استحکام کی فکر میں تھے ۔ بنگال میں مولوی فضل الحق ، آسام میں سر سعداللہ ، صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم اپنی اپنی جماعتیں لیے بیٹھے تھے ۔ علامہ پنجاب میں مسٹر جناح کے لیے کام کر رہے تھے ۔ اگر چہ اکثریت والے صوبوں کے کار کن مسٹر جناح کو بار بار یقین دلاتے تھے کہ ہم لوگ مسلمانوں کے حقوق کے معاملے میں قطعی طور پر مسلم لیگ کے ہمزبان ہیں لیکن ہمارے لیے اپنے اپنے صوبوں میں انتخابات کا میدان جیتنے کے لیے جتن ضروری ہوں گے ،

ان کی ہمیں اجازت دے دیجئیے ۔ لیکن مسٹر محمد علی جناح اور علامہ اقبال
دونوں اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ تمام مسلمانانِ ہند کا ایک ہی سیاسی
ادارہ ہونا چاہئے اور کسی قسم کی مقامی اور صوبائی وفاداریاں مستحسن
نہیں سمجھی جا سکتیں ۔

اقبال صدرِ صوبہ لیگ

مسٹر محمد علی جناح نے پنجاب میں میاں فضل حسین
کو مسلم لیگ صوبائی پالیمنٹری بورڈ بنانے کی
دعوت دی۔ لیکن چوں کہ میاں صاحب ایک غیر فرقہ وار یونینسٹ پارٹی کے لیڈر
تھے جس میں ہندو ، مسلم ، سکھ زمیندار شامل تھے اور انہیں اسی پارٹی کے
ٹکٹ پر انتخاب لڑنا تھا، لہٰذا میاں صاحب نے مسٹر جناح کی پیشکش مسترد
کر دی ۔ مسٹر جناح نے یہ کام علامہ اقبال کے سپرد کیا جو اُس زمانے میں
پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے ۔ انہوں نے اپنی علالت کے باوجود لیگ کی۔
۳۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب لیگ کونسل کا جلسہ طلب کیا جس میں علامہ
دوبارہ صدر اور خان غلام رسول خان بیرسٹر جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔
اس زمانے میں پنجاب کے دیہات اور ان کے زمیندار یونینسٹ پارٹی کے قبضے میں
تھے اور شہری مسلمان مجلسِ احرار اور مجلسِ اتحادِ ملت کے جلسوں کی زینت
ہوا کرتے تھے ۔ مسلم زیادہ تر کسی مپرسی کے عالم میں تھی ۔

خطوط بنامِ جناح

حضرت علامہ اب ضعف اور علالت کے باعث
مستقل طور پر صاحبِ فراش ہو چکے تھے ۔ بینائی
روز بروز جواب دے رہی تھی ۔ لیکن وہ دن رات پیشِ نظر مقاصد کے لیے
کوشاں رہتے تھے۔ مسٹر محمد علی جناح کے نام علامہ کے جو خطوط بہت مشہور
ہیں، اسی زمانے میں لکھے گئے تھے ۔ وہ جہاں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے
لئے شبانہ روز محنت کرتے تھے ، وہاں لیگ کو بھی عوامی جماعت بننے کی تلقین
کرتے رہتے تھے ۔ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو انہوں نے مسٹر جناح کو لکھا :

"لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑیگا کہ آیا وہ صرف
ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ جماعت بن کر رہے گی یا
ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بنے گی جنھوں نے ابھی تک معقول
وجہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شخصی طور پر میں
یقین کرتا ہوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے
لئے کوشاں نہ ہو ، عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی"*

انہوں نے مسٹر جناح کو جتنے خطوط لکھے، ان کا مفاد یہی تھا کہ مسلم
ثقافت کی برتری ثابت کیجئے۔ مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنائیے۔ مسلمانوں کے
معاشی مسائل کو حل کیجئے۔ مسلم صوبوں اور مسلم ریاستوں کے علیحدہ وفاق
کا قیام ضروری ہے ۔ ۲۱ جون کو علامہ نے مسٹر جناح کے نام ایک پُر زور
اور یادگار خط لکھا ، جس میں تحریر فرمایا :

مسٹر جناح پر اعتماد

"آج ہندوستان میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں
جس کی ذات سے مسلمان قوم اس طوفانِ بلا میں صحیح
و محفوظ رہنمائی کی توقع رکھ سکتی ہے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید ملک
کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے "*

اس خط میں ہندو اور مسلمانوں کی خانہ جنگی ، توہینِ مذہب کے واقعات
اور مسلمانوں کی لا علاج معاشی تنگ دستی کا ذکر کرنے کے بعد پھر اسی بات پر
زور دیا ہے کہ "ایک پُر امن ہندوستان حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ
لسانی، مذہبی اور نسلی میلانات کی بنا پر ملک کو ازسرِنو تقسیم کر دیا جائے"۔

شمالی مغربی ہند پر اصرار

ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ شمال مغربی
ہندوستان اور بنگال کے مسلمان کو فی الحال مسلم
اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا پڑیگا ۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت

* لیٹرز ٹو جناح

کے صوبوں کا مفاد اسی طریقۂ کار کے اختیار کرنے میں مضمر ہے ۔ اسی لئے لیگ کا آیندہ اجلاس مسلم اقلیت کے کسی صوبے میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا*۔"

۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں بھی تقسیمِ ملک پر زور دیا ہے ۔ یعنی صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال مسٹر جناح کو پاکستان کے لئے تیار کر رہے ہیں ۔ ۲۱ جون کے خط میں لکھتے ہیں :

"میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریقِ عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار اختیار کرنا ہی پڑے گا*۔"

۱۱ اگست کو پھر لکھا : "واقعات نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ لیگ کو اپنی تمام تر مساعی کو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مرتکز کر دینا چاہئے" ۔ اور

"میں مکرّر درخواست کرتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس اکتوبر کے وسط یا آخر میں لاہور میں منعقد کیا جائے ۔ پنجاب میں لیگ کے لیے روز افزوں سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور مجھے شبہ نہیں کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب اور عوام کو لیگ سے مربوط کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگا*۔"

اکثریتی صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم کی جائیں ۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی پالیسی اکثریتی صوبوں سے علیحدہ ہونی چاہیے ۔ فرقہ وار فیصلے کی شدید حمایت کی جائے ، تاکہ بعض شر پسند لوگ محض اپنے ہندو حمایتیوں کو خوش کرنے کے لیے ملّت کے مفاد کو نقصان نہ پہنچا سکیں ۔ کانگرس نے "رابطہ مسلم عوام" کی جو تحریک جاری کر رکھی

*اقبال لیٹرز ٹو جناح

ہے ، اس کا جواب دینے کے لیے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانا اور مسلمان عوام کے معاشی مسائل کو حل کرنا اشد ضروری ہے ۔ ان تمام مسائل کے متعلق علامہ نے جناح صاحب کو توجہ دلائی ۔

جیل جانے کو تیار

۷ اکتوبر کے خط میں مسئلۂ فلسطین پر ایک خط لکھا جس میں بتایا کہ رابطۂ عوام کا یہ ایک نادر موقع ہے ۔ فلسطین کے مسئلے پر لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کر کے کوئی ایسی راہ تجویز کیجئے ، جس میں عوام بہت بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں ۔ علاوہ بریں فرماتے ہیں :

"ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو، جیل جانے کے لئے تیار ہوں ۔ ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی فوجی اڈے کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے ایک خطرہ ہے ۔" (لیٹرز)

یہ تمام اقتباسات اُن خطوط سے ماخوذ ہیں ، جو علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو لکھے اور جو اُردو میں بھی اور انگریزی میں بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ واضح رہے کہ قائد اعظم بھی علامہ کی اس رہنمائی کے بے حد معترف اور مداح تھے ۔ چناں چہ انھی خطوط کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

قائدِ اعظم اور اقبال

"جون ۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے قیام سے لے کر اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لیگ کے اجلاسِ لکھنؤ تک کا زمانہ مسلم ہند کی تاریخ کا ایک پُر از واقعات زمانہ ہے ۔ اگر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا قیام مسلم لیگ کی جانب سے عوام کو ایک پرچم تلے متحد کرکے صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں حصہ لینے کی ایک عظیم کوشش تھی ، تو لکھنؤ کا اجلاس مسلم لیگ کو عوامی

بنیادوں پر منظم کر کے مسلمانانِ ہند کا واحد نمائندہ ادارہ بنانے کی طرف پہلا قدم تھا۔

یہ دونوں مقاصد اس وقت حاصل ہوئے جب مجھے سر محمد اقبال اور انہی جیسے مخلص دوستوں کی مخلصانہ کوششوں اور بے غرض سرگرمیوں کی بدولت نہایت بیش قیمت امداد حاصل ہوئی ہے"*

عوام بالکل بے خبر تھے کہ علامہ اس وقت بستر ہی پر پڑے پڑے اسلامی ہند کی کس قدر مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے۔ خود مسٹر جناح ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ مسلم لیگ کا بڑا کارنامہ تھا کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ سر محمد اقبال نے لیگ کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا تھا۔ اگرچہ آن کا یہ کارنامہ عوام کے سامنے اس وقت نہ آسکا تھا"*

یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ

علامہ اقبال کو یونینسٹ پارٹی سے سخت اختلاف تھا۔ بنائے اختلاف یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی ہندو، مسلمان، سکھ زمینداروں کی مخلوط پارٹی تھی اور اس کی وجہ سے شہری دیہاتی حلقے الگ الگ ہو گئے تھے۔ لیکن علاوہ اس طرز سیاست کے افادی پہلو کو پس پشت ڈال کر یہ مثالی عقیدہ اپنے سامنے رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت سے کوئی مفاہمت کرنے کی ضرورت نہیں اور طبقات و درجات کی تقسیم غیر اسلامی ہے۔ چناں چہ انہوں نے ۱۹۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کے موقع پر سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اور شہری و دیہاتی کی تفریق کے خلاف نہایت زور دار تقریر کی اور نجی محفلوں میں بھی ہر قسم اور ہر درجے اور ہر عقیدے کے مسلمانوں کو

*دیباچہ لیٹرز ٹو جناح

یونینسٹ پارٹی کی مضرتوں کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں میاں فضل حسین کا انتقال ہوگیا لیکن یونینسٹ پارٹی کے قدم نہایت مضبوط و مستحکم تھے۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں پونے دو سو نشستوں میں سے صرف چھ سات نشستوں کے لئے مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے، جن میں سے صرف دو یعنی ملک برکت علی اور راجا غضنفر علی خان کامیاب ہوئے۔ راجا صاحب تو دوسرے ہی دن یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو کر پارلیمنٹری سیکرٹری بن گئے اور ملک برکت علی پوری اسمبلی میں تن تنہا مسلم لیگی باقی رہ گئے۔

لیکن ایک طرف تو سب کے سب یونینسٹ اپنے آپ کو بڑے زور شور سے قدیم مسلم لیگی کہتے تھے اور دوسری طرف مسلم لیگ کا اثر و نفوذ بھی عوام میں روز بروز بڑھ رہا تھا۔ اس لیے ہر حلقے سے کوشش جاری تھی کہ لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان کوئی مفاہمت ہو جائے۔ چنانچہ میاں احمد یار خان دولتانہ نے ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی طرف سے مفاہمت کا یہ فارمولا پیش کیا کہ:

ان تمام امور میں جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک آل انڈیا اقلیت کے متعلق ہیں، وہ لیگ کے فیصلے کے پابند ہونگے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم پارٹی کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کرینگے۔

بشرطیکہ صوبائی مسلم لیگ بھی یہ اعلان کرے کہ وہ مسلم ارکان اسمبلی جو لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی میں پہنچے ہیں، اس پارٹی سے موالات کرینگے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو"*

چونکہ اگست ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح نے بنگال مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ اور مولوی فضل الحق کی پرجا پارٹی (غیر فرقہ وار) کے درمیان مفاہمت کرادی تھی، اس لیے علامہ اقبال بے حد آرزومند تھے اور انہیں یقین بھی تھا کہ

* سیاسی کارنامہ

مسٹر جناح کوشش کریں گے تو مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان بھی کوئی مصالحت کی راہ نکل آئے گی ۔ لیکن ان کی یہ امید اور سعی کامیاب نہ ہوئی ۔

لکھنؤ میں لیگ کا اجلاس

۱۹۳۷ء میں کانگرس کی وزارتیں چھ صوبوں میں قائم ہو گئیں ۔ ان صوبوں کے مسلمانوں کو سخت شکایات پیدا ہوئیں ۔ پھر کانگرس رابطہ عامہ مسلمین کے سلسلے میں بھی بعض بے اعتدالیاں کر رہی تھی لہٰذا مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی ، یہاں تک کہ کمال کو پہنچ گئی ۔ اکتوبر ۳۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا ، جس میں تمام وہ مسلم جماعتیں بھی ، جو مسلم لیگ کے انضباط سے باہر تھیں ، شامل ہوئیں ۔ لاہور سے سرسکندرحیات‌خان اور کلکتہ سے مولوی فضل الحق وہاں پہنچ گئے اور مسلم لیگ اور اس کے قائداعظم محمد علی جناح کے اقتدار کا آفتاب نصف النہار کو پہنچ گیا ۔

میثاقِ جناح و سکندر

یہاں سر سکندر اور مسٹر جناح کے درمیان ایک میثاق قرار پایا جس کے متعلق سر سکندر نے برسرِ اجلاس ایک بیان پڑھ کر سنایا۔خلاصہ ملاحظہ ہو :

(۱) سر سکندر اپنی پارٹی کےتمام مسلم ممبروں کو جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں ، مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کے مسلک پر دستخط کر دیں ۔ اس کے بعد وہ ان تمام قواعد و ضوابط کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوں گے ، جو آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈ نے نافذ کر رکھے ہیں ۔ مگر اس سے موجودہ یونینسٹ پارٹی کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے گا ۔

(۲) اس میثاق کے بعد آئندہ تمام انتخابات اور ضمنی انتخابات جو اسمبلی کےلیے ہوں گے، ان میں تمام گروپ اس شخص کی متحدہ مدد کریں گے ، جس کو پارٹی نے کھڑا کیا ہو ۔

(۳) اسمبلی کے جو مسلم ممبر لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہوں ، یا جنھوں نے لیگ کے ٹکٹ پر دستخط کر کے اس میں شمولیت کی ہو ، ان کی اسمبلی میں ایک علیحدہ پارٹی ہوگی ، جو مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی ۔ مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہو گی کہ وہ کسی دوسری پارٹی سے مل کر کام کرنا چاہے تو کر سکے ، بشرطیکہ اس پارٹی کا پروگرام اور اصول لیگ سے مختلف نہ ہوں ۔*

لکھنؤ سے واپس آکر سر سکندر نے اخباروں میں یہ بیان شائع کیا :

کشمکش جاری

"جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے ، سابقہ صورتِ حالات ہنوز قائم و بحال ہے ۔ البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے ان مسلم ارکان کو،جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں ، مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی کہ آئندہ ضمنی انتخاب میں جو مسلم ارکان لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے انہیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ کامیابی پر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے ۔ اس کے عوض انتخابی جنگ میں انہیں یونینسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہو گی ۔"†

اس پر علامہ اقبال بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے : سر سکندر کے اس بیان کا مطلب تو یہ ہوا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں بلکہ وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ ہے ۔ آپ کے اشارے سے

---

* سیاسیات ملیہ ۔ محمد امین زبیری ۳۳۲/۳۳۳
† "امروز" کراچی اقبال نمبر ۱۹۵۰ء

غلام رسول خان سکرٹری پنجاب مسلم لیگ نے ایک بیان شائع کرکے گویا
سر سکندر کو جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی ممبری کے
نوے فارم سر سکندر کی خدمت میں بھیج کر لکھا کہ آپ نے اس میثاق
میں یہ ذمہ لیا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان کو لیگ کا ممبر بن جانے
کا مشورہ دیں گے ، لہٰذا اب ان سب سے ان فارموں پر دستخط کرا دیجیے ۔
لیکن یہ فارم دستخط شدہ واپس نہ آئے ۔ اس پر علامہ نے پھر مسٹر جناح کو
خط لکھا جس میں سر سکندر اور ان کے رفیقوں کی شکایت کی ۔

یہ جھگڑا سر سکندر اور علامہ اقبال کے درمیان جاری رہا ۔ ۳۱ اکتوبر
۱۹۳۷ء کو سر سکندر نے اپنے چند رفقا کو ساتھ لے کر علامہ سے ملاقات کی اور
''سکندر ۔ جناح میثاق'' کے منشا اور لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے تعلقات کی
نوعیت کے متعلق گفت گو بھی ہوئی ۔ سر سکندر چاہتے تھے کہ مسلم لیگ
پر یونینسٹ پارٹی کو ، جو حکمران پارٹی تھی ، برتری حاصل رہے اور
علامہ کا منشا یہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کو ہرگز یہ موقع نہ دیا جائے کہ
وہ مسلم لیگ پر قبضہ کرکے اسے عملاً ختم کر دے ۔ آخر علامہ اقبال نے
فیصلہ کر لیا کہ اس میثاق ہی کو ختم کر دیا جائے تاکہ یونینسٹ پارٹی
کا سیاسیات میں کوئی دخل ہی باقی نہ رہے اور لیگ ایک آزاد و زندہ قومی
ادارہ بن جائے ۔

شہید گنج

مسجد شہید گنج کا انہدام ، حکومت کا تشدد ،
مسجد کی بازیابی کے لیے سول نافرمانی اور اس کے
بعد عدالتِ عالیہ کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف صادر ہونا ، علامہ اقبال کے لیے
نہایت قلق کا باعث تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ مسجد کی بازیابی کے لئے تمام
مسلمانانِ ہند مل کر کوشش کریں اور آل انڈیا مسلم لیگ اس معاملے میں
ان کی رہنمائی کرے ۔ بلکہ ''ایک روز انھوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ

'اگر آل انڈیا مسلم لیگ مسجد کی بازیابی کے لیے ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ
کرے گی تو میں سب سے پہلے اپنی جان قربان کردوں گا۔'' * اس دوران
میں علامہ نے ملک برکت علی کو مساجد و معابد کی حفاظت اور بالخصوص مسجد
شہید گنج کی واپسی کے لیے ایک مسودۂ قانون تیار کرنے کا حکم دیا ۔
چناں چہ مسودہ تیار ہوا اور اس کو پنجاب اسمبلی میں پیش کرنے کا
نوٹس بھی دے دیا گیا ۔ دوسری طرف علامہ آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ
ترغیب دے رہے تھے کہ وہ اپنا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کرے ۔
لیکن ان دونوں باتوں میں علامہ کو ناکامی ہوئی اس لیے کہ سر سکندر
حیات خان حتی الوسع صوبے کو فرقہ وار کشیدگی کے مزید مظاہر سے محفوظ
رکھنا چاہتے تھے ۔ ملک برکت علی کا بل فی الحال التوا میں ڈال دیا گیا
اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ہائی کمان کو سر سکندر نے اس امر کا قائل
کر لیا کہ موجودہ فضا میں لیگ کا جلسہ لاہور میں نہ ہونا چاہیے ۔
چناں چہ ہائی کمان نے مقامِ اجلاس کلکتہ قرار دیا جہاں شہید گنج کی
کوئی گونج تک سنائی نہ دے ۔

یونینسٹ پارٹی

اس میں شک نہیں کہ یونینسٹ پارٹی ، جس کو
میاں سر فضل حسین نے ۱۹۱۹ء میں قائم کیا
تھا اور جس کے سردار میاں صاحب کے انتقال کے بعد سر سکندر حیات تھے ، پنجاب
کی بہترین سیاسی پارٹی تھی ، جس میں زراعت پیشہ مسلمان ، زراعت پیشہ ہندو ،
زراعت پیشہ سکھ اور دوسرے حضرات بھی شامل تھے اور پارٹی کی تنظیم
خالص اقتصادی بنیاد پر کی گئی تھی ۔ اس پارٹی کا مدِ مقابل شہری ہندو
ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ تھا ۔ چونکہ پنجاب میں زراعت پیشہ
آبادی کی اکثریت مسلمان تھی اس لیے پارٹی جو بھی کارہائے فلاح انجام دیتی
تھی ، ان کا سب سے زیادہ فائدہ مسلمانوں کو حاصل ہوتا تھا اور غیر مسلم
زراعت پیشہ طبقوں کو کوئی شکایت بھی پیدا نہ ہوتی تھی ۔ دنیا جانتی ہے
کہ اس پارٹی نے سر سکندر کی رہنمائی میں جنگ یورپ دوم سے قبل متعدد

* ''امروز'' کا اقبال نمبر ۱۹۵۰ء

ایسے قوانین نافذ کرائے جن سے پنجاب میں ساہوکارہ نابود ہوگیا ۔ مدت دراز کی مرہونہ زمینیں واگذار ہو گئیں ۔ دیہاتی قرضے کا قلع قمع ہو گیا ۔ اگر جنگ عظیم بیچ میں حائل نہ ہوگئی ہوتی تو خدا جانے یونینسٹ پارٹی کے ہاتھوں چند ہی سال کے اندر صوبے کی معاشی و اقتصادی حالت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ہو گیا ہوتا ۔

علامہ اقبال بھی پارٹی کے ان کارناموں کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے اور اکثر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان مفاہمت کے لیے انتہائی اضطراب ظاہر کیا کرتے تھے ۔ لیکن چوں کہ اصول کا معاملہ تھا ، اس لیے وہ آخر تک اپنے آپ کو یونینسٹ پارٹی کی پالیسی سے راضی نہ کرسکے ۔ کیوں کہ یہ پارٹی غیر فرقہ وار تھی اور اقبال کا نصب العین مسلمانوں کی مستقل حیاتِ ملّی کی تنظیم تھا ۔

آخری بیان

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ اس سلسلے میں جو آخری تحریر علامہ اقبال کے قلم سے صادر ہوئی اور جس میں انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے خلاف شکایات یک جا کر کے یہ تجویز کی تھی کہ میثاق کو کالعدم سمجھا جائے ، وہ ایک بیان تھا ، جو انہوں نے غلام رسول خان بیرسٹر سکریٹری صوبہ مسلم لیگ سے ۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو یعنی موت سے ۱۷ دن پہلے لکھوایا ۔ یہ بیان مسٹر جناح کو بھیجا گیا تو انہوں نے بذریعہ تار خواہش ظاہر کی کہ اس کی اشاعت ملتوی کر دی جائے ۔ چناں چہ یہ بیان کسی اخبار کو بھی نہیں دیا جا سکا ۔ *

یہ چیز علامہ کے لیے بہت مایوس کن تھی اور دوسرا صدمہ یہ ہوا کہ ۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر سے پنجاب مسلم لیگ کو یہ اطلاع دی گئی کہ اس کا الحاق آل انڈیا لیگ سے نہیں ہوسکتا ۔ علامہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور اپنے بستر مرگ ہی پر پڑے پڑے مسلم لیگیوں

* "امروز" کا اقبال نمبر ۵۰ء و "اقبال کا سیاسی کارنامہ" ۲۳۵/۲۳۳

کا ایک وفد مرتب کر کے کلکتہ بھیجا ۔ تاکہ ہائی کمان کو پنجاب کے حالات سے مطلع کرے اور یونینسٹوں کے دامِ فریب میں نہ پھنسنے دے ۔

یہ وفد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ سے لاہور روانہ ہوا ۔ اسی دن علامہ اقبال رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے ۔ یعنی آخری دم تک اسلام کا یہ شہسوار اشہبِ عمل کی پشت سے نہیں اترا اور خانۂ زین ہی میں شہادت کی نعمت سے سرفراز ہوا ۔

اقبال اور احمدیت

۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خان اور مجلس احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا ۔ صوبے کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے عالی شان جلسے منعقد ہوئے ، جلوس نکالے گئے ۔ اخباروں نے بالخصوص "زمیندار" نے اپنے صفحوں کے صفحے احمدیت کی مخالفت میں سیاہ کر دئے ۔ عامۃالمسلمین کا قول یہ تھا کہ حضور سرور کائنات صلعم کے بعد مدعیِ نبوت کافرِ مطلق ہے اور جو لوگ حضور صلعم کے بعد کسی کو نبی مانتے ہیں ، وہ گویا رسالتِ محمدیہ صلعم کے منکر ہیں لہٰذا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں ۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو مسلمانوں کی فہرستِ رائے دہندگان سے حذف کر دیا جائے اور ان کو ہندوؤں ، اچھوتوں اور عیسائیوں کی طرح ایک علیحدہ اقلّیت قرار دیا جائے ۔

خدا جانے علامہ اقبال نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے ۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کیے اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرلے ۔ "سن رائیز" اور "لائٹ" انگریزی کے دو ہفتہ وار پرچے احمدیوں کے زیر ادارت نکلتے تھے ۔ انہوں نے کچھ لکھا تو علامہ نے ان کا بھی جواب دیا ۔ پھر "سٹیٹسمین" (۱۰ جون ۱۹۳۵ء) میں اسی مسئلے کے متعلق ایک مفصل جوابی مضمون لکھا ۔

جواھر لال نہرو سے جھڑپ

اس پر خدا جانے پنڈت جواہر لال نہرو کو کیا سوجھی ۔ انھوں نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں تین مضامین ''مسلمان اور احمدیت'' کے موضوع پر گھسیٹ ڈالے ۔ چوں کہ ان مضامین میں بے خبری اور جہالت فقرے فقرے سے ظاہر تھی اور اصل مقصد محض فتنہ خیزی اور افتراق انگیزی تھا، اس لیے علامہ اقبال نے پنڈت جی کے جواب میں ایک جامع مانع مضمون لکھا ، جس میں اس مسئلے کا فلسفیانہ تجزیہ کر کے نہایت فاضلانہ انداز میں پنڈت نہرو کے ایک ایک فقرے کا جواب دیا ۔ اس کے بعد پنڈت جی خاموش ہو گئے ۔* ان مضامین کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے انتہائی اشتعال اور ناراضی کی حالت میں بھی بانیِ احمدیت ، امام جماعت احمدیہ اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا ۔ بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان تحریروں میں علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کیے ہیں جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا ۔

تصنیفی منصوبے

علامہ اقبال کے ہم صحبت نیاز مندوں کو معلوم ہے کہ حضرت ممدوح کے ذہن میں بعض نہایت مفید تصنیفات کے خاکے اور بعض تنظیمی و اصلاحی اداروں کے منصوبے موجود تھے جن کو وہ اپنی زندگی میں معرضِ شہود میں نہ لاسکے ۔ لیکن اُن کی تڑپ علامہ کے قلب میں مرتے دم تک رہی ۔ مثلاً :

وہ جوانی ہی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے آج کل کے زمانے میں کامیاب اور آبرو مند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانۂ حال کے ''جورس پروڈنس'' یعنی اصولِ قانون کی روشنی میں شرحِ اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں ۔

* احمدیت کے متعلق تمام تحریروں کے لیے دیکھو ''خطبات و تقاریر اقبال'' صفحہ ۱۱۹ سے

اور دلیل و برہان سے اصولِ فقہِ اسلامی کی برتری آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے ۔ مجوزہ کتاب کا نام تھا ''Construction of Islamic Jurisprudence''

انھوں نے بارہا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے جس کا نام ہوگا ''Islam As I Understand It'' (یعنی اسلام میرے نقطۂ نظر سے) جس میں اسلام پر ایک جدید تعلیم یافتہ سائنس دان اور فلسفی کے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی جائے گی اور ایسی زبان اختیار کی جائے گی جسے زمانۂ حال کے علمی حلقے سمجھتے ہیں ۔

اواخر حیات میں قریب قریب ہر روز یہی ذکر رہتا تھا کہ میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤں گا جس کا منشا یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعۂ قرآن کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیاتِ اسلامی کے متعلق قائم کر رکھے ہیں ، وہ سب کے سب خاک میں مل جائیں ۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی Aids to the Study of Quran بتایا کرتے تھے ۔

ایک دفعہ یہ ارادہ ہوا تھا کہ جس طرح نیٹشے نے Thus Spake Zarathustra (زردشت نے یوں کہا) لکھ کر بعض حقائق کو نہایت دلآویز پیرائے میں ظاہر کیا ہے ، اسی طرح علامہ بھی ایک کتاب لکھیں ۔ The Book of an Unknown Prophet ''ایک گمنام نبی کی کتاب'' ۔ منشا یہ تھا کہ بعض ما بعدالطبیعی اور طبیعی حقائق و معارف بائبل کے طرز پر لکھے جائیں ۔ علامہ اس کے لئے نثر کا ادبی اسلوب سوچ رہے تھے ۔

ایک علمی اسلامی ادارہ

مدتِ دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی و دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کیے جائیں اور ان ماہرین کو خورد و نوش کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا جائے ، تاکہ وہ ایک گوشے میں

بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام ، تاریخِ اسلام ، تمدنِ اسلام، ثقافتِ اسلامی اور شرعِ اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں جو آج کل کی دنیائے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں ۔ چناں چہ ایک دفعہ مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ذکر آیا تو انھوں نے ریاست بھاول پور میں سرکارِ بھاول پور کے زیرِ سر پرستی اس قسم کے ادارے کے قیام کا سرو سامان درست کیا ۔ لیکن ریاستوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ معاملہ جو تعویق میں پڑا تو پھر اس کا کوئی سراغ ہی نہ ملا ۔

آخر ۱۹۳۷ء میں ایک دین دار ، مخلص ، صاحبِ ایثار بزرگ چودھری نیاز علی خان علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ یہ پٹھان کوٹ (ضلع گورداس پور) کے رہنے والے تھے اور پٹھان کوٹ سے کوئی ایک دو میل دور ان کی زرعی اراضی موجود تھی ۔ چودھری صاحب نے علامہ کی خدمت میں گزارش کی کہ میں نے ایک بہت بڑا قطعۂ اراضی آپ کے مجوزہ ادارے (دارالسلام) کے لیے وقف کر دیا ہے ، تاکہ اس پر کتب خانہ ، دارالمطالعہ ، مکانات برائے مصنفین اور دوسرے ضروری مساکن تعمیر کر دیئے جائیں ۔ جتنے علما و مصنفین اس ادارے میں رہ کر علومِ اسلامی کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں گے، میری جائداد زرعی کی آمدنی ان سب کی معاش کی کفیل ہوگی ۔ وہ ہر طرف سے بے فکر ہو کر امن و سکون کی فضا میں اپنا کام انجام دے سکیں گے ۔ حضرت علامہ چودھری نیاز علی خاں کی اس روشن خیالی اور دین پروری سے بے حد خوش ہوئے اور انھیں ''دارالسلام'' میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آ گئی ۔

شیخِ ازہر کے نام خط

اس موقع پر علامہ نے علامہ مصطفیٰ مراغی شیخِ جامعۂ ازہر کو ایک خط لکھا :

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی ۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو

دوسرے دینی واسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علومِ دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں ۔یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت میں وقف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم ان کے لیے تہذیب حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک کونے میں ہاسٹل بنانا چاہتے ہیں جو ان کے لیے ایک علمی اسلامی مرکز ہو اور ہم ان کے لیے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں ، جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتابیں موجود ہوں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایسا معلّم مقرر کرنا چاہتے ہیں جو کامل اور صالح ہو اور قرآن کریم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو، اور نیز انقلابِ دورِ حاضر سے بھی واقف ہو تاکہ وہ ان کو کتاب اور سنّتِ رسول اللہ صلعم کی روح سے واقف کرے اور تفکّرِ اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ ، حکمت ، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدن اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں ۔ اس تجویز کی اہمیت آپ پر منکشف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ خود اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں لہٰذا میری تمنا ہے کہ آپ از راہِ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں . . . . . .''*
(اصل خط عربی میں لکھا گیا تھا)

یہی وہ دارالسلام ہے جہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقا سکونت گزیں ہوگئے تھے اور وہیں سے رسالہ ''ترجمان القرآن'' شائع ہوئے

*مکاتیب اقبال اول ۲۵۱/۲۵۲ ۔

لگا تھا ۔ لیکن تقسیم کے بعد نہ وہ پٹھان کوٹ رہا ، نہ دارالسلام اور نہ چودھری نیاز علی خان ۔ رہے نام اللہ کا !

لاہور میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ علامہ اقبال کی اسی خواہش کو عملی صورت دینے کے لئے قائم ہے ، جس میں علومِ جدیدہ و قدیمہ کے ماہرین دین اسلام اور ثقافتِ اسلامی کی خدمت میں مصروف ہیں اور ادارہ اپنے وسائل کے مطابق علامہ کے منشا کی تعمیل کر رہا ہے ۔ وسائل میں اضافہ ہونے سے اس کے علمی و ثقافتی کارناموں میں بھی گراں قدر اضافہ ہونے کی توقعات ہیں ۔

۱۹۳۷ء میں علامہ کی آنکھ میں موتیا اس قدر اتر آیا کہ لکھنا پڑھنا بالکل ہی ممنوع ہوگیا ۔ میاں محمد شفیع (جرنلسٹ) علی العموم علامہ کی صحبت میں رہتے تھے ۔ وہی اخبارات پڑھ کر سناتے تھے اور وہی خطوط کے جواب لکھ دیا کرتے تھے ۔ میاں صاحب نے علامہ کے اواخر ایام میں جس خلوص سے ان کی خدمت کی ، وہ عدیم المثال ہے ۔

مسعود کا انتقال

دوست قدیم نواب ذوالفقار علی خان اور ہمدم و دمساز رفیقۂ حیات (والدۂ جاوید) کی موت نے علامہ کو اس عالمِ ضعف و علالت میں بے حد روحانی صدمہ پہنچایا ۔ لیکن ابھی ایک اور جانکاہ حادثہ باقی تھا ۔ سید راس مسعود جن سے علامہ کے قلبی و روحانی تعلقات تھے اور جنھوں نے علامہ کی خاطر داری اور خدمت و تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ، اواخر جولائی ۱۹۳۷ء میں دفعتاً انتقال کر گئے ۔ علامہ نے یکم اگست ۱۹۳۷ء کو لیڈی مسعود کے نام تعزیت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے وفورِ اضطراب نمایاں ہے ۔ اس موقع پر مسعود کے مرثیہ کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی — وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی — وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ہے اہلِ جہاں کی بے دردی — فغانِ مرغِ سحرخواں کو جانتے ہیں سرود

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمّائے موت کی ہے کشود
"دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است" (سعدی)

علی گڑھ یونیورسٹی نے تو کئی سال پہلے علامہ کو ڈاکٹریٹ پیش کردی تھی ۔ ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی جوبلی کی تقریب میں علامہ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی اور علامہ کو الہ آباد تک تکلیف فرمانے کی زحمت بھی نہ دی ۔

انجمن حمایتِ اسلام کی صدارت سے علامہ نے استعفا دے دیا ، کیوں کہ مسلسل علالت کی وجہ سے کام نہ کرسکتے تھے ۔ چناں چہ ان کی جگہ خان بہادر نواب مظفر علی خان صدر منتخب ہوئے ۔

بچوں کی تربیت

۱۹۳۷ء میں علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن اہلیہ کی بہن جو جرمن خاتون ہونے کے باوجود اسلامی معاشرت سے بھی واقف تھی اور اردو بھی بول لیتی تھی ، جاوید اور منیرہ کی گورنس مقرر کی گئی ۔ اُس وقت جاوید کی عمر قریباً تیرہ سال اور منیرہ کی قریباً سات سال ہوگی ۔ یہ خاتون علامہ کے انتظامِ خانہ داری اور تربیتِ اطفال میں بے حد خوش سلیقہ اور منتظم ثابت ہوئیں ۔*

اسی سال علامہ نے منشی طاہرالدین ، چودھری محمد حسین ، میاں امیرالدین اور اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو بچوں کا سرپرستِ قانونی مقرر کیا ۔ اس سے پیشتر ۱۹۳۵ء کی وصیت کے مطابق میاں امیرالدین کی جگہ جاوید کے ماموں خواجہ عبدالغنی مقرر کیے گئے تھے ، لیکن ان کا انتقال ہو گیا تو میاں امیرالدین (بارود خانہ) مقرر کیے گئے ۔ * اب چودھری محمد حسین اور منشی طاہرالدین بھی انتقال کر چکے ہیں ۔

---

* مکاتیبِ اقبال اول ۳۸۵-۳۸۶

مولانا حسین احمد مدنی

۱۹۳۸ء کے آغاز میں کہیں مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تقریر میں کہہ دیا کہ ''اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں''۔ اس کی تفصیل جو یو۔ پی کے بعض اخباروں میں شائع ہوئی، اس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ مولاناؒ نے مسلمانوں کو جدید نظریۂ وطنیت کرنے کا مشورہ دیا ہے جس میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ چوں کہ علامہ اقبال عمر بھر وطنیت کے اس تصوّر کے خلاف جہاد کرتے رہے، اس لیے انہیں مولانا حسین احمد کے فقرے سے بے حد صدمہ ہوا اور انھوں نے وہ تین اشعار لکھ دیے جو زبان زدِ عام ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب مولانا حسین احمد نے ایک اخباری مضمون میں اپنا موقف واضح کر دیا تو علامہ نے بھی اس ضرر کی تلافی کردی، جو ان کے طنز سے بعض قلوب کو پہنچ گیا تھا۔ ۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو آپ نے لکھا:

"مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا، لہٰذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔

میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں مجھے گالیاں دیں۔ خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیتِ دینی کے احترام میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔"*

* روزنامہ احسان ۲۸ مارچ ۳۸ء

تیسرا باب

مرض الموت اور انتقال

مسلمانوں کی سیاسیات سے حضرتِ علامہ کے شغف کا حال تو معلوم ہو چکا کہ وہ آخری دم تک اپنے نظریات کے مطابق خدمت میں مصروف رہے۔ فکرِ شعر کی کیفیت یہ تھی کہ آخری ایک دو سال ''ارمغانِ حجاز'' کی ترتیب میں بسر ہوئے اور چودھری محمد حسین اور سید نذیر نیازی مختلف نظموں اور رباعیوں کو حضرت کی صوابدید کے مطابق مرتّب کرتے رہے۔ آپ حجاز جانے کا عزمِ مصمّم کر چکے تھے اور اس سفر کے لیے بعض جہاز راں کمپنیوں سے خط و کتابت بھی ہو چکی تھی، بلکہ ایک دن راقم الحروف کو بتایا کہ جب مسولینی کو میرے عزمِ حجاز کا علم ہوا تو اس نے اپنے کارکنوں کو حکم دے دیا کہ اقبال جب بحیرۂ احمر میں داخل ہوں، تو بندرگاہ مصوع پر انہیں اطالیہ کی طرف سے ایک شان دار استقبالیہ دیا جائے۔ ارمغانِ حجاز کی متعدد نظموں اور رباعیوں سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اپنے تصور میں حجاز کا سفر کر رہے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اصلی سفر نامۂ حجاز تو وہ ہوگا جو حجاز سے واپسی پر لکھا جائے گا۔ سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ* اس سلسلے میں آخری اردو نظم جو کہی گئی، اس کی تاریخ ۷ فروری ۱۹۳۸ء ہے۔ یہ چھ شعر کا ایک مختصر قطعہ ہے جس کا موضوع ہے "حضرتِ انسان"۔

اگرچہ علامہ کی علالت کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے جاری تھا لیکن جب ۱۹۳۸ء کا آغاز ہوا اور آل انڈیا پیمانے پر پہلا یومِ اقبال نہایت کامیابی سے

* اقبال کا مطالعہ سید نذیر نیازی ۱۳۹۔

منایا جا چکا ، تو علامہ کی علالت نے یک بیک ایک نیا پلٹا کھایا ۔ اُس زمانے میں حکیم محمد حسن قرشی ان کا علاج کر رہے تھے ۔ علامہ کو ضیق النفس کے خفیف دورے شروع ہوئے ۔ پچھلی رات بے خوابی ہونے لگی ۔ دو ایک دن نقرس کی تکلیف بھی رہی ۔ ضیق النفس کے لیے حکیم قرشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا جس کے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا ۔ حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو دمہ قلبی ہے اور اس کی وجہ ضعفِ قلب ہے ۔ چناں چہ ڈاکٹروں نے بھی اس تشخیص کی تائید کی ۔ اُن دنوں ہم نے اکثر دیکھا کہ علامہ بستر پر بیٹھ کر تکیہ اپنے آگے رکھوا لیتے اور اس پر اپنا سر ٹیک دیتے۔ ۲۵ فروری کو دمہ کا دورہ ہوا ۔ جوشاندہ پیا لیکن افاقہ نہ ہوا ۔ پھر ایلوپیتھک علاج شروع ہوا جس میں دورے کو روکنے اور نیند لانے کی تدبیر کی جاتی تھی ۔ چند روز ذرا آرام سے گزر گئے۔ ۳ مارچ کی شب کا ذکر ہے ۔ علامہ پر ضعفِ قلب سے غشی طاری ہوئی اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے گر گئے ۔ دوسرے دن حکیم قرشی صاحب نے ان کو دیکھا تو ان کے نیاز مندوں کو بتا دیا کہ علامہ کا قلب نہایت ضعیف ہے ۔ جگر اور گردے بھی ماؤف ہو چکے ہیں ۔ مگر اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے ۔ مناسب تدابیر اور احتیاط سے افاقہ ہو جائے گا ۔

اس حالت کے پیش نظر معالجین اور عقیدت مندوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وقتِ آخر قریب ہے ، لیکن حضرت علامہ کی ذہنی و فکری مستعدی کو دیکھ کر یہ یقین متزلزل ہو جاتا تھا ، اس لیے کہ وہ بدستور اپنے ہم نشینوں اور ملاقاتیوں سے سیاسیاتِ یورپ ، اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل اور دوسرے موضوعات پر گفت گو فرماتے رہتے تھے ۔ حکیم محمد حسن قرشی طبیب کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ انتہائی مخلص عقیدت مند کی حیثیت سے حضرت علامہ کے علاج میں مصروف تھے ۔ گھنٹوں بلکہ بعض اوقات رات کے ایک ایک بجے تک علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے ۔ خوش گوار دوائیں کھلاتے ،

خوش گوار باتیں کرتے اور علامہ کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا ۔

ڈاکٹر محمد یوسف ، ڈاکٹر الٰہی بخش ، ڈاکٹر جمعیت سنگھ سے بھی کبھی کبھی مشورہ کر لیا جاتا اور وہ بھی انتہائی توجہ اور عقیدت سے علاج کرتے۔ لیکن علامہ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی و ناگواری سے بے حد گھبراتے تھے اور علاج جاری نہ رہ سکتا تھا ۔ معالج سب کے سب متفق تھے کہ علامہ کو عظم و اتساعِ قلب کا عارضہ ہے ۔ چوں کہ قلب ضعف کی وجہ سے اپنے وظائف پوری طرح ادا نہیں کرسکتا ، اس لیے دمہ عارض ہے ۔ گردوں کی کیفیت دیکھ کر حکیم قرشی صاحب کا خیال تھا کہ استسقاء کا اندیشہ ہے ۔ ڈاکٹری دواؤں سے علامہ کو نفرت ہوتی تھی ۔ لیکن جب انھیں خمیرہ گاؤزبان عنبری یا دواء المسک اوراق نقرہ میں رکھ کر دی جاتی تو بے حد خوش ہوتے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری دواؤں کے اثرات صدیوں کے تجربے سے ثابت ہیں ۔ آج کل کی دواؤں کا کیا ہے ۔ ادھر ایجاد ہوئیں ، اُدھر متروک ۔

۱۷ مارچ سے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ خبر گیری اور تیمارداری کا تسلسل ضروری تھا ۔ چناں چہ میاں محمد شفیع تو مستقل طور پر جاوید منزل ہی میں اٹھ آئے تھے اور رات بھر جاگ کر علامہ کو دوائیں کھلایا کرتے تھے ۔ آدھی رات تک چودھری محمد حسین ، راجہ حسن اختر ، حکیم قرشی صاحب بیٹھے ہوئے علامہ کا دل بہلاتے رہتے ۔ حضرت علامہ کو اپنے احباب کے جذبۂ خدمت گزاری کا متشکرانہ احساس تھا اور وہ خلوت میں اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے ۔ ایک شام جب علامہ انتہائی درد و کرب کی حالت میں تھے ، علی بخش نے بے اختیار رونا شروع کیا ۔ نیاز مندوں نے اس کو تسلی دی تو فرمایا : ”رونے دیجئے ۔ تیس پینتیس برس کا ساتھ ہے ۔ جی ہلکا ہو جائے گا ۔“

انتقال سے دو ایک روز پہلے احباب سے مختلف مسائل پر بات چیت کر رہے تھے کہ یہ رباعی لکھوائی :

بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست　　بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش　　بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

ان دنوں بھی مسلمانانِ عالم کے حالات ، اسلامی ملکوں کے واقعات ، وطنیت پرستی کی لعنت ، مسلمانوں کے ذہنی و اخلاقی انحطاط پر نہایت درد مندی سے اظہارِ تأسف فرماتے اور اکثر رونے لگتے ۔ ایک دن مرضِ قلب کے متعلق ذکر چلا تو یہ شعر پڑھا :

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگِ محتسب　　بر دلِ ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

اس شعر کے پڑھنے کے بعد سخت رقت طاری ہوئی یہاں تک کہ ہم نشین مضطرب ہو گئے ۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و سلم سے عشق اس حد تک تھا کہ ذکرِ مبارک کے ساتھ ہی اشک بار ہو جاتے ۔ اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرطِ ادب سے یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ حضور کا اسمِ گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کے حواس اور بدنی حالت میں کوئی خرابی تو نہیں ۔

مرض الموت کی کیفیت یہ تھی کہ آخر میں استسقاء ہوا ۔ چہرے پاؤں پر ورم ہو گیا ۔ دردِ پشت اور دردِ شانہ کے عوارض شروع ہوگئے ۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے دیکھا تو مایوسی ظاہر کی ۔ علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے حرفِ تسلی کہنے کی کوشش کی تو علامہ نے فرمایا : ”میں مسلمان ہوں ۔ موت سے نہیں ڈرتا ۔“

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

۲۰ اپریل کو سہ پہر کے وقت علامہ دردِ پشت کی وجہ سے بہت بے چین تھے کہ اتنے میں ان کے ایک پرانے ہم جماعت (جو ہائیڈل برگ جرمنی میں ان کے ہم سبق تھے) بیرن فان فلٹ ہائم اتفاق سے ملاقات کو آ نکلے۔

ان کا ایک پارسی دوست بھی ساتھ تھا ۔ علامہ نے ان سے خوب جی بھر کے باتیں کیں اور طالب علمی کے زمانے کی باتیں بڑے لطف سے یاد کرتے رہے۔ یہ صاحب آخری بیرونی ملاقاتی تھے جو علامہ کی خدمت میں باریاب ہوئے ۔ وہ چلے گئے تو بعض دوسرے لوگوں سے کانگرس اور لیگ کی باتیں ہوتی رہیں۔

۱۹ اپریل کی شام سے حضرت علامہ کو بلغم میں کسی قدر خون آ رہا تھا اور یہ علامت سب کے نزدیک یاس انگیز تھی ۔ ڈاکٹر امیر چند آ گئے اور ڈاکٹر عبدالقیوم کو چند ہدایات دے کر چلے گئے ۔ اس کے بعد علامہ کو خیال آیا کہ حکیم قرشی صاحب شام سے بھوکے بیٹھے ہیں ۔ کھانا نہیں کھایا۔ آپ نے علی بخش سے کہا کہ حکیم صاحب کو بسکٹ کھلاؤ اور چائے پلاؤ ۔ چودھری محمد حسین ، حکیم قرشی صاحب ، سید سلامت اللہ شاہ اور سید نذیر نیازی خدمت میں حاضر تھے۔ راجہ حسن اختر کے متعلق دریافت فرمایا تو بتایا گیا کہ وہ ایک کام سے گئے ہیں ۔ شفیع صاحب کیمسٹ کے ہاں سے دوا لے کر آئے ، مگر اس کے پیتے ہی علامہ کا جی متلانے لگا ۔ اس پر حکیم صاحب نے خمیرہ گاوزبان عنبری کی ایک خوراک دی ۔ جس سے طبیعت بحال ہو گئی ۔

جب ان ہم نشیں حضرات نے دیکھا کہ علامہ مائلِ خواب ہیں تو انہوں نے اجازت طلب کی ۔ اُس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے ۔

راجا حسن اختر اس وقت جاوید منزل پہنچ گئے تھے ۔ علامہ کچھ دیر تک سوتے رہے ۔ پچھلے پہر بے چینی شروع ہوئی اور فرمایا : ”قرشی صاحب کو بلا لاؤ ۔“ راجا صاحب نے کہا وہ ایک بجے یہاں سے گئے ہیں ۔ شاید ان کا بیدار کرنا مناسب نہ ہو ۔ اس پر فرمایا : ”کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے ۔“ پھر اپنی یہ رباعی پڑھی جو انہوں نے گزشتہ دسمبر میں کہی تھی :

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید　　نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجا صاحب یہ سن کر حکیم صاحب کو بلانے کے لیے چلے گئے ۔ یہ واقعہ پانچ بج کر پانچ منٹ کا ہے ۔ حضرت علامہ خواب گاہ میں آگئے ۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے حسبِ ہدایت فروٹ سالٹ تیار کیا ۔ حضرت علامہ نے فرمایا اتنا بڑا گلاس کیوں کر پیوں گا ؟ اور پھر چپ چاپ سارا گلاس پی گئے ۔ علی بخش نے چوکی پلنگ کے ساتھ لگا دی۔ اُس وقت علی بخش کے سوا کمرے میں کوئی دوسرا نہ تھا ۔ علامہ نے اس سے فرمایا : ”میرے شانوں کو دباؤ“ پھر لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا لیے ، اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہا : ”یا اللہ! یہاں درد ہے“۔ اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف گرنے لگا ۔ علی بخش نے بڑھ کر سہارا دیا ، تو سوا پانچ بجے صبح حضرت حکیم الامت نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں سرخرو حاضر ہو گئے ۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون ۔ کل من علیہا فان ۔ ویبقی وجہ ربک ذوالجلال و الاکرام *

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے عیسوی حساب سے پینسٹھ سال ایک مہینہ انتیس دن اور ہجری حساب سے سرسٹھ سال ایک مہینہ چھبیس دن کی عمر پائی ۔

حضرت علامہ کے انتقال کی خبر چند لمحوں کے اندر شہر میں پھیل گئی ۔ اخباروں نے ضمیمے شائع کیے ۔ تمام سرکاری دفاتر ، عدالتیں ، کالج، سکول،اسلامی ادارے بند کر دیئے گئے اور شہر کے ہر گوشے سے علامہ کے عقیدت مندوں نے انبوہ در انبوہ جاوید منزل کا رخ کیا تاکہ اس درویش خود آگاہ و خدا آگاہ کی آخری زیارت سے مشرف ہو سکیں ۔ علامہ کے احباب، نیاز مند اور خدام کی حالت وفورِ غم سے ناقابل بیان ہو رہی تھی ۔ علی بخش پچھاڑیں کھا رہا تھا ۔ جاوید اور منیرہ خاموش اور سہمے ہوئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ابا جان کو کیا ہو گیا ۔ جاوید منزل اس بیوہ کی طرح نظر آ رہی تھی ، جس کا سہاگ اُجڑ گیا ہو ۔ صدہا مشتاقانِ زیارت

*علامہ کے مرض الموت کے حالات کے لیے میں نے زیادہ تر سید نذیر نیازی کے بیان پر تکیہ کیا ہے ۔

قطار در قطار حضرت علامہ کا چہرہ دیکھ دیکھ کر گزرتے جاتے تھے اور حضرت کے چہرے پرسکون و اطمینان کے علاوہ ہلکا سا تبسم بھی تھا :

”چو مرگ آید تبسّم برلبِ اوست“

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ حضرت علامہ کا مدفن کہاں ہو ؟ کوئی ایسا مقام ہونا چاہئے جو دوسرے قبرستانوں سے نمایاں اور ممتاز ہو کیوں کہ یہ مدفن صدیوں تک ”سجدۂ صاحب نظراں“ کا مورد رہنے والا ہے ۔ چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر مظفر الدین قریشی نے خیال ظاہر کیا کہ حضرت کو شاہی مسجد لاہور کے کسی حجرے میں دفن کیا جائے ۔ اس کے لیے سرکاری اجازت حاصل کرنا ضروری تھا ۔ سردار سکندر حیات خان کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہاں سے واپس آ رہے تھے ۔ لیکن انتظار خارج از بحث تھا ۔ بہر حال قرار یہ پایا کہ چند اشخاص شاہی مسجد جا کر مدفن کی جگہ تجویز کریں۔ چناں چہ چودھری محمد حسین ، سید محسن شاہ ، خلیفہ شجاع الدین ، خان سعادت علی خان ، میاں نظام الدین ، میاں امیر الدین ، مولانا غلام مرشد ، مولانا غلام رسول مہر اور سالک شاہی مسجد گئے اور دیکھ بھال اور بات چیت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ حجرہ مناسب جگہ نہیں ۔ مسجد کی سیڑھیوں کے بائیں جانب جو قطعہ زمین خالی پڑا ہے ، وہ حضرت علامہ کے مدفن کے لیے موزوں رہے گا ۔ اس کے بعد حصولِ اجازت کے لیے پانچ حضرات کا ایک وفد سرہنری کریک گورنر پنجاب سے ملا۔ یہ مسئلہ محکمۂ آثار قدیمہ سے متعلق تھا اور مرکزی حکومت کی منظوری دہلی سے منگوانا ضروری تھا ۔ سرہنری کریک نے انتہائی ہمدردی سے کام لے کر خود حکومت ہند سے بات چیت کر کے دوپہر تک اجازت منگا دی ۔

شام کے پانچ بجے تک جاوید منزل پر ہزاروں مسلمانوں کا مجمع ہو گیا اور پنجاب بھر کے عمائد و اکابر تو بلا امتیازِ مذہب و ملت جمع تھے ۔ وزرائے حکومت ، عدالتِ عالیہ کے جج،حکامِ اعلیٰ ، وکلا ، شعرا ، ادبا ، اخبار نویس ، کالجوں کے پروفیسر ، طلبہ ، سجادہ نشین ، علما ، تجار ، صناع

اور عام فرزندانِ اسلام جنازے کے ساتھ با چشمِ گریاں آہستہ آہستہ جا رہے تھے اور رونے والوں کی آوازوں سے ہر طرف ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دئے گئے تھے، تا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان کندھا دے سکیں۔ گورنر پنجاب اور نواب بہاول پور کی طرف سے ان کے سیکرٹریوں نے پھولوں کی چادریں جنازے پر چڑھائیں۔ جنازے کے جلوس کے آگے پیدل اور سوار پولیس، احرار کے سرخ پوش رضاکار، نیلی پوش والنٹیر، خاکساروں کا جیش، کاسربلڈ مسلم جیش، الہلال پارٹی، غرض متعدد جیوش اپنی اپنی وردیوں میں جنازے کے ہمراہ تھے۔ جاوید منزل سے یہ عظیم الشان جلوس ریلوے سٹیشن اور ریلوے روڈ سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج کے وسیع سبزہ زار میں پہنچا۔ جہاں نماز جنازہ پڑھنے کے لیے کم و بیش بیس ہزار مسلمان جمع تھے۔ لیکن جب جلوس برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے کی طرف چلا، تو جنازے کے ساتھ کوئی پچاس ساٹھ ہزار مسلمان، ہندو اور سکھ ضرور ہوں گے۔ سات بجے کے بعد جلوس شاہی مسجد پہنچا۔ نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی بے پناہ کثرت کے باعث وضو اور ترتیبِ صفوف میں ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ آٹھ بجے شب نماز جنازہ ادا کی گئی اور پونے دس بجے یہ عزیز و محبوب جسم سپرد خاک کردیا گیا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرتِ حکیم الامۃ رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر جن اخباروں نے ماتمی نمبر نکالے، جن انجمنوں نے تعزیتی جلسے کئے، جن اکابرِ ہند اور اعاظمِ رجالِ عالم نے ماتم پرسی کے پیغامات بھیجے، جن شعرا نے مرثیے لکھے، جن اہلِ فکر نے قطعاتِ تاریخ تصنیف کیے ان کا ذکر ایک علیحدہ کتاب چاہتا ہے۔ بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوستان تو ایک طرف دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ رہا جس کے اکابرِ سیاست اور اہلِ فضل و کمال نے اس نابغۂ عظیم کے حضور میں تحسین و عقیدت کا

خراج پیش نہ کیا ہو اور ہمارے اخبار نویسوں اور شاعروں نے تو علامہ کے تذکرہ اور ان کے فلسفہ و شعر کے تبصرہ کا حق ادا کر دیا۔ بلکہ اب تک کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کو اپنے اس ''دوست، فلسفی اور رہنما،، کے انتقال سے بے حد صدمہ ہوا اور ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یوم اقبال کی صدارت کرتے ہوئے قائدِاعظم نے فرمایا کہ اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لئے زندہ رہوں اور اس وقت مجھ سے کہا جائے کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف ''اقبال کی تصنیفات،، ہیں، تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو؟ تو میں ''اقبال کی تصانیف،، کو ترجیح دوں گا۔

مزارِ علامہ اقبال

چوتھا باب

اقبال کا اسلوبِ زندگی

علامہ اقبال علومِ مغربیہ کے فاضلِ اجلّ، انگریزی زبان کے بہترین انشا پرداز اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کے باوجود مغرب زدگی سے حیرت انگیز طور پر محفوظ تھے۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ تھی، اُن کا ذہن کاملاً مشرقی اور فکر قطعی طور پر اسلامی تھا۔ آج کل کے معمولی ''ولایت پلٹ'' لوگ، جن کو علم و ثقافت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا، نہ صرف مغربی اسلوبِ زندگی اختیار کر لیتے ہیں، بلکہ اُس کالے آدمی سے بات کرنا بھی ہتک سمجھتے ہیں جو گوروں کے ملک میں کبھی نہیں گیا۔ لیکن اقبال اس اثر سے بالکل آزاد تھا۔ مغربی تعلیم اور جدید فلسفے کے سمندر کا شناور ہونے کے باوجود اُس کی مشرقی سادگی اور اسلامی ذہنیت وہی رہی جو اکابرِ مشرق کی کتابوں اور بزرگانِ اسلام کی نگاہوں نے اس میں پیدا کر دی تھی۔

اقبال کی خوراک نہایت سادہ تھی۔ نوجوانی کے زمانے میں بھی چٹور پن سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ جب میں پہلے پہل لاہور آیا تو علی بخش میرے ساتھ تھا، لیکن تھا بالکل جانگلو۔ اتفاق سے اس نے کسی سے آلو گوشت پکانا سیکھ لیا تھا۔ چناں چہ صرف آلو گوشت ہی پکا کر میرے آگے رکھ دیتا تھا۔ صبح آلو گوشت، شام آلو گوشت، یہاں تک کہ چار پانچ مہینے گزر گئے۔ اس دوران میں احباب کی دعوتوں کے سوا میں نے مسلسل آلو گوشت ہی پر گذران کی اور علی بخش نے بھی کوئی اور سالن پکانا نہ سیکھا۔ بعد میں علی بخش بعض کھانے اچھی طرح پکانے لگا
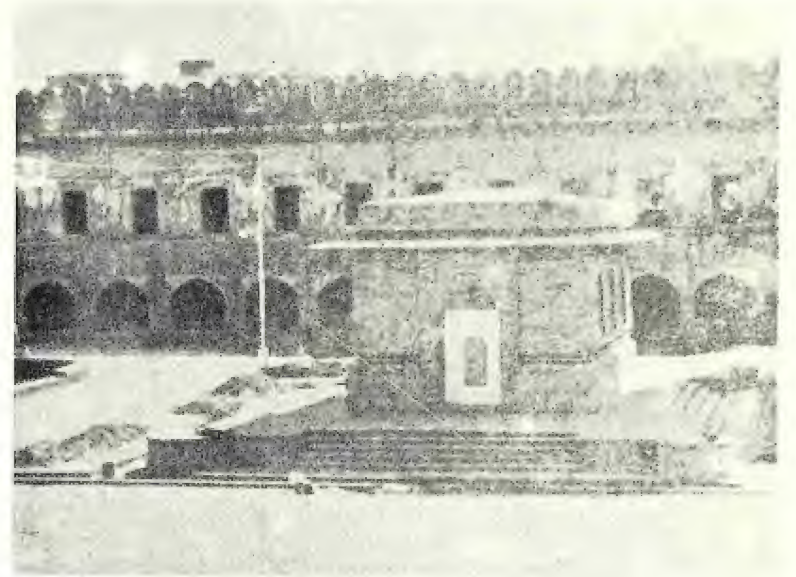
لیکن اقبال اس کے آلو گوشت کو عمر بھر نہ بھول سکے ۔ زندگی کے آخری سالوں میں علالتِ طبع کی وجہ سے اقبال کی خوراک بہت برائے نام رہ گئی تھی ، لیکن اس سے قبل بھی صبح کلچہ یا باقرخانی حلوے کے ساتھ کھا کر کشمیری چائے پی لیا کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں چائے کی جگہ دہی کی لسی نوش فرماتے تھے ، دوپہر کو سبزی گوشت اور ایک دو چپاتیاں ، تیسرے پہر کچھ نہیں ، رات کو پھر وہی سالن اور چپاتیاں ، پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے ، لیکن کبھی کبھی کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ Pan-Islamic dishes ہیں ۔ چین سے مراکش تک کہیں چلے جاؤ ، پلاؤ اور کباب ہر جگہ ملیں گے ۔ دہی بھی بہت پسند تھا ۔ دلیا دودھ ڈال کر اکثر کھا لیتے تھے ۔ کبھی کبھی تیسرے پہر ایک چھوٹا سا چوزہ مسلّم پکوا لیتے اور ایک چپاتی کے ساتھ دو تین گوشت کے ٹکڑے کھا کر دستر خوان بڑھوا دیتے ۔ کھانا کھانے کا عام انداز یہ تھا کہ علی بخش ایک سینی میں سالن کی ایک رکابی اور دو تین ہلکی سی چپاتیاں رکھ کر لے آیا ۔ اقبال بستر پر سیدھے ہو بیٹھے ۔ علی بخش نے بستر ہی پر ایک رومال بچھا کر اس پر سینی رکھ دی ۔ علامہ نے پاس بیٹھے ہوئے دوستوں کو صلا دی اور کھانا شروع کیا ۔ علی بخش پانی لیے بیٹھا رہا ۔ ایک آدھ چپاتی کھا کر علامہ نے فرمایا ''اٹھاؤ'' ۔ علی بخش نے سینی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی ۔ چلمچی آفتابہ آگے کر دیا اور علامہ کے ہاتھ دھلوا دیئے ۔ رات کو نمکین کشمیری چائے بہت پابندی سے پیتے تھے ۔ آخری سالوں میں رات کا کھانا موقوف ہوگیا تھا ، لیکن کشمیری چائے کا دور ضرور چلتا تھا ، جس میں ان کے نیاز مند بھی اکثر شامل ہو جایا کرتے تھے ۔

پھلوں میں آم بے حد پسند تھے ۔ موسم آنے پر بازار سے بھی منگاتے ، دوست احباب بھی بھیجتے ۔ چناں چہ ایک دفعہ اکبر الہ آبادی کے پارسل کی رسید دیتے وقت یہ شعر لکھ بھیجا تھا :

ترے فیضِ مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

سال بھر میں ایک آدھ دفعہ میاں نظام الدین مرحوم کے باغ میں آموں کی دعوت ہوتی ، جس کی ''صدارت'' علامہ فرماتے اور ہم لوگ صبح سے جو آم کھانا شروع کرتے ، تو ایک بجے کی خبر لاتے ۔ بہترین دانے علامہ کی خدمت میں پیش کیے جاتے اور آموں کے متعلق وہ ہمہ معنی آفرینیاں ہوتیں کہ باغ قہقہہ زار بن جاتا ۔

آخری علالت کے دوران میں جب دہلی کے حکیم نابینا صاحب مرحوم کا علاج جاری تھا ، حکیم صاحب نے آموں سے پرہیز کا حکم دیا ۔ آخر علامہ کے اصرار پر صرف ایک آم روزانہ کھا لینے کی اجازت دے دی ۔ ایک دن میں تیسرے پہر حاضر ہوا ، تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت علامہ بدستور تکیہ لگائے چارپائی پر لیٹے ہیں اور پاس ہی ایک تپائی پر کوئی سیر بھر کا ''بمبئی آم'' پلیٹ میں رکھا ہے ۔ میں نے کہا حضرت یہ کیا ؟ حکیم صاحب نے تو پرہیز بتایا ہے ۔ کہنے لگے ہاں ، لیکن ایک آم کھانے کی تو اجازت ہے اور پھر حال یہ آم ایک ہی ہے ، دو تو نہیں ہیں ۔ جن دنوں جاوید اور منیرہ کے لیے ایک جرمن گورنس مقرر ہوئی ، تو علامہ نے گھر بھر کا انتظام اسی کے سپرد کر دیا ۔ وہ بچوں کو خوش کرنے کے لیے کبھی کوئی پڈنگ پکا لیتی ، کبھی آئس کریم بنا لیتی اور بڑے اصرار سے علامہ کو بھی کھلاتی ۔ بلکہ دو دفعہ علامہ نے ہمیں بھی ''میم صاحب کی آئس کریم'' کھانے کی دعوت دی ۔ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی اور ناگواری سے ہمیشہ بیزاری ظاہر کرتے اور جب خمیرۂ مروارید بورقِ نقرہ پیچیدہ ایک چھوٹی سی پرچ میں پیش کیا جاتا تو بہت خوش ہوتے اور کہتے کہ ہاں یہ ہے نا دوا ، جس کو دیکھتے ہی مرض آدھا رہ جائے ۔ مریض تو پہلے ہی تلخ کام ہوتا ہے ، اس کو مزید تلخ کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں ۔

مرض‌الموت میں غذا کے متعلق حسِ ذائقہ میں زیادہ لطافت پیدا ہو گئی تھی ۔ حکیم محمد حسن صاحب قرشی سے ایک گفت‌گو کا خاکہ ملاحظہ ہو:
''اگر پلاؤ کی اجازت نہیں تو کھچڑی میں کیا حرج ہے ، یہ تو سادہ غذا ہے'' ۔ ''آپ ایک دو روز کھچڑی کھا لیجئے'' ۔ ''ہاں تو کھچڑی بھی ہوئی ہونی چاہیے ، جس میں گھی کافی ہو'' ۔ ''گھی کم ہونا چاہیے ، کیوں کہ جگر بڑھا ہوا ہے'' ۔ ''تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہوگی ؟ اچھا کم از کم اس میں دھی تو ملا لیا جائے'' ۔ ''مگر آپ کو کھانسی اور تولیدِ بلغم کی شکایت ہے جس میں دھی مضر ہے'' ۔ ''تو پھر ایسی کھچڑی کھانے سے نہ کھانا اچھا ہے'' ۔

علامہ اپنی بیرسٹری کے سلسلے میں جب عدالتوں میں جاتے تو انگریزی سوٹ پہن لیتے ۔ ہیٹ شاید کبھی طالب علمی کے زمانے میں اور وہ بھی انگلستان میں پہنی ہوگی ۔ یہاں ہم نے انھیں ہیٹ لگائے ہوئے کبھی نہیں دیکھا ۔ انگریزی سوٹ کے ساتھ نکٹائی کی جگہ عام طور پر کالی بوکلپ سے لگا لیتے ، لیکن جتنی دیر سوٹ پہنے رہتے ، کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آتے اور گھر واپس آتے ہی علی بخش کو آواز دیتے کہ سب سے پہلے یہ چار جامہ اُترواؤ اور انسانوں کے سے کپڑے پہناؤ ۔ پرائیویٹ لباس یہ تھا : سر پر تُرکی یا کلپاک ٹوپی ، سردیوں میں پشاوری پٹکا ، قمیص ، شلوار ، چھوٹا کوٹ ، پاؤں میں دیسی جوتا ۔ چند بار شیروانی بھی پہنی ہے ۔ اسی لباس میں تقریبات میں جاتے اور دوستوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے ۔ گھر پر گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان اور تہمد ۔ سردیوں میں ان دونوں کپڑوں پر صرف ایک قمیص کا اضافہ ہو جاتا ۔ البتہ پشمینے کا دُھسّہ اوڑھے رہتے ۔ سر کشن پرشاد نے دوران قیام حیدرآباد میں ایک تھان اعلیٰ درجے کی جامے وار کا پیش کیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی شیروانی سلوائی اور دو چار دفعہ شوق سے پہنی ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے جسم پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی ۔

اس لباس میں ایک عقیدت مند نے عکسی تصویر بھی لی تھی ، جو بعض رسالوں میں شائع ہو گئی تھی ۔

دورانِ وکالت میں معمول تھا کہ عدالت سے واپس آ کر اپنا گھریلو لباس زیبِ تن کرتے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے ۔ ساتھ ہی حقّہ لگا ہوتا تھا ۔ حقّہ پیتے ، کتابیں پڑھتے ، مقدمات تیار کرتے ، ملنے والوں سے باتیں کرتے ۔ جب وکالت کا مشغلہ علالت کی وجہ سے ختم ہوگیا ، تو زیادہ وقت بستر پر گزرتا تھا ۔ تکیہ لگا ہے ، معمولی سی توشک پر دری اور چادر بچھی ہے اور اس پر یہ پیکرِ علم و فضل جلوہ گر ہے ۔ علی بخش حقے کے معاملے میں بڑا باقاعدہ اور پابند تھا ۔ تمباکو علی العموم میاں نظام الدین مرحوم کے کھیتوں سے آتا ، علی بخش بڑے اہتمام سے اس کو تیار کرتا اور دن بھر چلمیں بھرتا ، کیوں کہ اس کے سوا اسے کوئی اور کام ہی نہ تھا ۔

۱۹۲۱ء تک تو علامہ انارکلی بازار کے ایک بالا خانے میں رہتے تھے ۔ بازار کی جانب کمرے میں کتب خانۂ قانونی ، درمیانی کمرہ خالی ، عقبی کمرے میں علامہ کی کرسی اور بستر، اللہ اللہ خیر سلاّ، زنانہ حصہ دوسری منزل پر۔ جب میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں پہنچے ، جب بھی کمروں کی ترتیب انگریزی نہ تھی ۔ ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں وہی بستر اور کرسی ، بڑے کمرے میں ایک بڑا قالین اور صرف ایک صوفا ، ایک کرسی خود علامہ کے لیے، چند کرسیاں آنے جانے والوں کے لیے، اللہ بس باقی ہوس ۔ لیکن زیادہ تر برآمدے میں بیٹھتے تھے ۔ ڈرائنگ روم ، بیڈ روم ، ڈائیننگ روم وغیرہ کے بکھیڑوں سے نفرت ۔ اول تو دعوت اور مہمان داری کا اتفاق شاذ ہی ہوتا تھا ، لیکن جب کبھی پانچ چھ دوستوں کو کھانے کی دعوت دیتے ، بڑے کمرے میں قالین پر دستر خوان بچھ جاتا اور وہیں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ۔ ہم نے علامہ کے ہاں مہمان شاذ و نادر ہی دیکھے ۔ البتہ مولانا گرامی جب کبھی آتے ، مہینہ مہینہ ، دو دو مہینے قیام فرماتے اور

آن کی مہمان داری کا اہتمام بطور خاص کیا جاتا ۔ اور یہ اہتمام بھی کیا تھا!
وہ بھی علامہ کی طرح سیدھے سادھے بزرگ تھے ۔ دن میں ایک وقت کھانا
کھاتے، باقی اوقات میں چائے پیتے ۔ لہٰذا علامہؒ کے ساتھ آن کی خاصی نبھ
جاتی تھی ۔ علامہ میں ایک بات عجیب تھی کہ شدیدگرمی میں بھی پنکھا نہ
لگاتے تھے ۔ ایک چھوٹی سی دستی پنکھیا پاس پڑی رہتی تھی ، کبھی کبھی
آٹھا کر ذرا سا جھل لیتے ، اور بس ۔ جب کبھی ہم اصرار کرتے کہ پنکھا
منگائیے ، ہم سے تو اس گرمی میں بیٹھا نہیں جاتا ، تو علی بخش سے کہ کر
ٹیبل فین لگوا دیتے ، لیکن اس کا رخ اپنی طرف نہ ہونے دیتے ، پسینہ چوٹی
سے ایڑی تک پڑا بہتا ، لیکن وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نہ ہوتا ۔ اس کے مقابلے
میں جب جاڑا پڑتا ، تو علامہ اپنی کرسی سے آتر کر مع دھسّے کے قالین
پر آ بیٹھتے اور ایک بڑی انگیٹھی آگ تاپنے کے لیے آگے رکھوا لیتے ۔

میں نے ایک دفعہ پہلے بھی ایک تقریر میں بیان کیا تھا کہ علامہ اقبال
کے علم و فضل کا شہرہ آن کی شاعری اور آن کی تصانیف سے نہیں ہوا ، بلکہ
اس کا ذمہ دار آن کا تکلّم ہے ۔ وہ دور حاضر کے بہت بڑے متکلم تھے ، جس
کو انگریزی میں Conversationalist کہتے ہیں ۔ صبح سے رات تک یہ مردِ
قلندر اپنے سادہ کپڑوں میں سیدھی سادی چارپائی پر یا آرام کرسی پر بیٹھا رہتا
اور آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ۔ صوبے کے سیاسی اکابر ، وکلاء ، علماء ،
کالجوں کے پروفیسر ، اخباروں کے ایڈیٹر ، شعراء و آدباء ، طالب علم، ان پڑھ
عقیدت مند ، فقیر اور درویش — غرض ہر قسم اور ہر طبقے کا انسان آن کی
خدمت میں حاضر ہوتا ۔ معمولی معمولی جھگڑوں سے لے کر قانون ، فلسفہ ،
سیاست، دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیر بحث آتے ، اقبال آن سب پر
اپنی وسیع معلومات سے روشنی ڈالتے اور ہر شخص آپ کے علم و فضل سے
مرعوب ہو کر جاتا ۔ صوبے بھر کے تعلیم یافتہ حضرات اپنی ذہنی اور فکری
آلجھنیں علامہ کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ آنہیں سلجھا دیتے ۔ آن کی مجلس

میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہ تھا ۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی سیدھا آن
کے گھر میں داخل ہو کر آن کے پاس بیٹھ جاتا اور جس وقت تک جی چاہتا ،
بیٹھا رہتا ۔ علامہ صاف صاف کہنا تو در کنار ، اپنی کسی حرکت سے بھی
آکتاہٹ کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے ۔ علم و فکر کے اس دربار میں
سر فضل حسین ، سکندر حیات خاں ، جواہر لال نہرو ، قائد اعظم محمد علی جناح،
لارڈ لوتھیاں ، ڈاکٹر سکارپا اور بے شمار دوسرے اکابر علم و سیاست حاضر ہوتے
اور مستفیض ہو کر جاتے ۔ علامہ کو بعض سے سیاسی اختلافات تھے ، لیکن
چوں کہ خلوص و بے غرضی کا معاملہ تھا ، اس لیے کسی سے نا گواری پیدا
نہ ہوتی تھی ۔

علّامہ کے جلیس و ندیم

علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے والے
اشخاص کی فہرست تو بے حد طویل ہے لیکن یہ
سمجھ لینا چاہیے کہ آغاز میں ان کے ہم نشیں مرزا جلال الدین ، مولوی
احمد دین ، شیخ گلاب دین ، فقیر سید نجم الدین ، سر عبدالقادر ، سر
شہاب الدین ، سر محمد شفیع ، سر فضل حسین ، سر جگندر سنگھ ، سردار
امراؤ سنگھ ، نواب ذوالفقار علی خان اور راجا نرندر ناتھ تھے ۔ دوسرے
دور میں مولانا ظفر علی خان اکثر آ کر ملتے تھے اور گھنٹوں صحبتیں رہتی
تھیں ۔ خلیفہ شجاع الدین ، خلیفہ عبدالحکیم ، شیخ اکبر علی ارسطو ،
خان غلام رسول خان اکثر آتے ۔ سالک اور مہر سالہا سال تک ہر دوسرے
تیسرے دن حاضر ہوتے اور شام سے آدھی رات تک مجلس جمی رہتی ۔
مرتضیٰ احمد خان میکش بھی کبھی کبھی حاضر ہوتے ۔ چودھری محمد حسین
سے تو کئی سال انتہائی مخلصانہ تعلقات تھے اور ہر شخص کو معلوم ہے
کہ علامہ کی طبیعت میں جس قدر در خور چودھری صاحب کو حاصل تھا ،
اس کا مقابلہ کوئی دوست یا جلیس نہ کرسکتا تھا۔ آخری ایام میں حکیم محمد حسن

قرشی ، راجا حسن اختر ، سید نذیر نیازی ، میاں محمد شفیع (جرنلسٹ) شب و روز حضرتِ علامہ کی خدمت میں رہتے ۔ اور دوا و غذا اور دوسرے معمولات کی نگرانی بوجہِ احسن کرتے ۔

ملک لال دین قیصر ایک زمانے میں دن رات علامہ ھی کے پاس بیٹھے رہتے تھے ۔ چوں کہ وہ قوم کے مجاھد خادم تھے ، اس لیے اکثر قید ھو جایا کرتے تھے ۔ ایک دن اُن کی والدہ ضعیفہ یہ سن کر کہ قیصر علامہ اقبال کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا ، عین دوپہر کے وقت علامہ کی خدمت میں حاضر ھوئیں اور عرض کیا کہ یہ بیٹا میرے لیے وبالِ جان ھو رھا ھے اور ھمیشہ کسی نہ کسی قضیے میں قید ھو جاتا ھے ۔ آپ اُس کو منع کیجیے ۔ علامہ نے حسنِ تدبیر سے قیصر کو بعض خطرناک جلسوں اور تحریکوں سے باز رکھا ۔ جب قیصر کی شادی ھوئی اور اس کے ھاں بچہ پیدا ھوا تو والدۂ قیصر اس بچے کو لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ھوئیں اور کہا کہ آپ اس کے لیے دعا کیجیے ۔ علامہ نے اس کو درازئ عمر ، ترقی درجات اور سلامتیِ ایمان کی دعا دی اور والدہ سے پوچھا کہ اس بچے کا نام کیا رکھا ؟ ضعیفہ محترمہ نے کہا کہ میں اس کا نام اقبال رکھوں گی ۔ (اقبال قیصر آج کل کاروبار میں مصروف ھیں اور ان کی دادی کا انتقال ھو چکا ھے) ۔

علامہ کی گفت گو کبھی پنجابی میں اور کبھی سیدھی سادی اردو میں ھوتی ۔ مسائل کی سنگینی کی وجہ سے بعض اوقات اس گفت گو میں بے شمار انگریزی الفاظ بھی داخل ھو جاتے ۔ لیکن علامہ کا اسلوب بیان ھمیشہ سلجھا ھوا ھوتا ۔ اُردو بالکل پنجابی لہجے میں بولتے تھے ۔ اکثر اھلِ زبان حضرات کو ان کی ملاقات سے ایک گونہ تنفر پیدا ھوتا تھا ۔ وہ شعر کی داد موقع بے موقع نہ دیتے تھے ۔ آداب تسلیمات نہ کرتے تھے ۔ آسانی سے کسی کو کلام نہ سناتے تھے ۔ ھم نے بھی کبھی اُن سے فرمائش کی جرأت نہیں کی ، لیکن جب کبھی رات کے وقت موج میں آتے تو گیارہ گیارہ بجے تک اپنا غیر مطبوعہ کلام سناتے

رھتے ۔ لیکن جو لوگ اھلِ زبان سے اھلِ علم زیادہ ھوتے تھے ، وہ انتہائی احترام سے علامہ کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے ھوئے واپس جاتے ۔

مرزا جلال الدین صاحب کا بیان ھے کہ ایک دفعہ انجمن حمایتِ اسلام کے سلسلے میں یہاں یو ۔ پی کے رئیس راجا نوشادِ علی خان کو دعوت دی گئی ۔ وہ سر محمد شفیع کے ھاں ٹھیرے ۔ ایک دن چائے پیتے ھوئے کہا کہ سر سید نے پنجابیوں کی زندہ دلی کی تعریف کی ھے ۔ یہاں آ کر تو ھمیں کوئی زندہ دلی نظر نہیں آئی ۔ مرزا جلال الدین نے کہا : ”آپ کانفرنس کے بعد مزید ایک دن قیام فرمائیے ۔ پھر آپ کو زندہ دلی کا اندازہ ھوگا“ ۔ اس دعوت کے موقع پر کھانا تو نواب ذوالفقار علی خان کے ھاں ”زر افشاں“ میں ھوا ۔ اس کے بعد احباب جلسۂ رقص و سرود کے لیے مرزا جلال الدین کے ھاں چلے گئے ۔ مرزا صاحب نے اس زمانے کی نامور طوائف بہارو کو بلا کر راجا نوشاد علی خان کو اُس کا گانا سنوایا ۔ وہ بے حد مسرور و محظوظ ھوئے ۔ جب وہ رخصت ھوگئی تو نوشاد علی خان نے علامہ سے کہا : ”حضرت ! آپ کی زبان سے آپ کا کلام سنے مدت گزر گئی ۔ کچھ ارشاد فرمائیے“ ۔ علامہ نے کہا ”مجھے کچھ یاد نہیں“ ۔ ھر شخص نے تقاضا کیا ۔ لیکن علامہ نے ایسی ”نا“ پکڑی کہ پوری محفل منغّص ھوگئی ۔ جب راجا نوشاد علی خان چلے گئے اور دوستوں نے علامہ سے پوچھا کہ یہ کیا طریقہ ھے ۔ آپ نے جواب دیا : ”یہ شخص وجاھت کی بنا پر مجھ سے شعر سننا چاھتا تھا ۔ میں وجاھت کی بنا پر کسی کو شعر نہیں سنایا کرتا“ ۔

فرمائش پر کلام سنانا علامہ کی عادت کے قطعاً خلاف تھا ۔ بارھا ایسا ھوا کہ یو ۔ پی سے کوئی شاعر ملنے آئے اور آج کل کے شعرا کے رواج کے مطابق اُنھوں نے چاھا کہ کچھ علامہ سے سنیں اور کچھ اپنا کلام سنائیں ۔ لیکن علامہ نے ان کو ھمیشہ مایوس ھی کیا ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اس سلسلے میں دو واقعات سنائے جن کو مختصراً بیان کرنا ضروری ھے ۔ جب علامہ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تو ایک دن جوش ملیح آبادی نے

اپنے چند دوستوں کو دعوت دی اور علامہ کو مدعو کیا ۔ علامہ نے اس دعوت کا ذکر خلیفہ صاحب سے کیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مدعو نہیں ہیں ۔ بہر حال علامہ چوں کہ دعوت قبول کرچکے تھے ، لہٰذا چلے گئے ۔ جوش کا مقصد اس محفل سے یہی تھا کہ کچھ اپنا کلام سنائیں اور کچھ علامہ سے سنیں ۔ انہوں نے فرمائش کی ۔ علامہ نے کہ دیا کہ ''مجھے یاد نہیں'' ۔ بہتیرا تقاضا کیا ، منت سماجت کی ، علامہ نے ایک شعر بھی نہ سنایا ۔ پھر جوش اپنا کلام کیا سناتے ۔ چناں چہ یہ مجلس ''مشاعرے'' کے بغیر ہی ختم ہو گئی ۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرتِ علامہ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کے تعلقات مدت سے دوستانہ چلے آرہے تھے ۔ چناں چہ ان کی طویل خط و کتابت بھی ''شادِ اقبال'' کے نام سے شائع ہوچکی ہے ۔ مہاراجہ صاحب نے علامہ کے اعزاز میں ایک نہایت شان دار دعوتِ طعام کا اہتمام کیا ۔ جب علامہ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ دعوت ایک شرط پر قبول کرتا ہوں ، کہ مجھ سے اس مجمع میں شعر سنانے کی فرمائش نہ کی جائے ۔ مہاراجا بے حد پریشان ہوئے ، کیوں کہ ان کا مقصد تو یہی تھا کہ اکابر حیدر آباد کو علامہ کا کلام سنوائیں لیکن چوں کہ علامہ کی شرکت اس پابندی سے مشروط تھی ، لہٰذا ناچار مہاراجا صاحب نے قبول کیا ۔ علامہ شریک محفل ہوئے ۔ وہاں بعض شعرا و امرا نے اپنا کلام سنایا اور ایک دوسرے کو خوب فرمائشی داد دی ۔ علامہ خاموش بیٹھے رہے ۔ آخر میں ان سے کلام سنانے کی استدعا کی گئی تو انہوں نے نہایت تنغّص سے جواب دیا : ''یاد نہیں ۔'' بڑے بڑے امراء و حکام نے مہاراجا صاحب سے گذارش کی کہ وہ حضرت علامہ کو آمادہ کریں لیکن وہ پابندیِ عہد سے مجبور تھے ۔ آخر بہت ہی ناچار ہو کر انہوں نے گذارش کی کہ حضرت یہ سب لوگ آپ سے عقیدت کی وجہ سے کلام کے طالب ہیں ۔ ان کو محروم رکھنا قرینِ مروت نہیں

معلوم ہوتا ۔ بہت سی حیص بیص کے بعد علامہ نے مجبوراً فارسی کے صرف دو شعر سنائے :

بگزر از خاور و افسونیِ افرنگ مشو — کہ نیرزد بہ جوے ایں ہمہ دیرینہ و نو
آں نگینے کہ تو با اہرمناں باختۂ — ہم بہ جبریلِ امینے نتواں کرد گرو

لیکن مہاراجا صاحب دیکھ رہے تھے کہ علامہ نہایت منغّص ہو کر شعر سنا رہے ہیں ۔ چناں چہ انہوں نے مزید فرمائش نہ کی ۔

علامہ کا زیادہ تر وقت ملاقاتوں اور مذاکروں ہی میں گزرتا تھا ۔ پھر تعجب ہے کہ وہ مطالعہ کس وقت کرتے تھے اور مطالعہ کا یہ حال تھا کہ یورپ سے جدید ترین سیاسی و فلسفیانہ نظریات کے متعلق انگریزی اور جرمن زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی تھیں ، ان کو علامہ باقاعدہ پڑھتے تھے ۔ ملک بھر کے اخبارات اور رسالے ان کے نام آتے تھے ۔ لیکن وہ ایک دو مقامی اخبارات کے سوا باقی سب کو کھولتے بھی نہ تھے اور علی بخش کو بلا کر اس کے حوالے کر دیتے تھے ۔ ہم علی بخش سے بارہا اچھے اچھے رسالے پڑھنے کے لیے لے جایا کرتے تھے ، باقی وہ ردی میں بیچ دیتا تھا ۔

صبح کی نماز اور تلاوتِ قرآنِ مجید علامہ کا باقاعدہ معمول تھا اور تلاوت کے وقت کلامِ الٰہی کے اثر سے اکثر اشک بار ہو جاتے تھے ۔ غیرتِ اسلامی کے پیکر تھے ۔ اسلام ، شارعِ اسلام ، اکابرِ تاریخِ اسلام کی ذرا سی بے حرمتی پر ضبط نہ کر سکتے تھے ۔ عشقِ رسولؐ ان کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا تھا ۔ حضور سرورِ کائناتؐ کا ذکر ذرا مؤثر طور پر ہوا اور علامہ کے آنسو جاری ہوئے ۔ پھر جب تک خود بخود طبیعت ہلکی نہ ہو جاتی تھی ، ان کی گریہ وزاری کو کوئی نہ روک سکتا تھا ۔

اسمائے الٰہی اور کلامِ الٰہی اور دوسرے با برکت کلمات کی تاثیرات کے بھی قائل تھے ۔ ایک دفعہ راقم الحروف سے ذکر کیا کہ کل میری بیوی

کے سر میں درد ہوا جو کسی تدبیر سے نہ گیا ۔ آخر میں نے قصیدہ بردہ کا فلاں شعر کاٹ کر اس کی پیشانی پر چسپاں کر دیا ۔ چند منٹ میں درد کافور ہو گیا ۔

والدۂ جاوید کا دل بہت کمزور تھا ۔ بہت جلد ڈر جاتی تھیں ۔ ایک دن خفیف سا زلزلہ آیا تو بے ہوش ہو گئیں ۔ اعزّہ نے علامہ کو باہر سے بلوایا۔ وہ آ کر پاس بیٹھ گئے ۔ والدۂ جاوید کو ہوش آیا تو انُ کا دل بہلانے کے لیے کہانیاں سناتے رہے ۔ پھر فرمایا : "کہانیاں تو سن لیں ۔ اب اللہ کا ذکر کرو۔ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ہیں"۔ پھر خود بلند آواز سے یاحی یاقیوم پڑھنے لگے ، یہاں تک کہ کمرہ گونج اٹھا ۔ والدۂ جاوید پھر ڈر گئیں۔ علامہ پھر انہی اسما کا ورد کرتے کرتے باہر تشریف لے گئے ۔*

طبیعت میں مزاح و تفنّن بھی تھا ۔ لطیفے کی قدر کرتے تھے اور خود بھی لطائف و ظرائف سے ہم نشینوں کو ہنسایا کرتے تھے ۔ دن بھر میں پچاسوں آدمی آن سے ملنے آتے اور طرح طرح کی باتیں ہوتیں ۔ اسی سلسلے میں ہر حلقے کی خبریں بھی علامہ تک پہنچتی رہتی تھیں اور وہ ان خبروں کو سن کر دوسرے احباب تک پہنچا دیتے تھے ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ، راقم نے ڈاکٹر صاحب کو ایک اہم سیاسی خبر سنائی اور کہہ دیا کہ فی الحال آپ کسی سے اس کا ذکر نہ کیجیے گا ۔ دوسرے دن شام کو میں حاضر ہوا تو بڑی راز داری سے وہی خبر مجھے سنا دی کہ کوئی صاحب مجھے یہ خبر سنا گئے ہیں۔ آپ فی الحال کسی سے ذکر نہ کیجیے گا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا۔ میں نے کہا : "حضرت ! یہ خبر تو میں ہی کل آپ کو سنا گیا تھا"۔ علامہ ہنس دئے اور کہنے لگے : "گویا میرے ذہن میں خبر ہی رہ گئی اور خبر دینے والا نہ رہا"۔

میں نے بہت کم لوگوں کو علامہ اقبال جیسا خوش معاملہ پایا ہے ۔ وہ روپے پیسے کے معاملے میں بے حد دیانت دار اور محتاط تھے ۔ پہلی بیگم کو

* بیان محمد نذیر صوفی داماد شیخ عطا محمد ۔

جتنی رقم ماہوار ادا کرنے کا وعدہ کیا ، نہایت پابندی سے تادمِ مرگ ادا کرتے رہے۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی نہایت بد نما اور بوسیدہ تھی ۔ پونے دو سو روپے ماہوار اُس کا کرایہ دیا کرتے تھے۔ ہزار دفعہ عرض کیا یہ کوٹھی اتنے کی نہیں ۔ آپ کیوں روپیہ برباد کرتے ہیں ۔ لیکن ہمیشہ یہی کہتے کہ یہ کوٹھی ایک بیوہ کی ہے جس کے بچوں کی گذران اسی کے کرائے پر ہے ۔ مجھے کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے ہوئے شرم آتی ہے ۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نہایت پابندی سے پونے دو سو روپے اس بیوہ کو بھیج دیا کرتے تھے ۔ لدھیانہ والی بیگم اور لاہور والی بیگم دونوں بیک وقت علامہ کے ہاں رہیں۔ لیکن ان کے درمیان سو کناپے کا کوئی معاملہ نہ تھا ۔ بالکل بہنوں کی طرح رہتی تھیں ۔ علامہ کو کبھی ایک لمحے کے لیے کوئی ایسی شکایت نہ پیدا ہوئی جو دو بیویوں والوں کو ہوا کرتی ہے ۔ وہ خود بھی ان دونوں میں انتہائی عدل مدنظر رکھتے تھے۔ ایک دفعہ میرے سامنے دونوں بیگموں کے لئے دو زیور بن کر آئے ۔ جب سنار نے آن کو تولا ، تو ایک زیور کوئی دو ماشے کم نکلا ۔ علامہ نے دو ماشے سونے کی قیمت اس زیور کے ساتھ اپنی بیگم کو ادا کر دی تاکہ اُسے بے انصافی کی شکایت نہ ہو۔

علی بخش عمر بھر آن کا خدمت گار رہا ۔ وہ ان کا شیفتہ تھا اور ان کو بھی علی بخش کے سوا اور کسی ملازم کے کام سے اطمینان نہ ہوتا تھا ۔ ایک دفعہ علی بخش چھٹی لے کر گیا اور اپنی جگہ رحمے کو رکھوا گیا ۔ جب واپس آیا تو رحمے نے پریشانی ظاہر کی کہ اب میں کہاں جاؤں گا ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا چلو تم بھی رہو ۔ اس کے بعد کہیں رحما چھٹی پر گیا اور اپنی جگہ ایک اور شخص دیوان کو رکھوا گیا ۔ جب واپس آیا تو یہ تیسرا نوکر پریشان ہوا ۔ علامہ نے اس کو بھی رکھ لیا ۔ آخر ہم نے علامہ سے کہا کہ آپ کے ہاں کے کام تو کچھ بھی نہیں اور نوکر تین تین ہیں ۔ آخر اس اسراف کا کیا مطلب ؟ لیکن اُنھوں نے سنی آن سنی کر دی اور تینوں نوکر آخر تک رہے ۔

ایک دفعہ علامہ نے دوستوں کے کہنے سننے سے ایک موٹر کار خرید لی اور ایک شخص فیروز اس کا ڈرائیور مقرر ہوا ۔ ڈاکٹر صاحب ''گل محمد'' قسم کے آدمی، نہ کہیں آنے کے نہ کہیں جانے کے ۔ فیروز دن بھر بے کار پڑا رہتا تھا ۔ آخر اس نے تنگ آ کر کوٹھی کے پھاٹک کے پاس ہی خوانچہ لگا لیا ۔ ڈرائیوری کی تنخواہ علامہ سے وصول کرتا رہا اور خوانچے سے بھی ڈیڑھ دو روپے روز پیدا کر لیتا تھا ۔ کبھی پندرہ بیس دن میں ایک دفعہ علامہ کہیں گئے تو موٹر میں انہیں لے گیا ورنہ اللہ اللہ ۔

ہم نے بارہا دیکھا، علامہ اقبال شدید درد کو برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ جب بھی درد ہوتا، خاصا شور مچاتے اور عملِ جراحی کا تو خیال بھی ان کے لیے ہول انگیز تھا۔ لیکن عام طور پر خطرات کے وقت اپنا دماغی توازن قائم رکھتے تھے ۔ علی بخش کا بیان ہے کہ جب ۱۹۰۵ء میں کانگڑہ کا مشہور زلزلہ آیا، میں علامہ کے پاس اندرونِ بھاٹی دروازہ بالا خانے میں رہتا تھا ۔ یہ زلزلہ نہ تھا، خدا کا قہر تھا ۔ کواڑ کھڑ کھڑا رہے تھے، چھتیں چیخ رہی تھیں، دیواریں یوں ڈول رہی تھیں گویا ابھی تمام مکانات پیوندِ خاک ہو جائیں گے اور حقیقت میں بہت سے مکانات گر بھی پڑے تھے۔ میری حالت دورانِ زلزلہ میں یہ تھی کہ کبھی کوٹھے پر چڑھ جاتا، کبھی پھر نیچے اتر آتا ۔ لیکن علامہ صاحب شروع سے آخر تک اپنے پلنگ پر لیٹے کتاب پڑھتے رہے اور ان میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ہوئی ۔ صرف ایک دفعہ میری گھبراہٹ دیکھ کر کتاب سے نظریں اٹھائیں اور کہا : ''علی بخش! یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو ۔ سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ''۔ یہ کہہ کر پھر بدستور مطالعہ میں مصروف ہو گئے ۔ *

قناعت کا یہ عالم تھا کہ کبھی روپیہ کمانے کی کوشش نہ کی ۔ وکالت کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی کبھار کوئی مقدمہ لے لیا ۔ شہرت و ناموری

* حیاتِ اقبال، تاج کمپنی ۳۵ ۔

حاصل ہو جانے کے بعد بہت سے لوگ علامہ کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن وہ صرف اتنے مقدمے لیتے جن کی آمدنی سے ان کا خرچ پورا ہو جاتا ۔ مصارفِ خانگی میں انتہائی کفایت شعاری مد نظر تھی ۔ آمد و خرچ کا حساب نہایت باقاعدہ رکھتے تھے اور آخر دم تک اس شعار پر کار بند رہے ۔ جب اواخر عمر میں علالت کی وجہ سے ذرائع آمدنی مفقود ہوگئے اور نواب صاحب بھوپال نے پانچ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، تو علامہ نے اپنے مصارف کے لیے اس کو کافی سمجھا ۔ سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھا :

> ''میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں ۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے ۔ ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایاں شان نہیں ۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا ۔ کیوں کہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے *''

سادگی پسندی کے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ ہو :۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شان دار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا ۔ رات کو جب اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، اس نے بوریے پر سو سو کر زندگی گذاری تھی ۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی ۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا ۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کیا ۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو

* مکاتیبِ اقبال، عطاءاللہ ۔

بلا کر اپنا بستر کھلوایا ۔ ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے ، غسل خانے ہی میں سوتے رہے،،* ۔

سادگی اور قناعت سے لازمی طور پر غیرت مندی پیدا ہوتی ہے ۔ کیوں کہ غیرت کا نقصان صرف احتیاج کی وجہ سے ہوتا ہے اور قانع آدمی محتاج نہیں ہوتا ۔ ایک دفعہ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر اباد دکن نے علامہ اقبال کو توشہ خانے سے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا ۔ چوں کہ یہ دوستانہ ہدیہ نہ تھا ، بلکہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا کہ اس سے کچھ لینا علامہ کی غیرت مندی کو گوارا نہ تھا ، اس لیے آپ نے ان اشعار کے ساتھ چیک واپس کر دیا :

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات†

جائز و ناجائز کے متعلق بے حد محتاط تھے ۔ وکیلوں کے پاس موکل عام طور پر تحائف و ہدایا لاتے ہیں اور یہ محنتانہ کے علاوہ ہوتے ہیں ۔ علامہ کو ان تحفوں کے قبول میں بھی تامل تھا ۔ چناں چہ انھوں نے سید سلیمان ندوی کو اس صورت سے آگاہ کر کے سوال کیا ہے ، کہ آیا ایسا مال مسلمان کے لیے حلال ہے ۔ ‡

* جوہر اقبال،مولانا مودودی۔ † ارمغانِ حجاز۔ ‡ مکاتیب اقبال حصہ اول۔

بزرگوں کے ادب میں انتہائی اہتمام کرتے تھے ۔ پروفیسر منظور احمد (ہمشیر زادۂ علامہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ علامہ اقبال سیال کوٹ میں رحیما عطار کی دوکان کے سامنے کھڑے تھے ۔ تختے پر حقہ دھرا تھا ۔ علامہ حقہ پی رہے تھے ۔ ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا ۔ طلائی جوتی پہنے ہوئے تھے ۔ جو پاؤں تختے پر تھا ، اس کا جوتا کسی قدر ڈھیلا تھا ۔ اتفاق سے مولوی سید میر حسن شاہ آدھر سے گزرے اور علامہ اقبال کی نظر ان پر پڑ گئی ۔ جھٹ تختے پر سے پاؤں نیچے کیا ۔ جوتے کاپاؤں تختے ہی پر چھوڑا اور صرف ایک ہی پاؤں میں جوتا پہنے اپنے اُستادِ محترم کی طرف لپکے ۔ حضرت شاہ صاحب آگے آگے تھے اور علامہ اقبال گردن جھکائے ان کے پیچھے پیچھے مؤدبانہ جا رہے تھے ۔ ایک پاؤں میں جوتا تھا ، دوسرے میں نہ تھا ۔ حضرت شاہ صاحب کو ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے اور پھر اپنا جوتا پہنا ۔ کیا آج کل کے زمانے میں اس ادب و اخلاق اور طبعی سعادت کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے ؟

غرض علامہ نہایت سادہ مزاج، درویش صفت، متوکل اور عاشق رسولﷺ مسلمان تھے ۔ علم و فضل اور شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی اُن کی منکسر مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا ۔ وہ غربا کے ساتھ بہت محبت سے ملتے تھے اور اُمرا کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ کرتے تھے ۔ مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندو ، سکھ اور عیسائی بھی ان سے دلی محبت کرتے تھے کیوں کہ اُن کا دل آئینے کی طرح صاف تھا جس میں کسی کی طرف سے بھی کدورت نہ تھی ۔ اللہ تعالٰی مغفرت فرمائے ۔

علامہ اقبالؒ

پانچواں باب

ارشاداتِ علامہ اقبال

بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

علامہ اقبال نے زندگی بھر معلّم و متکلّم کی حیثیت سے روزانہ بیسیوں تشنگانِ علم کو سیراب کیا لہٰذا ان کے ملفوظات و ارشادات کا ذخیرہ بے پایاں ہے۔ ان کے ہر ملاقاتی کے پاس ان کا کوئی نہ کوئی ارشاد محفوظ ہے اور ایسے تمام ملفوظات کی فراہمی و جمع آوری بے انتہا دشوار ہے۔ بہر حال اس فصل میں علامہ کے چند ارشادات پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض کی علمی و افادی حیثیت مسلّم ہے۔ بعض وجدانی کیف کے سرمایہ دار ہیں اور بعض کی نوعیت تفریحی ہے۔ لیکن ان کے مجموعی مطالعہ سے علامہؒ کے اندازِ فکر و ذکر کا پتہ چلتا ہے۔

اِلہامِ لفظی

ایک دفعہ کا ذکر ہے فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس تھا جس میں علامہ بھی مدعو تھے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے علامہ سے کہا کہ آپ اجلاس اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد ذرا ٹھیریے گا۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ ڈاکٹر لوکس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد علامہ کے پاس آئے اور سوال کیا کہ آیا آپ کے نزدیک آپ کے نبیؐ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا، جسے وہ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے یا الفاظ بھی نازل ہوتے تھے؟ علامہ نے صاف جواب دیا کہ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں
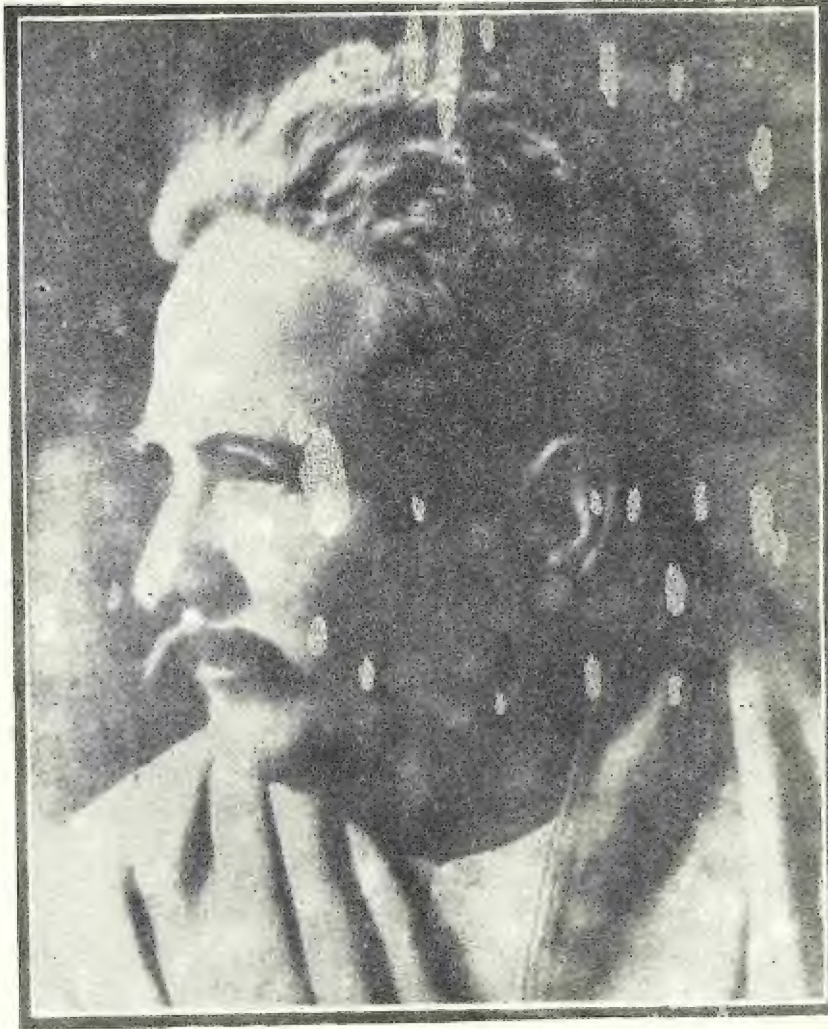
آنحضرت صلعم پر نازل ہوتی تھی - یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہامی ہیں۔ ڈاکٹر لوکس نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا ، آپ جیسا عالی پایہ فلسفی Verbal Inspiration (الہامِ لفظی) پر کیوں کر اعتقاد رکھ سکتا ہے ۔ علامہ نے ارشاد فرمایا :"ڈاکٹر صاحب ! میں اس معاملے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں - مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے - میں پیغمبر نہیں ہوں - محض شاعر ہوں - جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں اور میں انھیں بعینہ نقل کر لیتا ہوں - بارہا ایسا ہوا کہ میں نے ان اشعار میں کوئی ترمیم کرنی چاہی ، لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جوں کا توں رکھا - جس حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہو سکتا ہے ، تو اس میں کیا مقامِ تعجب ہے کہ آنحضرت صلعم پر قرآن کی پوری عبارت لفظ بہ لفظ نازل ہوتی تھی ؟" اس پر ڈاکٹر لوکس لاجواب ہو گئے ۔

کیفیتِ شعر

سوال کیا گیا کہ "آیا آپ پر شعر کہنے کی کیفیت اکثر طاری ہوتی ہے ؟ فرمایا نہیں ، ایسی کیفیت سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار ہوتی ہے - لیکن اس وقت مضامین کے ہجوم کی حالت وہی ہوتی ہے ، جیسے کسی ماہی گیر کے جال میں اس کثرت سے مچھلیاں پھنس جائیں کہ وہ پریشان ہو جائے اور سوچ میں پڑ جائے کہ کس کو پکڑوں اور کس کو چھوڑوں "

پھر فرمایا "عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل مدت کے بعد یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس سے پہلی کیفیت کے آخری لمحات میں جو اشعار کہے تھے ان کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے ۔ گویا یہ فیضان کے لمحے دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں - جب یہ کیفیت

ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان ، عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں "

قبض اور بسط

پھر فرمایا :"ایک دفعہ چھ سات سال تک مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ خدا نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے ۔چناں چہ میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ مبذول کردی ۔ لیکن ایک دن یک بیک پھر وہی کیفیت عود کر آئی ۔ وہ اس قدر بھر پور تھی اور اتنی دیر تک رہی کہ چھ سات سال کے جمود کی تلافی ہو گئی "

کسی قدر توقف کے بعد کہنے لگے کہ "جب جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے نے جرمن زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے ، اس لیے وہ جب کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے ۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتی "*

ایک اور موقع پر فرمایا :"مجھ میں فکرِ شعر کی جو تحریک پیدا ہوتی ہے ، اس کو جنسی تحریک سے بھی مماثل قرار دیا جاسکتا ہے اور حالتِ حمل سے بھی ۔ جب تک میں اس تحریک کی تعمیل میں اشعار نہیں کہ لیتا ، مجھے سکون میسر نہیں ہوتا اور وہ سکون تکان اور ماندگی لیے ہوئے ہوتا ہے "

حلال و حرام

ایک مرتبہ فرمایا :"فقر کی پہلی منزل کسبِ حلال ہے ۔ نورِ ایمان بھی کسبِ حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے " بغداد کے ایک بزرگ کے متعلق فرمایا :"ان کی ہمشیر قاضیِ شہر کے

* روزگار فقیر۔

پاس گئیں اور سوال کیا : "ہم غریب ہیں اور ہمارے گھر میں روشنی کا کوئی سامان نہیں ہے ۔ہمارے پڑوس میں ایک آدمی رہتا ہے ۔ اس کی شمعوں کی روشنی ہمارے صحن میں بھی پڑتی ہے ۔ میں اس روشنی میں مطالعہ کرتی ہوں ۔ فرمائیے کہ شریعت کے رو سے پڑوسی کے گھر کی روشنی کا یہ استعمال حلال ہے یا حرام ؟" قاضی تقویٰ کا یہ لطیف احساس دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا ۔ پوچھا "آپ کون ہیں ؟" خاتون نے جواب دیا "میں فلاں درویش کی ہمشیر ہوں ۔" قاضی نے کہا : "آپ کے لیے حرام ہے ۔ دوسروں کے حلال ۔" اس ذکر سے علامہ پر سخت رقت طاری ہو گئی ، جس سے ہم نشین بھی متاثر ہوئے ۔*

عقل و عشق

ایک دفعہ علامہ سے سوال کیا گیا : "عقل کی انتہا کیا ہے ؟" جواب دیا "حیرت ۔" سوال کیا گیا "عشق کی انتہا کیا ہے ؟" فرمایا "عشق کی کوئی انتہا نہیں ، عشق لاانتہا ہے ۔" مستفسر نے کہا "پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے : ''ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں'' مسکرا کر فرمانے لگے : "دوسرا مصرع بھی تو پڑھیے جس میں اپنی حماقت کا اعتراف کیا ہے کہ ''میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں'' †

خدا سے ملنا !

ایک بار ایک درویش علامہ کے پاس آیا ۔ آپ نے حسبِ عادت اس سے دعا کی درخواست کی ۔ پوچھا "دولت چاہتے ہو ؟" علامہ نے جواب دیا : "میں درویش ہوں ۔ دولت کی ہوس نہیں ۔" پوچھا "عزّ و جاہ مانگتے ہو ؟" جواب دیا : "وہ بھی خدا نے کافی بخش رکھی ہے ۔" پوچھا "تو کیا خدا سے ملنا چاہتے ہو ؟" جواب دیا : ''سائیں جی "کیا کہہ رہے ہو ۔ میں بندہ وہ خدا ۔ بندہ خدا سے کیوں کر مل سکتا ہے ؟ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا ۔ نابود ہو جاتا ہے ۔ میں قطرے کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاہتا ہوں'' ۔ یہ سن کر اس درویش پر

---

* راجا حسن اختر کا مضمون ۔ † ''دو قرآن'' از برق ۔

خاص کیفیت طاری ہوئی ۔ بولا : "بابا جیسا سنا تھا ، ویسا ہی پایا ۔ تو تو خود آگاہ راز ہے ۔ تجھے کسی کی دعا کی ضرورت نہیں ہے !'' *

بیعت کی اہمیت

علامہ اقبال نسبتِ بیعت کے قائل تھے ۔ چناں چہ خود مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں : ''یہی حال سلسۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں'' ۔ پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نے مئی ۱۹۳۵ء میں بیان کیا ''اقبال نے رازداری کے طور پر مجھے کہا تھا کہ میں اپنے والدِ مرحوم سے بیعت ہوں ۔ اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے ۔ وہ انہی سے بیعت تھے ۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا ۔''

مہاراجا سر کشن پرشاد کو ایک خط ۱۹۱۷ء میں لکھا ، جس میں علامہ اپنے صاحبزادے آفتاب اقبال کے متعلق لکھتے ہیں : ''لڑکا دہلی کالج میں پڑھتا ہے ۔ ذہین و طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے ۔ آج کل اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرادوں یا اس کی شادی کر دوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے ۔

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز   نازہا سازد بہم خیزد نیاز'' †

احیائے موتیٰ

ایک پروفیسر صاحب علامہ کی خدمت میں حاضر تھے ۔ مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی ۔ پروفیسر صاحب نے کہا ''ڈاکٹر صاحب آج تک کوئی قوم یا کسی قوم کی تہذیب مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہوئی'' ۔ کہنے لگے : ''یہ صحیح نہیں ۔ مختار قومیں عام طور پر اپنے محکوموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اس لیے مسلط کر دیتی ہیں کہ ان میں پھر سے کھوئی طاقت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکے ۔ اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ہے ۔ آپ محض ایک قوم

---

* مضمون سالک در شیرازہ ۔ † شاد اقبال ۔

کے متعلق فرماتے ہیں کہ مر کر زندہ نہیں ہوسکتی ۔ مگر خیال فرمائیے ، قرآن تو قیامت کا قائل ہے ۔ وہ تو کہتا ہے کہ ایک قوم کیا ، ساری دنیا مر کے ایک بار پھر زندہ ہو جائے گی"۔*

پنج ارکان کافی ہیں

سوال کیا گیا کہ "آپ کے مدراس والے لکچر بے حد مشکل ہیں ۔ اگر اسلام یا قرآن کا منشا وہی ہے جو آپ نے ان لکچروں میں بیان فرمایا ہے اور جس کو اس ترقی یافتہ زمانے کے بڑے بڑے اہلِ علم سمجھنے سے قاصر ہیں ، تو قرنِ اول کے عرب صحرا نشینوں نے اسے کیا سمجھا ہوگا؟ آپ نے فرمایا : "بنی الاسلام علی الخمس ۔ کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لیے اسلام کے پانچ ارکان (شہادت ، نماز ، روزہ ، زکوۃ ، حج) کا اجرا و انضباط کافی ہے ۔ چناں چہ اس کی محسوس اور عملی صورت عہدِ سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آسکتی ۔ اور تاریخ کا حافظہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔† (مطلب یہ تھا کہ عرب کے صحرا نشینوں نے پنج ارکانِ اسلام پر مخلصانہ عمل کر کے جو کچھ حاصل کر لیا تھا ، اسی کو حاصل کرنے کی کوشش میں ہم لوگ مشکل بحثوں میں پڑتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی وجدان بیدار ہو جائے)"۔

اصطلاحات صوفیہ

سوال کیا گیا : "صوفیہ کے اذکار مخصوصہ اور مصطلحات و مدارج (غوث ، قطب ، ابدال) وغیرہ کا تعلق نفسِ اسلام سے کیا ہے؟ صحابہ میں مومن ، صالح ، شہید ، صدیق وغیرہ الفاظ تو ملتے ہیں ، لیکن ان مدارج کا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا"۔ علامہ نے فرمایا : "واقعی جناب رسالت مآب اور صحابہ کرام کے زمانے میں نہ یہ اصطلاحات تھیں اور نہ اس قسم کے اذکار و اوراد ۔ اسلامی تصوف مجوس ، ہنود

*ملفوظاتِ اقبال (بیان سید الطاف حسین)۔ † ملفوظاتِ اقبال ، بیان عرشی۔

اور نصاریٰ کے تعلقات سے کافی حد تک متاثر ہوا ہے"۔*

برزخ

حیات بعدالممات کے متعلق استفسار کیا گیا۔ آپ نے فرمایا : "حیاتِ آخروی انسان کے ذوقِ حیات کی شدت پر منحصر ہے ۔ جس قدر کسی شخص میں ذوقِ زندگی زیادہ ہوگا ، اُتنا ہی اس کا زمانۂ برزخ کم ہوگا ۔ شہدا کا ذوقِ زندگی بہت بڑھا ہوا ہے ۔ اس لیے ان کے لیے کوئی برزخ نہیں ۔ اس زندگی سے آنکھ بند کرتے ہی ان کے لیے دوسری زندگی کا دروازہ کھل جاتا ہے"۔ عرض کیا : "عام مومنین کے لیے بھی برزخ کا کہیں ذکر نہیں"۔ فرمایا : "اس کا سبب بھی ذوقِ حیات ہے ۔ میں نے اس خیال کو اپنے ایک شعر میں بھی ظاہر کیا ہے ۔

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند   انسان بمیرد از بے یقینی"*

لاتسبّوا الدھر

ڈاکٹر سعیداللہ صاحب نے سوال کیا کہ حدیث میں ہے کہ دھر کو برا مت کہو۔ دھر خدا ہے ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ پہلے تو علامہ کچھ ہوں ہاں کرتے رہے ۔ آخر کہا کہ "حقیقت (Reality) کا لازمی جزو دھر ہے"۔ اتنا کہا اور خاموش ہوگئے۔ پھر فرمایا: "پیرس میں جب برگساں سے ملاقات ہوئی تو اسے نقرس کی شکایت تھی ۔ پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا ۔ نوکر کرسی کو چلا کر ادھر سے اُدھر لے جاتا تھا ۔ میں نے برگساں کو یہ حدیث سنائی تو کرسی سے اُچھل پڑا ۔ پوچھا "یہ کون کہتا ہے ؟" میں نے کہا "ہمارا رسول (صلعم) ۔ وقت کو ہم Eternal مانتے ہیں مگر وہ بھی گزر رہا ہے ۔ اگر ان دونوں کو ملایا جائے تو جس چیز کو ہم Now کہتے ہیں ، وہ Eternal Now بن جاتی ہے۔ Reality دو معنوں میں لی جا سکتی ہے ۔ ایک Extensive دوسرے Intensive ۔ مراد یہ ہے کہ ایک گیند اپنے محور کے گرد حرکت کرے اور ہر گردش میں اس کا رنگ بدل جائے ۔ 'وقت' کو اسی طرح تصور

* ملفوظات اقبال ، بیان عرشی۔

کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ رات اور دن کی تمیز ہم نے قائم کر رکھی ہے ورنہ وقت تو اس تمیز سے پاک ہے۔ زرتشت تو غالباً ایک خدا کو مانتا تھا مگر ایران میں یزدان واہر من کی ثنویت موجود تھی۔ ایک روشنی (دن) اور دوسرا تاریکی (رات) ان دونوں کا اجتماع Reality ۔ قرآن میں بار بار دن اور رات کا ذکر آتا ہے۔ہندو تو وقت کو مایا کہتا ہے۔ بدھوں نے اس کی اصلیت کو مانا ہے اور اس کے حصے کیے ہیں۔ وقت کا Atomic تصور بدھوں سے شروع ہوتا ہے۔"اس کے بعد علامہ خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا :"وقت کا تصور ''شخصیت'' کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان ''صداقت'' کا متلاشی تھا۔ ایران ''جمال'' کا اور عرب ''اچھائی'' کا۔ اسلام نے ان تینوں کو ''شخصیت'' Personality میں جمع کر دیا''۔*

تصوّف دین نہیں ، فلسفہ ہے

تصوف کے متعلق فرمایا :"تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے۔ یونانی تصوف ، ایرانی تصوف ، ہندوستانی تصوف سب انحطاط قومی کے نشان ہیں۔ اسلام کے اوائین دور کے صوفی زہاد تھے۔ ان کا مقصد زہد و تقویٰ تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعدالطبیعات اور نظریات شامل ہو گئے۔ اس کے بعد تصوف محض زہد نہیں رہتا۔ بلکہ اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ ''ہمہ اوست'' مذہبی مسئلہ نہیں ، فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے اور اس کی ضد کثرت نہیں ، شرک ہے۔ وہ فلسفہ اور وہ مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشو و نما کے منافی ہو ، بےکار چیز ہے۔ تصوف نے سائنٹیفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے ، تعویذ تلاش کرتے ہیں۔ گوش و چشم کو بند کر دینا اور صرف چشمِ باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جد و جہد سے کرنے کی جگہ سہل طریقوں کی تلاش

* ملفوظاتِ اقبال ، بیان ڈاکٹر سعیداللہ۔

ہے۔ شجر ممنوعہ میرا خیال ہے کہ تصوف ہی سے مراد ہے۔ خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکامِ الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن*

وجد و حال فنونِ لطیفہ

وجد و حال کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا:" ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک دستور بنا لیا ہے۔ یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے جوش جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں کچھ باقی نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ در اصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ رکھتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے اور وجد و حال انہی فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے . . . . مسلمان جہاں جہاں پہنچے ، وہیں کی موسیقی انھوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فنِ تعمیر کے سوا فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے ، وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بت بھی تھے جن میں قوت و ہیبت کی ایک شان ایسی تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ قوت کا یہی احساس حضرتِ عمرؓ کی مسجد اور دہلی کی مسجد قوۃالاسلام بھی پیدا کرتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا ، جب میں نے مسجد قوۃالاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا ، مغرب کا وقت تھا ، جی چاہا کہ

* ملفوظات اقبال ، بیان ڈاکٹر سعید اللہ۔

مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں ۔ لیکن مسجد کی قوت اور جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا ۔ میرا احساس یہ تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔"*

جہاد مصلحانہ بھی ہوتا ہے

سوال کیا گیا کہ "جہاد جارحانہ ہونا چاہیے یا دفاعی"۔ علامہ نے فرمایا :"عام طور پر تو دفاعی ہے لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے ۔ مثلاً اگر کسی قوم کی بد اخلاق اس قدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ قوموں کے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے ، تو ہمسایہ مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ وہ بزورِ شمشیر اس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کرے ۔ سلطان شہید ٹیپو نے ملیبار کے غیر مسلم وحشی باشندوں سے کہا تھا کہ تم لوگ بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہننا شروع کر دو ورنہ میں بزورِ شمشیر تم کو کپڑے پہننے پر مجبور کروں گا"۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ" قرآن میں مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعتِ حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیے ، اس لیے کہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ہوسکتی ہے اور مسلمان اگر امر و نہی کے فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں تلوار کا ہونا ضروری ہے ۔" †

اجتہاد کی ضرورت

اجتہاد اور تشکیلِ فقہِ جدید کی ضرورت عمر بھر علامہ کو محسوس ہوتی رہی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا ، وہی اسلام کا مجدّد ہوگا ۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے

* ملفوظات اقبال ، بیان پروفیسر حمید احمد خان ۔
† ملفوظات اقبال ، بیان خواجہ عبدالوحید ۔

بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا ۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں ، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں ۔ (سوائے ایران و افغانستان کے) ۔ مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں ۔ یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاءاللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی ہی کا منکر ہے ۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں ۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کا نظیر ناممکن ہے ! غرض یہ وقت عملی کام کا ہے ۔ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا ۔" *

سمن

فرماتے ہیں :"اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سر زمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے ۔ آپ کو خیرالقرون قرنی والی حدیث یاد ہوگی۔ اس میں نبی کریم صلعم فرماتے ہیں: میری امت میں تین قرنوں کے بعد 'سمن' (ولیظہر منہم السمن) کا ظہور ہوگا۔ میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار "وکیل" امرتسر میں شائع کیے تھے جس سے مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ 'سمن' سے مراد رہبانیت ہے جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی ۔ آئمہ محدثین نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ، یہ لکھا ہے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ہے مگر اسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں کھلتا . . . . . میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلۂ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

* مکاتیبِ اقبال، حصہ اول ۵۱ - ۵۰ ۔

خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے، مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں، حالاں کہ حضرت محی الدین (عبدالقادر جیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔"*

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے۔ ایک روسی ترک عالم علامہ موسیٰ جاراللہ لاہور میں مقیم تھے اور چوں کہ فارسی خوب جانتے تھے اس لیے علامہ اقبال کے کلام کو بے حد ذوق شوق سے پڑھتے اور جو مقامات سمجھ میں نہ آتے، ان کی تشریح کے لیے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے۔ بلکہ اشعار کے معانی کے علاوہ اسلامی نظریۂ سیاست و نظامِ حکومت کے متعلق بھی علامہ سے استفسار کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے۔ ایک دن کا واقعہ ''ملفوظات'' میں درج ہے:

"موسیٰ جاراللہ تشریف لے آئے۔ پردے کے متعلق ضمنی طور پر ایک بحث چھڑ گئی۔ علامہ نے فرمایا: 'فطرت کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جس میں تخلیقی صفات ہوں، پردے میں رہے۔ خود خدا کو دیکھیے بے حجاب نہیں۔ زندگی کو دیکھیے۔ اگرچہ اس کے آثار کو ہم دیکھ سکتے ہیں، مگر بذاتِ خود وہ ہماری نظر سے پنہاں ہے........ اس پر موسیٰ جاراللہ نے کہا کہ پردے کے قائل تو ہم بھی ہیں، لیکن حجابِ رُو کے قائل نہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ قرآن تو حجابِ رو کا قائل ہے۔

اسلامی نظامِ سیاسی پر اظہارِ خیالات کی ابتدا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''انسان ایک فردِ یکتا یا گوہرِ یکتا ہے جس کی ترکیب روح اور مادہ سے ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ نظامِ حکومت جو انسان کی محض جسمی یا مادی ضروریات پوری کرسکے، انسان کی تشفی نہیں کرسکتا اور نہ نوع انسانی اس نظام کے وضع کردہ راستے پر گامزن ہو کر ارتقائی سیادت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ اسلام دین و سیاست میں تفریق اسی لیے روا نہیں رکھتا کہ انسان کی ہیئت ترکیبی

*مکاتیبِ اقبال حصہ اول صفحہ ۷۸-۷۹۔

ان ہر دو عناصر کے امتزاج کی متقاضی ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت نہ جمہوریت ہے، نہ ملوکیت۔ نہ ارسٹا کریسی ہے، نہ تہیا کریسی، بلکہ ایک ایسا مرکب ہے جو ان تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزّہ ہے۔" *

جنگ اور قرآن

کسی معترض نے کہا کہ اقبال اس دورِ ترقی میں جنگ کا حامی ہے۔ اس پر فرمایا ''میں جنگ کا حامی نہیں ہوں اور نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدودِ معیّنہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہوسکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی دو صورتیں ہیں، محافظانہ و مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے، مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم)۔ دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ہے (۹:۴۹) میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیموئل ہور جمعیۃ اقوام کے اجلاس میں Collective Security کہتا ہے، قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے...... جمعیت اقوام کی تاریخ بھی ثابت کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

جنگ کی مندرجہ بالا دو صورتوں کے سوا میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا حرام ہے۔ علیٰ ہذا دین کی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانا حرام ہے۔" †

نشانِ ہلال

"نشان ہلال کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، یہ نشان نبی کریم صلعم اور صحابہ کے عہد میں مروّج نہ تھا۔ بعض مغربی مؤرخین نے لکھا ہے کہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ہوا۔ بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ میرے خیال میں اس کو تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً صلیبی لڑائیوں کے

* ملفوظاتِ اقبال ۲۴۳-۲۴۴۔ † مکاتیبِ اقبال حصہ اول ۲۰۲-۲۰۳۔

زمانے میں اس کی ترویج شروع ہوئی (صلیبی جنگوں کے تذکرے میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے) اور کچھ عجب نہیں کہ صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے اس کا آغاز ہوا ہو ۔ صلاح الدین ایوبی ترک نہ تھے ، کُرد تھے ۔ سنی دنیا اس نشان کو اپنا قومی نشان تصور کرتی ہے ۔ ایران کا نشان اور ہے ۔ میرے خیال میں اس کا استعمال محض اتفاق طور پر شروع ہوا ۔ صلیبی سپاہی اپنے سینوں ، لباسوں اور علموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے ۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کر لیا ۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا ۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ۔ تاریخی پہلو سے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے موجد نے اس کے نمو کے خیال سے جاری کیا یا چاند سورج سے اپنا سلسلۂ نسب ملانے کے خیال سے ۔ مگر تمام امت کا اس پر صدیوں سے اجماع ہو چکا ہے ۔ جن اسلامی قوموں کا نشان اور ہے وہ اس نشان پر کبھی معترض نہیں ہوئیں ۔ حدیث صحیح ہے کہ میری امت کا اجماع ضلالت پر نہ ہوگا ۔ اس واسطے اس کو ضلالت تصور کرنا ٹھیک نہیں۔"*

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ

پنجاب کے ایک مشہور پیر علامہ سے ملنے آئے اور کہنے لگے : "آج کل سرکار کی طرف سے لوگوں کو زمین مل رہی ہے،مجھے بھی ایک درخواست لکھ دیجیے"۔ علامہ نے فرمایا : "آپ کو معلوم ہے ، یہ درخواست کس کے نام لکھنی چاہیے ؟" وہ ذرا جھجکے تو علامہ نے کہا : "ایک مشہور کتاب ہے ، جس کا نام ہے قرآن ۔ یہ کتاب خدا نے اپنے آخری نبی پر اتاری تھی جن کا نام تھا محمدؐ ۔ ان کی وفات کو تیرہ سو سال ہو گئے ہیں ۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے ۔ اب اگر کہو تو خدا کے نام درخواست لکھ دوں"۔ پیر صاحب پر ان باتوں کا اثر ہوا ۔ انہوں نے کہا : "خدا مالک ہے ۔ اس نے پیدا کیا ہے تو کھانے کو بھی دے گا ۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا"۔

* مکاتیب اقبال حصہ اول ۳۳۷--۳۳۶۔

کئی سال بعد وہی پیر صاحب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ نے مجھے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانے سے بچایا اور اللہ نے مجھے زمین بخش دی ۔ پوچھا "وہ کیوں کر ؟" پیر صاحب نے بتایا کہ میں دہلی گیا تو وہاں میرے بہت سے فوجی مریدوں نے ایک دعوتِ چائے دی ۔ جس میں اپنے کمان افسر کو بھی بلایا اور آخر میں اس سے کہا کہ ہمارے پیر صاحب کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ہے ، اس لئے سرکار کی طرف سے انہیں زمین ملنی چاہیے ۔ کمان افسر نے سپہ سالار کو لکھا ۔ انہوں نے گورنر پنجاب سے کہہ کر پیر صاحب کو زمین دلوادی ۔ *

اقبال اور عمل

ایک دفعہ بلوچیوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ مختلف سیاسی معاملات پر دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی ۔ وفد کے ایک ممبر نے کہا کہ آپ کی تعلیمات نے سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا ۔ لیکن یہی شکایت ہے کہ آپ نے خود نمونۂ عمل پیش نہیں کیا ۔ علامہ نے جواب دیا : "کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا ہے اور تمہارے سامنے عمل کی شاہراہ پیش کر دی ہے ؟" . . . . . پھر فرمایا : "دنیا میں جلیل القدر انبیاء کے سوا اور کوئی مثال نہیں کہ کسی شخص نے خود ہی کوئی اصولی نظریہ قائم کیا ہو اور خود ہی اس پر عمل کر کے دکھایا ہو"۔†

مولوی محمد علی ، ایم ۔ اے ۔ کینٹب ، نے بھی ایک دفعہ اسی قسم کا سوال کیا تھا جس کا جواب علامہ نے یہ دیا کہ اگر میں اپنی پیش کردہ تعلیمات پر عمل بھی کرتا تو شاعر نہ ہوتا ، بلکہ مہدی ہوتا ۔

مسولینی

جن دنوں علامہ روما میں مقیم تھے ، مسولینی نے اپنے عملے کا ایک آدمی آپ کے پاس بھیجا اور کہا کہ آپ مجھ سے ملیے ۔ علامہ تشریف لے گئے ۔ دوران گفت‌گو میں

* حیات اقبال تاج کمپنی ۱۱۷-۱۱۶۔ †سیرت اقبال ۔ طاہر فاروق ۱۱۱۔

مسولینی نے پوچھا میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کو ضرور اپنایا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے ۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنالیں تو آپ کو دنیا و عقبیٰ میں سرخروئی نصیب ہوگی ۔“

دورانِ گفتگو میں شہروں کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا : ”ہمارے نبی صلعم نے ہدایت کی تھی کہ جب مکۂ معظمہ یا مدینۂ منورہ کی آبادی ایک خاص حد سے تجاوز کر جائے تو لوگ دوسرا شہر آباد کر لیں ۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ اگر کسی شہر کی آبادی ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے تو اس کی تہذیبی قوت و اثر کے عناصر کم ہو جاتے ہیں ۔ اس لیے کیا اچھا ہو کہ ہر شہر کی ایک خاص حد مقرر کر دی جائے ۔“ یہ سن کر مسولینی نے دونوں ہاتھ میز پر مارے ۔ اور چلّا کر کہنے لگا ”واقعی یہ بہترین نظریہ ہے“ ۔*

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ اقبال کا یہ قول نقل کیا کہ مسولینی نے دورانِ ملاقات میں مجھ سے پوچھا ”افریقہ کے مسلمان مجھ سے ناخوش ہیں ۔ ان کے اطمینان کے لیے میں کیا رویہ اختیار کروں؟“ میں نے اس سے کہا کہ ان سے اچھا سلوک کیجیے اور ان کی تعلیم کا معقول انتظام کر دیجیے ۔ جب آپ ان کی جسمانی و روحانی آسودگی کا بندوبست کریں گے تو وہ آپ سے ناخوش نہ رہیں گے ۔

مادرانہ شفقت

حضرت علامہ تیسری شادی کے بعد مدت تک اولاد سے محروم رہے ۔ ایک دن شام کے وقت وہ گھر میں گئے تو کیا دیکھا کہ والدۂ جاوید طوطے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کر بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں ۔ یہ کیفیت دیکھ کر علامہ کا دل بھر آیا اور ان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ”الٰہی! اس خاتون ں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے ۔ اب اسے اولاد بھی عطا فرما“ یہ دعا ول ہوئی ۔ چناں چہ اسی سال جاوید سلّمہ پیدا ہوئے ۔*

* روزگار فقیر ۔

آزادیِ نسواں

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی ، وہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر ضرور پشیمان ہوئی ہے ۔ عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی ۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگایا جائے ، جنھیں مرد انجام دے سکتا ہے ، تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا ۔ مثلاً عورت کو جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے ٹائپسٹ ، یا کلرک بنا دینا نہ صرف قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے ، بلکہ انسانی معاشرے کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش ہے ۔“*

اسلامی شاعری

ایک مقامی ہندو کالج کے چند طلبہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے : ”آپ سب کچھ مسلمانوں ہی کے لیے لکھتے ہیں ، ہمارے لیے کچھ نہیں لکھتے“ ۔ فرمایا : ”تم نے میری کونسی کتاب پڑھی ہے ؟“ انہوں نے جواب دیا ”بانگِ درا“ ۔ آپ نے بانگ درا منگا کر ان سے کہا کہ اس میں سے ان نظموں کو گنو جنھیں تم خالص اسلامی کہتے ہو ۔ جب انہوں نے ایسی نظمیں گنیں تو کچھ زیادہ نہ نکلیں ۔ اس پر آپ نے کہا : ”اب تم اپنے ظرف کا اندازہ لگاؤ ۔“ پھر فرمایا ”یہ تو محض تمھارے سوال کا جواب تھا ۔ اب حقیقت سنو ۔ ایک شخص کی اپنی والدہ بیمار اور جاں بلب ہے ۔ کیا اس حالت میں تم اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ اسے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور کی تیمارداری میں مصروف ہو جائے ؟“ طلبہ نے جواب دیا ”ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا ۔“ فرمایا : ”میری قوم کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ میں اسے اس حالت میں چھوڑ دوں ، تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غداری کا مترادف نہ ہوگا ؟“†

راقم الحروف (سالک) نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا اور علامہ

* روزگار فقیر ۔ † راجا حسن اختر کا مضمون ۔

کی خدمت میں تلمّذ کے لیے عریضہ لکھا ۔ جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:-

بے پیرا فن

"ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے ۔ اگر آپ کی طبیعت شعر گوئی کے لیے موزوں ہے تو آپ خودبخود اس پر مجبور ہوں گے ۔ رہا زبان کا مسئلہ ، تو میں اس کے لیے موزوں استاد نہیں ہو سکتا ۔ مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک بے پیرا فن ہے ۔ لوگ اس مثل کو شاعری کی تحقیر کے لیے استعمال کیا کرتے ہیں ۔ لیکن میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں کسی پیر استاد کی ضرورت نہیں ۔ آپ کے کلام سے ہونہاری ٹپکتی ہے ۔ اگر آپ کا یہ شوق قائم رہا ، تو آپ کسی دن بہت اچھے شاعر ہوں گے :

اگر آپ شاگردی پر مصر ہی ہوں تو داغ صاحب کے شاگردوں میں سے دو کے نام لکھتا ہوں ۔ ان سے رجوع کیجیے ۔ سید محمد احسن مارہروی مارہرہ ضلع ایٹہ ، اور منشی حیات بخش رسا مصاحب دربار رام پور ۔

آپ "مفیدالشعرا"، "رسالہ تذکیر و تانیث" (جلال) اور "تحفۃ العروض" ضرور دیکھ لیجیے ۔

فقیروں سے ربط

فرمایا : "جن دنوں میں انارکلی میں رہتا تھا ، ایک دفعہ جاڑے کے موسم میں رات کے دو بجے ایک فقیر نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ علی بخش نے دروازہ کھولا ۔ میں نے علی بخش سے پوچھا کون ہے ؟ اس نے کہا ایک فقیر ہے ۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے ۔ میں بستر سے اٹھا ، فقیر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا ۔ میں نے پوچھا "آپ کس طرح تشریف لائے ؟" کہنے لگے "مجھے دوسری جگہ جانے کا حکم ملا ہے ۔ میں جا رہا ہوں ، اس لیے آپ سے ملنے آ گیا ۔" میں نے پوچھا "آپ اس دنیا کے لیے کیا کر رہے ہیں ؟" کہنے لگا "اب امام مہدی کے ظہور کا وقت آ گیا ہے ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔" اگرچہ شدت کی سردی تھی ، مگر اس فقیر نے رات کے دو بجے دہی کی لسی پینے کی خواہش ظاہر کی ۔ علی بخش گیا ، کسی دکاندار کو جگا کر لسی بنوا لایا ۔ اس فقیر

نے پی اور کہا "اب میں چلتا ہوں ۔" میں نے کہا "اس وقت تو ریل نہیں ملے گی ۔" اس نے کہا "فقیر کو ریل سے کیا غرض ؟"

فرمایا : "اکثر لوگ مہدی کے منتظر ہیں ، مگر وہ آنے ہی میں نہیں آتا ۔ ایک اور بزرگ لاہور میں ہوتے تھے ۔ جب کبھی ملتے ، مہدی کے آنے کی تاریخ بتا جاتے ۔ وہ تاریخ گزر جاتی تو ایک نئی تاریخ مقرر کر دیتے ۔ اسی انتظار میں ان کا انتقال ہو گیا ۔"*

ایک پیر اور مرید

ایک دن ایک مشہور پیر صاحب حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ان کا ایک مرید عین دوپہر کے وقت پسینے میں شرا بور ہانپتا ہوا آیا اور پیر صاحب کے قدموں پر گر گیا ۔ اس نے کہا : "حضور کی آمد کی اطلاع ملی تھی ۔ صبح ہی صبح مغل پورہ سے چل دیا ۔ کئی مقامات پر پوچھتا ہوا یہاں پہنچا ہوں ۔ حضور میری حالت بہت خراب ہے ۔ دو سو روپے کا مقروض ہو چکا ہوں ۔ آپ میرے لیے دعا فرمائیں ۔" یہ کہہ کر دو روپے جیب سے نکال کر پیر صاحب کی نذر کیے ۔ پیر صاحب نے وہ دو روپے اپنی جیب میں داخل کیے اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور مرید پر پھونک مار دی ۔ وہ بے حد خوش ہوا کہ بس اب میری مشکلات کا دور ختم ہوا ۔ اس کے بعد علامہ نے خود دعا مانگنی شروع کر دی اور کہا "خدایا ! آج کل کے پیر گمراہ ہو گئے ہیں ۔ انہیں ہدایت دے ۔ اے خدا آج کل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کر پیروں کے کہنے میں نہ آئیں" ۔ پیر صاحب نے ٹوکا لیکن علامہ برابر دعا مانگتے رہے ۔ "الٰہی یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا مقروض ہو گیا ہوں ، لیکن یہ نہیں جانتا کہ اب یہ دو سو دو روپے کا مقروض ہوچکا ہے" ۔ پیر صاحب اس پر بہت برہم ہوئے ، لیکن علامہ نے کہا "میں تو یہ دعا اس وقت ختم کروں گا کہ آپ اس غریب کے

---

* ملفوظات اقبال ، ڈاکٹر سعید اللہ کا بیان

دو روپے واپس کر دیجیے اور اس کو کہیں نوکر کرا دیجیے"۔ ناچار پیر صاحب نے دو روپے مرید کو واپس کر دیئے اور نوکری دلوانے کا وعدہ کیا ۔*

دستِ غیب

دستِ غیب کا ذکر ہو رہا تھا ۔ علامہ نے فرمایا کہ مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے پیر حضرت غوث علی قلندر نے مولانا وحیدالدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمھارا باپ ہمارا دوست تھا ۔ ہم تمھیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں ۔ جب روپے کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفے کو پڑھنا ۔ پانچ روپے تمھیں مل جایا کریں گے ۔ پیر صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے ۔ والدہ کو سارا قصہ سنایا ۔ آنھوں نے کہا" گھر میں کچھ نہیں ۔ نہ آٹا نہ دال "۔ وظیفہ پڑھا گیا ۔ تکیے کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے ۔ مولانا کا بیان ہے کہ آنھوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ پڑھ کر تعلیم حاصل کی ۔ جب خود روپیہ کمانے لگے تو وظیفہ پڑھنا بند کر دیا ۔ سر سید سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے سر سید سے کہا کہ آپ نیچری ہیں مگر ہمارے وظیفے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں ۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے کہ مجھ سے مولوی وحید الدین سلیم نے خود بیان کیا کہ میرے والد کے انتقال کے بعد میری والدہ حضرت غوث علی شاہ قلندر کی خدمت کیا کرتی تھیں اور حضرت کا کھانا پکا دیا کرتی تھیں ۔ ایک دن مجھے شاہ صاحب نے بلا کر کہا ۔ میاں لڑکے ! تم سید زادے ہو اور تم اور تمھاری والدہ ہماری بہت خدمت کرتے ہو ۔ آؤ ، ہم تمھیں ایک چیز بتائیں ۔ جب کبھی تم پر کوئی ایسا وقت آئے کہ تمھارے پاس کھانے تک کو کچھ نہ ہو ، تو یہ کلمات پڑھ لیا کرو ۔ تمھیں تکیے کے نیچے سے دس روپے مل جایا کریں گے اور دیکھنا ، یہ راز کسی کو نہ بتانا ، ورنہ ان کلمات کا اثر معدوم ہو جائے گا اور جب تم کو

* ملفوظات اقبال ، بیان عبدالرشید طارق ۳۱۶ ۔

حلال کی کمائی حاصل ہونے لگے تو ان کلمات کو محض حرصِ زر کی غرض سے ہرگز نہ پڑھنا ۔ کچھ مدت کے بعد افلاس حد کو پہنچ گیا تو میں نے ایک رات وہ کلمات پڑھے اور صبح تکیے کے تلے دس روپے مل گئے ۔ ایک دفعہ اور بھی ایسی ضرورت لاحق ہوئی تو یہ تجربہ کامیاب رہا ۔ اس کے بعد چوں کہ ہماری معاش کا بندوبست ہو گیا ، اس لیے پھر کبھی یہ کلمات پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔" مولوی وحیدالدین سلیم نے یہ واقعہ سر سید کو بھی سنایا ، جو ان معاملات میں بڑے سخت نیچری تھے لیکن سن کر خاموش ہو گئے ۔ کچھ بولے نہیں ۔

علامہ نے یہ بھی بتایا کہ سر سید کی طرح ان کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی ۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا "حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے ، اسکا کچھ علاج کیجئے"۔ پیر صاحب نے کہا "ذرا دیکھیں"۔ سر سید کے والد نے سر آگے بڑھایا ۔ پیر صاحب نے ان کی ڈاڑھی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور فرمایا :"بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی" اور سچ مچ رسولی غائب تھی ۔ *

دماغ اور رِحم

فرمایا اہلِ یورپ جن باتوں کا صدیوں تجربہ کر کے اُن سے متنفر ہو چکے ہیں ، یورپ کے ایشیائی مقلدین انہی چیزوں کے پیچھے جا رہے ہیں ۔ مثلاً آزادیٔ نسواں ۔ علامہ نے فرمایا "مجھے عورتوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں ہے ۔ یہ اپنے مخصوص مشاغل مثلاً خانہ داری میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں"۔ پھر فرمایا "عورت کو دماغ کمزور ملا تھا ، اسلئے کہ جہاں تک اسکا تعلق ہے اسکی تخلیقی قوت دماغ کے بجائے رِحم سے تعلق رکھتی ہے ۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت رِحم سے"۔†

* ملفوظاتِ اقبال ، بیان ڈاکٹر سعید اللہ ۔ † ملفوظاتِ اقبال ، بیان خواجہ عبدالوحید ۔

جمال الدین افغانی مجدّد تھے

"میرے نزدیک مہدی ، مسیحیت اور مجدّدیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی و عجمی تخیّلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیّلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے بعض علما یا دیگر قایدینِ امت کو مجدّد یا مہدی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مثلاً محمد ثانی فاتحِ قسطنطنیہ کو مؤرخین نے مہدی لکھا ہے۔ بعض علمائے امت کو امام اور مجدّد کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ زمانۂ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدّد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر ، ایران ، ترکی اور ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔ مؤخر الذکر ہی اصل میں مؤسّس ہے زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا۔ اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدّد نہیں کہا یا انھوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا، تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہلِ بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔"*

لطائف و ظرائف

چھوٹے میاں کا شعر

بعض اوقات علامہ بچوں کے ساتھ شعر میں بھی دل لگی کیا کرتے تھے۔ نواب سر ذوالفقار علی خان اُن کے نہایت عزیز دوست تھے اور وہ اکثر نواب صاحب کے ہاں جایا کرتے تھے۔ نواب زادہ خورشیدعلی‌خان ان دنوں چھوٹے سے تھے۔ کوٹھی ''زر افشاں'' (کوئنز روڈ، لاہور) کے سبزہ زار پر یو کلپٹس کے درخت تھے جن سے گوند نکلا کرتی تھی۔ نواب زادہ جن کی عمر اس وقت کوئی نو دس سال کی ہوگی، دن بھر ان درختوں سے گوند کھرچ کر ڈبوں میں بھرا کرتے۔ نواب زادہ صاحب

* مکاتیب اقبال حصہ دوم ۲۳۲-۲۳۱

کا بیان ہے کہ علامہ ہماری موٹر کار میں آتے اور آتے ہی مجھے بلاتے۔ '' چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو ؟'' میں کہتا ''گوند نکال رہا ہوں''۔ تو فرماتے۔ع:

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

میں کہتا "بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرعے پر ختم ہو گئی"۔ فرماتے "ہاں بھئی ، ابھی تو ایک ہی مصرع ہوا ہے"۔ میں روز یہی شکایت کرتا کہ آپ کیسے شاعر ہیں۔ دوسرا مصرع ہی نہیں کہہ سکتے۔ آخر ایک دن تشریف لائے تو فرمایا "لو چھوٹے میاں ، آج ہم نے دوسرا مصرع بھی کہہ لیا :

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہوگی ان کی شادی کسی نیک بخت سے*"

قلندری اور سکندری

ایک دن فرمایا :"چند دن ہوئے میں باہر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لیے تہمد باندھے آگیا۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری ٹانگیں دبانے لگا۔ میں مزے سے بیٹھا رہا اور وہ میرے پاؤں دباتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا "آپ کس طرح آئے"۔ فقیر نے کہا :"میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا تمھارے علاقے کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کیا گیا ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ"۔ میں نے کہا "مجھے تو اس قلندری کے بارے میں اب تک کوئی اطلاع نہیں پہنچی"۔ میری اس بات کو بھی وہ فقیر قلندری کے کوچے کی کوئی رمز سمجھا اور چپ چاپ ٹانگیں دباتا رہا۔ اتنے میں چودھری محمد حسین آ گئے اور آتے ہی سر سکندر کے متعلق کوئی بات شروع کرنے ہی کو تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا :"چودھری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجیے۔ آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں"۔"†

* بیان نواب زادہ خورشید علی خان۔ † ملفوظاتِ اقبال ، بیان ڈاکٹر سعید اللہ۔

علامہ اور جرنیل

جب جرنیل نادر خان سے علامہ اقبال کی پہلی ملاقات ہوئی تو جرنیل صاحب نے بہت تعجب کا اظہار کیا۔ کہا: "آپ اقبال ہیں! میں تو سمجھتا تھا کہ کوئی لمبی "ڈاڑھی والے" بزرگ صورت ہوں گے"۔ علامہ نے برجستہ جواب دیا۔ "میں آپ سے بھی زیادہ حیران اور مایوس ہوں۔ جرنیل کے لقب سے میں تو سمجھتا تھا کہ آپ بڑے قوی ہیکل، دیو قامت آدمی ہوں گے۔ لیکن اتنا دبلا پتلا جسم تو جرنیلی کا شایانِ شان نہیں معلوم ہوتا"۔*

وطن کی بہنیں

اخبار "وطن" کے ایڈیٹر مولوی انشاءاللہ خاں علامہ کے ہاں اکثر حاضر ہوتے تھے۔ اُن دنوں علامہ انار کلی بازار میں رہتے تھے اور وہیں طوائفیں بھی آباد تھیں۔ میونسپل کمیٹی نے ان کے لیے دوسری جگہ تجویز کی۔ چناں چہ انھیں وہاں سے اٹھا دیا گیا۔ اس زمانے میں مولوی انشاءاللہ کئی مرتبہ علامہ سے ملنے گئے لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ علامہ باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن علامہ گھر پر مل گئے۔ مولوی صاحب نے مزاحاً کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! جب سے طوائفیں انار کلی سے اٹھوا دی گئی ہیں، آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا"۔ علامہ نے جواب دیا: "مولوی صاحب! کیا کیا جائے وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہی ہیں"۔ مولوی صاحب کٹ گئے۔ †

مصلحِ موعود

ایک خاص فرقے کا ایک آدمی جو اپنے آپ کو مصلح موعود کہتا ہے، ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا مجھ سے اللہ تعالیٰ باتیں کرتا ہے۔ علامہ ہنس کر کہنے لگے: "خدا کی سب باتیں مان نہ لیا کرو۔ وہ بعض باتیں یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے"۔ اس نے کہا کہ میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن

---

* ملفوظاتِ اقبال، بیان ڈاکٹر سعیداللہ۔

† روزگار فقیر۔

جاؤں گا اور دہلی کو پایۂ تخت بناؤں گا"۔ علامہ فرمانے لگے: "ہم تو غالباً اس وقت موجود نہ ہوں گے۔ البتہ جاوید کو نہ بھولنا اور کم از کم مہرولی کا علاقہ اسے ضرور بخش دینا"۔

علامہ کے مرض الموت میں یہ شخص عیادت کے لیے آیا اور کہنے لگا۔ "آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہوگا"۔ علامہ ہنسے اور کہنے لگے "واہ ہم اور آپ کو نہ پہچانیں! ولی را ولی می شناسد" *

برداشتِ احسان

علامہ اپنے استاد مولوی میر حسن شاہ کا بے حد احترام کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے سامنے کبھی شعر سنانے کی جرأت بھی نہ کی۔ فرماتے ہیں: "زندگی بھر شاہ صاحب کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ وہ بھی اتفاق طور پر۔ مولوی صاحب کسی کام کے لیے گھر سے نکلے۔ ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں تھا، ان کے ساتھ تھا۔ اس کا نام احسان تھا۔ مولوی صاحب نے فرمایا، اقبال اسے گود میں اٹھالو۔ میں نے اسے اٹھا تو لیا، مگر تھوڑی دور جا کر تھک گیا۔ چناں چہ میں نے بچے کو ایک دکان کے تختے پر کھڑا کر دیا اور خود سستانے لگا۔ مولوی صاحب بہت آگے نکل چکے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ نہ پایا تو لوٹے اور میرے قریب آ کر فرمایا: "اقبال! اس کی برداشت بھی دشواری ہے؟" میری زبان سے بے اختیار نکلا...... "تیرا احسان بہت بھاری ہے" †

کتے نہیں، آدمی

فقیر سید وحیدالدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ فقیر صاحب اپنے عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر علامہ سے ملنے آئے۔ موٹر میں ان کے کتے بھی تھے۔ یہ لوگ علامہ کی خدمت میں جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ہی میں چھوڑ دیا۔

---

* راجا حسن اختر۔ † روزگار فقیر۔

تھوڑی دیر بعد علامہ کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی: "ابّا جان موٹر میں کتّے آئے ہیں"۔ علامہ نے ان حضرات کی طرف اشارہ کر کے کہا: "نہیں بیٹا، یہ تو آدمی ہیں"*

کاڈلیور آئل

یہ سب کو معلوم ہے کہ لارڈ کچنر جس جہاز میں آخری سفر کر رہے تھے، وہ غرق ہو گیا تھا اور ان کی نعش بھی نہ ملی تھی۔ اس زمانے میں ایک افواہ اڑی کہ لارڈ کچنر بچا لیے گئے ہیں۔ ایک دوست نے علامہ سے ذکر کیا کہ سنا ہے لارڈ کچنر زندہ ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں! کاڈلیور آئل کی صورت میں واپس آگیا ہو تو تعجب نہیں۔

چودھری شہاب الدین

پنجاب کے جلیل القدر اربابِ سیاست میں چودھری سر شہاب الدین کی شخصیت بہت ممتاز تھی۔ آپ بڑے قابل وکیل اور نہایت کامیاب صدر مجلس قانو[illegible] تھے۔ علامہ اقبال سے پرانی دوستی تھی۔ رنگ کالا تھا۔ نہایت گراں ڈیل [illegible]ور بالا بلند آدمی تھے اور کھانے پینے میں دور دور تک اپنا حریف نہ رکھتے تھے۔ علامہ قریب قریب ہر ملاقات میں ان پر ایک آدھ پھبتی کہہ دیتے اور اگر وہ برا مانتے تو کہتے کہ تمہیں دیکھتے ہی مجھ پر لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لیے مجھے پھبتی سے نہ روکا کرو۔

ایک دن چودھری صاحب سیاہ سوٹ پہنے بار روم میں آگئے۔ علامہ نے دیکھا تو چونک کر بولے: "ہائیں چودھری صاحب ننگے ہی چلے آئے؟"

ایک دفعہ شاھدرہ میں پارٹی ہوئی۔ بہار کا موسم تھا۔ چودھری صاحب اور علامہ دونوں موجود تھے۔ چودھری صاحب نے از سر تا پا سفید لباس

* یہاں مرزا جلال الدین۔

پہن رکھا تھا۔ علامہ نے بے اختیار پنجابی میں کہا: "او دیکھو، کپاہ وچ کٹّا وڑ گیا"! (یعنی دیکھنا! کپاس کے کھیت میں بھینس کا کٹڑا گھس گیا)۔

ایک دن چودھری صاحب کی کوٹھی میں افطار پارٹی تھی۔ چودھری صاحب نے پانی مانگا۔ علامہ نے آدمی کو پکار کر کہا، دیکھو بھئی! چودھری صاحب کے لیے بالٹی میں پانی لانا۔

چودھری صاحب نے اپنی عالی شان کوٹھی بنائی، جو اپنی وسعت و عظمت اور بلندی میں نظیر نہ رکھتی تھی۔ علامہ سے کہا "اس کوٹھی کا نام سوچنا"۔ انھوں نے کہا "سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیو محل رکھ دو"۔

چودھری شہاب الدین اپنی قانونی و انتظامی قابلیت اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بلدیۂ لاہور کے صدر منتخب ہو گئے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے۔ سر شجاع الملک مہترِ چترال لاہور تشریف لائے۔ نواب سر ذوالفقار علی خان کے ہاں پُر تکلف دعوت دی گئی اور نواب صاحب نے علامہ اقبال سے کہا کہ آپ ہزھائینس سے مقامی معززین کا تعارف کرا دیجیے۔ علامہ اقبال تعارف کرانے لگے۔ جب چودھری صاحب کی باری آئی تو کہا "اعلیٰ حضرت! ایں خان بہادر چودھری شہاب الدین صدرِ بلدیۂ لاہور ہستند۔ گویا کہ مہترِ لاہور می باشند"۔

مجلس میں ایک قہقہہ لگا۔ چودھری صاحب جل کر کوئلہ ہو گئے۔ مہتر صاحب کچھ نہ سمجھے اور علامہ کا لطیفہ کامیاب رہا۔

چھٹا باب

اقبال کے اُستادِ محترم

حضرت مولانا حافظ سیّد میر حسن شاہ رح

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

گذشتہ صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کے مسلم معاشرے پر یاس و حرمان کی جو کیفیت طاری تھی، اس کا صحیح اندازہ کرنا بے حد دشوار ہے۔ ہزار سال کی جمی ہوئی مسلم حکومت افسانۂ پارینہ ہو چکی تھی۔ مسلمان دس صدیوں کی آقائی و خسروی سے محروم ہو کر غلام و محکوم بن چکے تھے۔ شرفا کے بڑے بڑے خاندان تباہ اور تہذیب کے بڑے بڑے مراکز ویران ہو چکے تھے۔ زوال و انحطاط کے زمانے میں مسلمانوں نے علم و تعلیم سے جو غفلت اختیار کی تھی، اس کے اثرات قوم کی ثقافتی و اخلاقی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ گئے تھے۔ پرانے علوم کی افادی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور علومِ جدیدہ مسلمانوں کے لیے علما کے فتوے کے ماتحت شجرِ ممنوعہ قرار دیئے جا رہے تھے۔ مُلاّئیت کے جمود نے اسلام کو ایک تیرہ و تار ظلمت کدہ بنا رکھا تھا اور نام نہاد روشن خیالی خود مذہب ہی کے بندھنوں سے آزاد ہو رہی تھی۔ انگریز قوم نے ہندوستان کی اس صورتِ حالات کو دینِ مسیحی کی ترویج و تبلیغ کے لیے نہایت موافق پایا۔ پادریوں کی ایک فوج کی فوج ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں مسلمانوں کی متاعِ ایمان پر ڈاکے ڈالنے لگی۔ ثقافت

اسلامی اور فکرِ اسلامی کے زاویے سنسان ہو رہے تھے اور مسلم معاشرے کا جہاز بادِ مخالف کے جھونکوں اور طوفانِ انقلاب کی موجوں کے تھپیڑوں سے بری طرح ڈگمگا رہا تھا۔ جن لوگوں کے پاس بزرگوں کے ترکے میں کچھ دولت موجود تھی، وہ شراب خوری اور عیاشی میں مستغرق تھے۔ جائدادیں خالصے لگ رہی تھیں اور امیروں اور شریفوں کی اولاد کے لیے اس کے سوا کوئی شغل باقی نہ رہا تھا کہ جلسہ ہائے عیش منعقد کریں۔ طوائفوں سے داغ کی غزلیں سنیں اور مصاحبین کی خوشامد درآمد کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حالت میں بھی دربارِ مغلیہ کے امرا کا ہم پلہ سمجھتے رہیں۔ نوجوانوں کے عقاید نہایت سرعت سے بگڑ رہے تھے۔ مسیحیوں نے اسلام پر ایسے اعتراضات کی بوچھاڑ کر رکھی تھی جن کا جواب اُن نوجوانوں سے ہرگز ممکن نہ تھا، جو اپنے دین سے بالکل بے بہرہ تھے اور نہیں جانتے تھے کہ جس اسلام پر مخالفین حملے کر رہے تھے وہ اصلی اسلام نہ تھا، بلکہ محض مُلاّ کا اسلام تھا۔ چناں چہ بے شمار مسلمان نوجوان اسلام کی طرف سے بد عقیدہ اور بے زار ہو گئے اور مسیحی مذہب کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ سر سید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے علاوہ جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہی تھا کہ انھوں نے غیر مذاہب کے اعتراضات کا مقابلہ کرنے کے لیے عقلی بنیادوں پر مسلّماتِ اسلامی کی تعبیر و توجیہ کی اور نوجوانوں کو ارتداد سے بچا لیا۔

سر سید کی تحریک اور اُن کی دینی مساعی کا یہ نتیجہ تو ضرور ہوا کہ بڑی حد تک ارتداد کا انسداد ہو گیا، لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بے خبری کا عالم وہی رہا۔ وہ دین سے روز بروز علیحدہ ہوتے گئے اور صرف دنیاوی معاملات میں مسلمان رہ گئے۔ یہی کیفیت تھی جس سے متاثر ہو کر بعض علمائے دین نے علوم دینیہ کی تعلیم کے مراکز قائم کیے۔

لیکن اس دو عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان نوجوان دو کیمپوں میں بٹ گئے ۔ دیوبند کے طلبہ کو دنیا سے کوئی واسطہ نہ رہا اور علی گڑھ کے نوجوانوں کو دین سے کوئی سروکار نہ رہا ۔ لیکن اس پُرآشوب زمانے میں بھی بعض گوشوں کے اندر ایسے منورالفکر اہلِ علم موجود تھے ، جو مصالحِ دین اور مصالحِ دنیا دونوں کو مدِنظر رکھ کر بعض مسلمان بچوں کی تربیت کر رہے تھے ۔ اقبال انھیں بچوں میں سے تھے جن کو مولانا سید میر حسن شاہ جیسا مجمع البحرین استاد مل گیا اور اسی استاد نے حقیقت میں اقبال کو اقبال بنایا ۔ اگر اقبال کو بچپن ھی میں شاہ صاحب کے آگے زانوے تلمّذ تہ کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوتی ، اور وہ ایک عام مسلمان لڑکے کی طرح چرچ مشن ھائی سکول اور مرے کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج لاہور سے پڑھ پڑھا کر ایم ۔ اے کر لیتے ، تو اپنی ذہانت و طباعی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو جاتے ۔ اور نوکری نہ کرتے تو وکیل بن جاتے ۔ پھر ہمارے بعض بڑے بڑے وکیلوں کی طرح روپیہ جمع کر کے فوت ہو جاتے اور آج ان کا کوئی نام بھی نہ جانتا ۔

لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ نابغہ یوں رائیگاں ہو جائے ۔ چناں چہ اس نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن کے اثر سے اقبال کی فطری ودیعتوں کو جلا نصیب ہوئی اور علومِ جدیدہ کے علاوہ علومِ اسلامی اور عرفان و تصوف کے اسرار و معارف بھی ان پر کھل گئے ۔ چوں کہ اقبال کے والدِ محترم کا میلان دین اور تصوف کی طرف تھا ، اس لیے وہ سیالکوٹ کے ایک مشہور عالمِ دین مولانا غلام حسن کی مجلس میں استماعِ معارفِ دینیہ کے لیے حاضر ہوا کرتے تھے ۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے بچے کو صرف علومِ دین پڑھائیں گے ۔ چناں چہ اقبال مولانا غلام حسن کے ہاں پڑھنے بٹھا دیے گئے ۔ مولانا سید میر حسن شاہ صرف عالمِ دین ہی نہ تھے ، بلکہ ادبیات ، لسانیات ، ریاضیات اور تفسیر

حضرت مولوی سید میر حسن شاہ (استاد علامہ رحمہ)

به شکریه خان بہادر سید محمد عبداللہ صاحب
ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ و سشن جج پنجاب
(نبیرۂ مولوی صاحب رحمہ)

قرآن کے بھی بہت بڑے ماہر تھے ۔ وہ بھی کبھی کبھی مولانا غلام حسن
کے ہاں جایا کرتے تھے ۔ ایک دن انھوں نے اقبال کو وہاں دیکھ کر
اور اس کی شکل صورت اور ذہانت سے متاثر ہو کر پوچھا :"یہ کس کا
بچہ ہے ؟"جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے ، تو انھوں نے
خود شیخ صاحب سے کہا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ۔
اسے میں پڑھاؤں گا ۔ چناں چہ اقبال شاہ صاحب کے سپرد ہو گئے اور اس
تعلق کا آغاز ہوا جو مدت العمر قائم رہا ۔

حضرت شاہ صاحب نے کچھ شیخ نور محمد کی دوستی کی وجہ سے
اور کچھ اقبال کی طباعی اور ہونہاری کے باعث ان کی تعلیم و تدریس
کی طرف خصوصی توجہ فرمائی ۔ اس زمانے کا عام معمول یہ تھا کہ
اس قسم کے معلمین بچوں کو گلستان ، بوستان ، سکندر نامہ ، یوسف زلیخا ،
جامی ، انوار سہیلی ، صرف بہائی ، صرف میر ، ہدایتہ النحو ، کافیہ ،
کنزالدقائق ، قدوری وغیرہ پڑھایا کرتے تھے ۔ شاہ صاحب کے ہاں بھی یہی
قاعدہ تھا ۔ لیکن ان کے اسلوب تدریس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محض
رٹانے پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اپنے طلبہ میں فارسی اور عربی کا صحیح
لسانی ذوق پیدا کر دیتے تھے۔اکثر ایسا ہوتا کہ فارسی کا ایک شعر
پڑھاتے تو اس کے مترادف اشعار اردو اور پنجابی میں بھی پڑھ دیتے اور
اس وقت تک سمجھاتے رہتے جب تک اس کا مطلب پوری طرح طالب علم
کے ذہن نشین نہ ہو جاتا ۔ انھیں عربی فارسی اردو پنجابی کے ہزاروں اشعار
یاد تھے ۔ اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ موقع پر انھیں
برمحل اشعار فوراً یاد آ جاتے ۔ اس میں کسی تکلف و تردد کی ضرورت
نہ پڑتی ۔ کچھ مدت تک اقبال صرف شاہ صاحب سے پڑھتے رہے ۔ آخر شاہ
صاحب ہی نے ان کو سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل
کرا دیا ، جس میں وہ خود مدرس مقرر ہو گئے تھے ۔ اس زمانے میں

شاہ صاحب کو چالیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی ۔ اس کے بعد معمول
یہ ہو گیا کہ اقبال مدرسے میں تو عام کورس پڑھتے ، لیکن وہاں سے
واپس آ کر انھی تدریسات میں مصروف ہو جاتے جو شاہ صاحب نے
شروع کرا رکھی تھیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک نہایت باقاعدگی سے
جاری رہا جب وہ سکاچ مشن کالج سے ایف ۔ اے پاس کر کے مزید تعلیم
کے لیے لاہور چلے آئے ۔

چوں کہ شاہ صاحب نے سالہا سال تک اقبال کو عربی ، فارسی ، علم و
حکمت ، ادبیات ، تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کو صحیح راستے پر
لگا دیا تھا اور ان میں علوم قدیمہ و اسلامیہ کے لیے بے پناہ تشنگی پیدا کر دی
تھی ، اس لیے اقبال جب کبھی موقع پاتے ، سیالکوٹ آ کر شاہ صاحب سے
اپنے شکوک رفع کراتے۔ مزید سبق لیتے اور غوامض علوم پر اپنے استاد
کی ہدایت و رہنمائی سے غور فکر کرتے ۔

حضرت شاہ صاحب کی علمی معلومات بے حد وسیع تھیں اور پھر وہ تعلیمی
و تدریسی مصروفیتوں کے باوجود مسلسل و متواتر مطالعہ بھی کرتے رہتے
تھے ۔ جہاں کہیں کوئی نایاب یا کمیاب کتاب پاتے اور اس کے خریدنے کی
استطاعت نہ ہوتی تو اسے نقل کر لیتے اور قلمی کتابوں کی نقلیں تو انھوں
نے اپنے ہاتھ سے بے شمار کی ہوں گی ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ، اقبال لاہور میں
پروفیسر تھے ۔ اس زمانے میں کہیں سیالکوٹ جانا ہوا تو کیا دیکھتے ہیں ،
کہ شاہ صاحب فلو گل کی نجوم الفرقان کو نقل کر رہے ہیں ۔ پوچھا"حضرت!
آپ اس مطبوعہ اور ضخیم کتاب کو نقل کرنے کی زحمت کیوں فرماتے ہیں؟" جواب
دیا "کیا کروں ۔ اس کی قیمت چھبیس روپے ہے اور مجھ میں مقدرت نہیں۔" اقبال
نے اسی وقت نجوم الفرقان خرید کر نذر کی ۔

ابھی شاہ صاحب کا عالم شباب ہی تھا کہ ان کی ہمشیر سخت بیمار
ہو گئیں ۔ یہاں تک کہ بچنے کی کوئی صورت نہ رہی ۔ ایک دن شاہ صاحب

ان کے پاس بیٹھے تھے ۔ وہ آبدیدہ ہوئیں اور کہنے لگیں کہ بس اب میں مر جاؤں گی اور کوئی میری قبر پر بھی نہ آئے گا ۔ شاہ صاحب بھی آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا اللہ تمہیں شفا دے ۔ لیکن اگر کوئی حرج مرج ہو گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک جیوں گا روزانہ تمہاری قبر پر آیا کروں گا ۔ ہمشیر کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا اور شاہ صاحب کی بینائی ۱۹۲۸ء یعنی انتقال سے کوئی دو سال پہلے زائل ہوگئی۔ اس پچاس سال کی مدت میں ان کا مستقل معمول یہ رہا کہ روزانہ صبح کے وقت ہمشیر کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے ۔ تہجد اور نماز فجر کے بعد وہ قبرستان جاتے اور آتے جاتے ہوئے بھی بعض شاگردوں کو سبق دیتے جاتے ۔ سوائے ان دنوں کے کہ شاہ صاحب کو سیال کوٹ ہی سے باہر جانا پڑا ہو ، اس معمول میں ایک دن بھی ناغہ نہ ہوا۔

حضرت شاہ صاحب نہایت راسخ الاعتقاد اور عبادت گزار مسلمان بزرگ تھے۔ لیکن ان کی وسیع المشربی مسلّم تھی ۔ عمر بھر کسی کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ کسی نے پوچھا تو یہی کہا کہ میں مسلمان ہوں ۔ مسلمانوں کے علاوہ بے شمار ہندو، سکھ اور عیسائی بھی ان کے شاگرد تھے اور ان میں سے اکثر بڑے بڑے عہدوں اور رتبوں پر پہنچے ۔لیکن ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کی جوتیاں ان کے آگے رکھتے اور رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب کی طرف پشت نہ کرتے تھے بلکہ دروازے تک پچھلے پاؤں چل کر جاتے ۔ شاہ صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ نہایت معمولی لیکن صاف ستھرا لباس پہنتے اور بے حد مستغنی آدمی تھے ۔ بارہا صوبے کے بڑے بڑے کالجوں سے اُن کو پروفیسری کی پیش کش ہوئی، لیکن ان کی قناعت نے انہیں چرچ مشن کالج ہی سے وابستہ رکھا جہاں اُن کی تنخواہ تا دمِ آخر ایک سو بیس روپے سے متجاوز نہ ہونے پائی ۔ اقبال کی سادگی اور ان کی قناعت اور ان کا استغنا مسلّم ہے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے استغنا بھی شاہ صاحب ہی سے سیکھا ہے ۔

سر سید احمد خاں کو پنجاب میں جن دو چار بزرگوں پر پورا اعتماد تھا اور جن کا وہ بے حد احترام کرتے تھے ، ان میں شاہ صاحب کا نام نہایت ممتاز ہے ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں باقاعدہ شامل ہوتے ۔ ۱۸۷۳ء میں سر سید سے شاہ صاحب کی پہلی ملاقات ہوئی ، جب شاہ صاحب کی عمر بمشکل تیس برس کی ہوگی ۔ یہ ملاقات پنجاب ہی میں ہوئی تھی ، کیوں کہ سر سید اپنے دورے پر یہاں آئے تھے ۔ ۱۸۷۷ء میں جب علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد وائسرائے نے رکھا ، اس تقریب میں شاہ صاحب بھی شریک ہوئے ۔ سر سید نے وائسرائے کے اعزاز میں بہت بڑا ڈنر دیا ۔ شاہ صاحب کو بھی مدعو کیا لیکن آپ نے کہا کہ میں ایسی دعوتوں میں شریک نہیں ہو سکتا ۔ چناں چہ سر سید نے اپنے فرزند سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور کہا کہ جب تک شاہ صاحب کھانا نہ کھا لیں ، ان کی خدمت میں حاضر رہنا اور اُن کی باتیں سننا ۔ ۱۸۹۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا ۔ شاہ صاحب کے پاس ممبری کا ٹکٹ تھا جو اتفاق سے گم ہو گیا ۔ دروازے پر رضاکاروں نے روک دیا ۔ اتنے میں محسن الملک کی نظر پڑ گئی ۔ اُنہوں نے پکار کر رضاکاروں سے کہا "کیا غضب کرتے ہو ۔ ایسے بزرگ کو روکتے ہو جس نے کانفرنس قائم کی ہے !"

سر سید کی وفات کا تار ملا تو شاہ صاحب کالج جا رہے تھے ۔ راستے میں اقبال مل گئے ۔ ان سے کہا کہ سر سید فوت ہو گئے ہیں ۔ مادۂ تاریخ کے لیے فکر کرنا ۔ اقبال ایک دوست کی دوکان پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب کے فرزند سید ذکی شاہ سے کہنے لگے "تاریخ کا مادہ نکل آیا ہے ۔ ابھی کالج جا کر شاہ صاحب کو سنا دو۔" مادہ تھا : "انی متوفیک ورافعک الیّ و مطہّرک۔" سید ذکی شاہ نے یہ مادہ شاہ صاحب کو سنایا تو فرمانے لگے "بہت خوب ہے ۔ لیکن میں نے بھی ایک مادہ نکالا ہے اور وہ ہے غفرلہ" ۔ مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" میں دونوں تاریخوں کا ذکر تھا ۔

لیکن نام کسی کا نہ لکھا تھا ۔ شاہ صاحب نے خود خواجہ حالی کو خط لکھا اور ناموں کے درج نہ ہونے کی شکایت کی ۔ حالی نے جواب میں لکھا : "مجھے ناموں کا علم نہیں تھا ۔ آئندہ ایڈیشن میں اس فرو گزاشت کی تلافی کر دی جائے گی ۔"

مرزا غلام احمد قادیانی اور مولوی حکیم نور الدین بھی شاہ صاحب کی بے حد عزت کرتے تھے اور مرزا صاحب تو ایک مدت تک سیال کوٹ میں رہ بھی چکے تھے ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ، شاہ صاحب کے داماد سید خورشید انور بعارضۂ دق بیمار ہو گئے ۔ شاہ صاحب انہیں قادیان لے گئے تا کہ حکیم نور الدین سے علاج کرائیں ۔ قادیان پہنچ کر مسجد میں گئے اور اس دریچے میں جا بیٹھے جہاں مرزا صاحب بیٹھتے تھے ۔ لوگ ان کو جانتے نہ تھے۔ انھوں نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا۔ لیکن وہ پھر دریچے کے پاس ہی آ بیٹھے۔ مرزا صاحب آئے تو سلام کا معمولی جواب دے کر بیٹھ گئے اور متوجہ نہ ہوئے ۔ شاہ صاحب نے کہا "غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں ۔" مرزا صاحب نے غور سے دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے ، اور مولوی عبدالکریم سیال کوٹی کو بلا کر کہا کہ شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ۔ دو باتوں کی خاص طور سے تاکید کی ۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ہی صبح بھوک لگ جاتی ہے ، کیوں کہ یہ عادتاً کالج جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں ، اس لیے ان کی حسبِ خواہش صبح ہی صبح کھانا دے دیا جائے ۔ دوسرے انہیں اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے دی جائیں ۔ ساتھ ہی کہا "صبح چائے میرے ساتھ پئیں ۔" بہت خاطر تواضع کی اور جب شاہ صاحب واپس جانے لگے تو مرزا صاحب دو میل تک یکے کے ساتھ ساتھ آئے ۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاہتا ہوں ۔ شاہ صاحب نے ایک طرف جا کر ان کی باتیں سنیں ۔ بعد میں مفصل معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوئیں۔ نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیا۔

شاہ صاحب کے معمولات کی کیفیت یہ تھی کہ نماز تہجد اور نماز فجر سے فارغ ہو کر قبرستان جاتے۔ ہمشیر اور اپنے احباب کی قبروں پر فاتحہ

پڑھتے ۔ ساڑھے سات بجے کے قریب واپس آتے ۔ راستے میں بعض شاگردوں کو سبق دیتے اور گھر پہنچ کر پھر تدریس میں مصروف ہو جاتے ۔ کالج کے وقت سے پہلے جلدی جلدی سے کھانا کھاتے اور کالج کو چل دیتے ۔ یہاں بھی راستے میں شاگرد ساتھ لگے رہتے ۔ دن بھر کالج میں پڑھا کر واپس آتے تو پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا ۔ گھر کا سودا بازار سے خود لایا کرتے تھے ۔ اس آمد و رفت میں بھی شاگرد پیچھا نہ چھوڑتے اور سبق کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پاتا ۔ ہر آٹھویں دن ایک روپیہ بھناتے اور دو دو پیسے بچوں میں تقسیم کر دیتے ۔ قرآن کریم سے بے حد شغف تھا ۔ حافظ بھی تھے ۔ ایک منزل روز ختم کرتے ۔ تہجد میں ایک پارہ روزانہ پڑھتے ۔ مولانا ابراہیم سیال کوٹی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ قرار پایا ، کہ ایک ہی شب کی تراویح میں پورا قرآن ختم کیا جائے ۔ حافظ نے پڑھنا شروع کیا۔ بعض مقتدی تو تین تین چار چار پاروں ہی میں بیٹھ گئے ۔ میں بھی بمشکل اٹھارہ پارے کھڑے ہو کر سن سکا ، لیکن شاہ صاحب نے پورا قرآن تراویح میں کھڑے ہو کر سنا ۔ قرآن سے یہ شیفتگی اور یہ قوتِ برداشت عدیم المثال ہے ۔ اسی بیاسی برس کی عمر میں بھی فرض ، سنت اور نفل کھڑے ہو کر ہی پڑھتے رہے ۔

سکاچ مشن سکول اور اس کے بعد کالج میں شاہ صاحب برابر پڑھاتے رہے ۔اس درس گاہ کے انگریز پرنسپل ہمیشہ شاہ صاحب کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ کالج ٹائم ٹیبل مرتّب کیا جاتا تو پرنسپل تاکید کرتا کہ سب سے پہلے شاہ صاحب سے پوچھو ۔ اگر انہیں نئے ٹائم ٹیبل میں کوئی دقت معلوم ہو تو ان کی سہولت کے مطابق بدل دو ۔ ایک دفعہ شاہ صاحب بیمار تھے ۔ یکم اپریل کو کسی طالب علم نے پرنسپل سے جا کر کہہ دیا کہ شاہ صاحب فوت ہو گئے ۔ پرنسپل گیرٹ بھاگا ہوا شاہ صاحب کے ہاں پہنچا اور ان کو صحیح سلامت پا کر قصہ سنایا۔ اس کے بعد واپس آ کر اس طالب علم کو سکول سے خارج کر دیا اور کہا کہ "اپریل فول" بھی مقصود تھا تو شاہ صاحب کے متعلق ایسی اطلاع کیوں دی ؟ پرنسپل گیرٹ بہت کنجوس مشہور

تھا ۔ لیکن جب شاہ صاحب کی آنکھوں کا آپریشن ہوا اور کالج جانا مستقل طور پر بند ہو گیا ، تو اس نے شاہ صاحب کی پوری تنخواہ پنشن کے طور پر مقرر کر دی ۔ تنخواہوں کے رجسٹر میں بطورِ اعزاز سب سے اول شاہ صاحب کا نام لکھا جاتا ۔ پرنسپل بھی اپنا نام شاہ صاحب کے بعد درج کرتا ۔ جب تک شاہ صاحب زندہ رہے ، کالج سے ان کو پوری تنخواہ پنشن کے طور پر ملتی رہی ۔ بلکہ بطورِ اعزاز کالج کے ہال کا نام بھی "میر حسن ہال" رکھ دیا گیا ۔

شاہ صاحب کی غریب پروری ضرب المثل بن گئی تھی مثلاً چند واقعات سنیے ۔ سیال کوٹ میں کشمیریوں کا ایک غریب لڑکا غلام محمد تھا جس کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا ، کیوں کہ اس کے والدین بالکل بے استطاعت تھے ۔ شاہ صاحب نے اس کی تعلیم کا بار اٹھا لیا۔اس کی فیس معاف کرائی اور اس کو اعلیٰ تعلیم دلوائی ، یہاں تک کہ یہی غلام محمد پنجاب کا کامیاب ترین ہیڈ ماسٹر تسلیم کیا گیا ۔ ڈاکٹر عبدالحمید بٹ سابق ڈائرکٹر ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ انہی غلام محمد صاحب کے صاحبزادے تھے ۔ ماسٹر غلام محمد نہایت قابل اور درد مند مسلمان تھے ۔ راقمِ کتاب کے پاس اکثر تشریف لاتے تھے ۔ مسلمانوں کی بد حالی کے ذکر پر نہایت درد مندانہ آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے اور مولوی میر حسن کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے تو کبھی نہ تھکتے تھے ۔

ایک غیر مسلم دھوبن شاہ صاحب کے کپڑے دھویا کرتی تھی ۔ اس کا ایک لڑکا ساتھ آیا کرتا تھا ۔ شاہ صاحب نے اس لڑکے کو پڑھانا شروع کیا ۔ جب وہ ذرا سیانا ہوا تو مسلمان ہو گیا ۔ رکن الدین نام رکھا گیا ۔ شاہ صاحب نے اس کو پوری تعلیم دلوائی ۔ ایک اور شاگرد نہال سنگھ نام رکن الدین کا ہم سبق تھا ۔ دونوں میٹرک سے ایم ۔ اے تک برابر اول دوم آتے رہے ۔ رکن الدین سیشن جج ہو کر ریٹائر ہوئے ۔ نہال سنگھ ڈپٹی کمشنر بن گئے اور سبکدوش ہونے کے بعد پٹیالہ میں وزیر ہوئے ۔ رکن الدین حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں مریدوں کی طرح حاضر ہوتے اور بوقتِ رخصت پچھلے پاؤں چل کر

دروازے تک پہنچتے ۔ نہال سنگھ راستے میں شاہ صاحب کو دیکھ پاتا تو گاڑی سے اتر آتا ۔ ادب سے شاہ کے پیچھے پیدل چلتا ۔

ایک اور واقعہ سنیے ، ہنگامہ سن ستاون کے کئی سال بعد ایک سید نوجوان احمد شفیع نہایت تباہ حالی میں سیال کوٹ پہنچے ۔ وہ اپنے والد اور بھائی سے الگ ہو چکے تھے ۔ گزر بسر کا کوئی سہارا نہ تھا ۔ پہلے دس روپے ماہوار پر نوکر ہوئے ۔ پھر شاہ صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور ہیڈ ماسٹر ہو گئے ۔ پھر محکمۂ تعلیم کو چھوڑ کر محکمۂ مال میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ خوب ترقی کی، یہاں تک کہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے ۔ یہ وہی سید احمد شفیع ہیں جن کی صاحب زادی مہدی بیگم سے شمس العلما مولوی ممتاز علی کی شادی ہوئی ۔ گویا یہ ہمارے سید امتیاز علی تاج کے نانا تھے ۔

شاہ صاحب کے بےشمار شاگردوں میں علامہ اقبال کے علاوہ جو حضرات ممتاز تھے ، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں : نامور عالم مولانا محمد ابراہیم سیال کوٹی ۔ مشہور مؤرخ منشی غلام قادر فصیح۔مولوی احمد دین ریڈر اور ان کے فرزند محمد مسیح پال یعنی امین حزیں ۔ مولوی ظفر اقبال پی.ای.ایس ریٹائرڈ ۔ عبدالقیوم پی.ای.ایس ریٹائرڈ ۔ لالہ بھیم سین اور ان کے صاحب زادے جسٹس کنور سین سابق پرنسپل لا کالج ، لاہور ۔ مشہور سکھ لیڈر سردار کھڑک سنگھ ۔ سردار حضورا سنگھ وکیل ۔ پنڈت بیلی رام وکیل ۔ لالہ نرنجن داس جج ۔ رکن الدین سشن جج ۔ نہال سنگھ ڈپٹی کمشنر ۔ شیخ ظہور الدین تحصیل دار ۔ سردار چڑت سنگھ ڈسٹرکٹ جج ۔ ماسٹر غلام محمد ۔ ڈاکٹر جمشید علی راٹھور اور بے شمار دوسرے حضرات ۔

لطف یہ ہے کہ شاہ صاحب نے مبتدیوں سے لے کر منتہیوں تک سب کو پڑھایا اور کسی سے کوئی حق الخدمت وصول نہ کیا ۔ گھر پر جو طلبہ پڑھنے آتے ، ان کی خدمت خود کرتے ۔ کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے ۔ پروفیسر جمشید علی راٹھور اور ماسٹر غلام محمد نے ذاتی اعتبار سے شاہ صاحب

کی بہت خدمت کی۔ ان کے سوا شاہ صاحب نے کسی کو ذاتی خدمت لینے کی تکلیف نہیں دی ۔ عام طور پر اردو میں بات چیت کرتے۔ زبان بہت صحیح اور سلجھی ہوئی تھی ۔اخلاق مجسّم تھے ۔ سادگی ، سنجیدگی ، تواضع ، احسان مندی طبیعت کی نمایاں خصوصیات تھیں ۔ بے حد ذہین و طباع تھے اور حافظہ حیرت انگیز طور پر قوی تھا ۔ علامہ اقبال بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ شاہ صاحب کی صحبت سے اطمینانِ خاطر پیدا ہوتا تھا اور فکر مندی دور ہو جاتی تھی ۔ اس زمانے میں ایک صوفی بزرگ کیسر شاہ تھے ۔ شاہ صاحب اور شیخ نور محمد (والدِ اقبال) کو ان سے بہت عقیدت تھی ۔ حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی کے ساتھ خصوصیت سے ارادت تھی ۔ یعنی شاہ صاحب ہر فرقے کے بزرگ کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے اور اس معاملے میں نہایت وسیع المشرب واقع ہوئے تھے ۔

مولانا ظفر اقبال فرماتے ہیں : "جب میں لاہور میں تعلیم پاتا تھا تو ایک مرتبہ یونیورسٹی کے کسی امتحان کے پرچے مولانا میر حسن شاہ کے پاس تھے ۔ میرے ایک استاد نے مجھے کسی طالب علم کے پرچے کے لیے شاہ صاحب کے پاس بھیجا اور تاکید کی. کہ اس طالب علم کو اچھے نمبر دے دیئے جائیں ۔ مجھے شاہ صاحب کی روش کا علم تھا لیکن استاد کے حکم سے مجبور ہو کر گیا ۔ وہاں پہنچ کر شاہ صاحب سے گزارش کی کہ میں اپنے ایک استاد کا پیغام آپ کو پہنچانا چاھتا ہوں ۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ۔ شاہ صاحب نے پیغام سن کر فرمایا ۔ یہ لوگ دین اور دنیا کو الگ الگ سمجھتے ہیں ۔ ان سے کہہ دیجیے ، پیغام مل گیا ۔ میں خوب غور کروں گا ، پھر پرچہ دیکھوں گا ۔ اگر گنجائش ہوئی تو ضرور نمبر دوں گا ۔ لیکن مولانا روم رح کے قول کے مطابق لقمہ ہی دیا جا سکتا ہے ، حلق بنا کر نہیں دیا جا سکتا ۔ یونیورسٹی سے ہمارا جو معاہدہ ہے ، اس کی پابندی نہ ہو تو جو کچھ ملتا ہے ، وہ حلال نہ رہے ، حرام ہو جائے۔

شاہ صاحب مہذب ظرافت اور نکتہ سنجی میں بھی نظیر نہ رکھتے تھے ۔ اب میں چند لطائف عرض کروں گا ۔ جن سے آپ حضرات کو شاہ صاحب کی شگفتگیِ طبع کا اندازہ ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ اقبال کی خوش طبعی بھی حضرت شاہ صاحب ہی کے مزاج کی پیداوار تھی ۔

قادیان کے مولوی حکیم نور الدین جموں میں رہتے تھے اور اکثر شاہ صاحب سے ملنے کے لیے سیال کوٹ آ جایا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ شاہ صاحب اُن کی مشایعت کے لیے جا رہے تھے ۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں ۔ حکیم نور الدین نسبتاً فاروقی تھے اور شاہ صاحب سید ۔ حکیم صاحب نے کہا کہ یہ ہمارے ہی بزرگ کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے حضور سرور کائنات ص سے صاف کہ دیا کہ ''حسبنا کتاب اللہ'' ۔ اس پر شاہ صاحب نے چمک کر فرمایا کہ یہ قول بھی تو حضرت عمر رض ہی کا ہے کہ '' ولولا علی لھلک عمر'' (اگر علی نہ ہوتے تو عمر رض ہلاک ہو گیا ہوتا) ۔

ساگو چند ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھا جس کا رنگ بہت سیاہ تھا ۔ ایک دن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور بوندا باندی ہو رہی تھی ۔ شاہ صاحب سے ملتے ہی کہنے لگا ۔"دیکھیے موسم کتنا اچھا ہے"۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ آپ بھی تو کالی گھٹا بن کر آگئے ہیں !

اُس زمانے میں نائٹ سکول بھی ہوتے تھے جن میں بالغوں کو تعلیم دی جاتی تھی ۔ ایک موقع پر حروفِ ابجد تختۂ سیاہ پر لکھے گئے اور ایک شخص سے پوچھا گیا "لے بھائی لام بتا" تو اُس نے ق پر انگلی رکھ دی ۔ دوسرے سے پوچھا ، "تو میم بتا ۔ اُس نے ی پر انگلی رکھ دی ۔ شاہ صاحب نے فرمایا : "شاباش شاباش"۔ کسی نے پوچھا ، "حضرت یہ شاباش کا کون سا موقع ہے ؟" کہنے لگے :"انہیں کم از کم اتنا تو معلوم ہے کہ ل ۔ م ۔ ق اور ی ''حروف'' ہیں ۔"

ایک روز بازار گئے ۔ میوہ فروش کی دوکان سے گذرے ۔ اس نے کہا : "شاہ صاحب سردا بہت اچھا ہے ۔ لے لیجیے ۔" پوچھا "بھئی بھاؤ کیا ہے"۔ اس نے

کہا آٹھ آنے سیر ۔ پنجابی میں کہنے لگے " مردا تو اچھا ہے ، پر مینوں نہیں مردا ۔"

شاہ صاحب کے چچیرے بھائی حکیم حسام الدین ان سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے اور بڑے سخت مزاج اور درشت طبیعت تھے ۔ یہ احمدی ہو گئے تھے ۔ میر حسام الدین مرزا صاحب کی ایک دو کتابیں لے کر شاہ صاحب کے پاس گئے اور کچھ عبارتیں دکھا کر غصے میں بولے " کہو ، مسیح فوت ہوگیا یا نہیں ؟" شاہ صاحب نے کہا "فوت ہوگیا ہوگا ۔" میر حسام الدین کہنے لگے " پھر آئے گا ؟ " شاہ صاحب نے کہا "میر فیض اللہ* مر کر واپس آئے ہیں ؟" میر حسام الدین بے اختیار بولے " بے ایمان ، کافر ، منکرِ خدا و رسول " یہ کہتے ہوئے چلے گئے ۔ ایک دن میر حسام الدین اپنے مکان کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ شاہ صاحب آ گئے ۔ میر صاحب نے پوچھا " کون ؟" شاہ صاحب نے کہا " وہی بے ایمان ، کافر ، منکرِ خدا و رسول" ۔ میر حسام الدین نے یہ سنتے ہی جوشِ محبت سے گلے لگا لیا اور کہنے لگے : " بھیا ! تمھاری انہی باتوں نے تو ہمیں مار رکھا ہے" !

اس زمانے میں ایک شاعر منشی میراں بخش جلوہ سیال کوٹی تھے جو اکثر انجمنِ حمایتِ اسلام میں بھی آ کر نظمیں پڑھا کرتے تھے ۔ ذات کے قصاب تھے ۔ عرضی نویسی کرتے تھے ۔ خدا جانے کہاں سے شعر کہنے کی لت پڑ گئی ۔ شعر کیا تھے ، بس پکوڑے سے تل لیا کرتے تھے ۔ ان دنوں خزانے کے ایک کلرک اہلِ زبان تھے ۔ جلوہ صاحب ان کو اکثر شعر سنایا کرتے تھے ۔ ایک روز انھوں نے تنگ آ کر کہا " بھائی جلوہ تمھارے شعروں سے چھیچھڑوں کی بو آتی ہے ۔" جلوہ صاحب تاؤ کھا کر شاہ صاحب

*میر حسام الدین کے والد ۔

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو اپنے اشعار سنا کر پوچھا کہ یہ اشعار کیسے ہیں ۔ شاہ صاحب نے فرمایا : "سچ پوچھتے ہو تو تم نے شعروں کا جھٹکا کر دیا ہے ۔"

ایک دفعہ مولوی حکیم نورالدین نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ میری تحریروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ۔ مزاحاً کہنے لگے کہ آپ کا کیا ہے ۔ آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دیتے ۔ تشنہ چھوڑ جاتے ہیں ۔ پھر اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر پیش کیا اور کہا یہ میرے پاس آپ کا ایک خط ہے ۔ میں نے آپ سے دوا پوچھی ، آپ نے دوا لکھ بھیجی ، لیکن یہ نہ بتایا کہ اسے کھاؤں ، سونگھوں ، گھس کر لگاؤں ، گھوٹ کر پیوں ، کیا کروں ۔ نہ وزن لکھا کہ رتی کھاؤں ، ماشہ کھاؤں یا ایک من کھاؤں ۔ حکیم صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے ۔

ایک مرتبہ اقبال شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور سبق پڑھ رہے تھے ۔ ایک ہاتھ میں کتاب تھی ، دوسرے میں بٹیر ۔ شاہ صاحب نے پوچھا "کمبخت ! اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے" ڈاکٹر صاحب بے تکلف بولے : "حضرت ذرا پکڑ کر دیکھیے" ــــ شاہ صاحب ہنس دئے ۔

ایک دفعہ کسی نے ذکر کیا کہ بعض لوگ احمدیوں سے رشتہ کرنے کے لیے عارضی طور پر احمدی ہو جاتے ہیں اس لیے اب قادیان سے حکم آیا ہے کہ جب تک کوئی شخص احمدی ہو کر دو سال بطور احمدی بسر نہ کر لے ، اس کو لڑکی نہ دی جائے ۔ شاہ صاحب کہنے لگے : "احمدی نہ ہوا ہڑ کا مربّہ ہو گیا !"

مولوی ظفر اقبال بیان کرتے ہیں : ایک دفعہ شاہ صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا ۔ نماز کے بعد میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کا جوتا اٹھا لیا اور لے کر چلا کہ مسجد کے باہر ان کو پہنا دوں گا ۔ شاہ صاحب نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا "یہ جوتا میرا ہے" اور میرے ہاتھ سے جوتا چھین لیا ۔

سیال کوٹ میں ایک محلے کا نام کتوروں کا محلہ ہے ۔ شاہ صاحب نے

اس سے ایک لطیفہ پیدا کیا ۔ کہنے لگے ایک دفعہ باہر سے ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا :"کتّوں کا محلہ کون سا ہے ؟" جواب ملا :"یہاں کتّوں کا محلہ تو ہے نہیں ۔ البتہ ایک کتوروں کا محلہ ضرور ہے"۔ وہ بولا "میں کئی برس پہلے آیا تھا اور سنا تھا کہ یہاں کتوروں کا محلہ ہے ۔ میں سمجھا اب تو وہ کتورے یقیناً کتّے بن گئے ہوں گے !"

چرچ مشن والوں نے ایک مرتبہ ایک بہشتی کو نوکر رکھا ۔ ہندوؤں نے شور مچایا کہ مسلمان رکھا ہے تو ہندو بھی رکھا جائے ۔ شاہ صاحب نے سنا تو فرمایا "معاف فرمائیے ۔ ہندو بہشتی نہیں ہو سکتا ۔"

شاہ صاحب وقت کے بے حد پابند تھے ۔ ایک دفعہ کالج کی سٹاف میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے ۔ پرنسپل نے شاہ صاحب کو گھڑی دکھا کر کہا : "مولوی صاحب ! آپ نے پورے دو منٹ ہمیں انتظار کرایا" ۔ شاہ صاحب مسکرائے اور برجستہ فرمایا : "پھر کیا ہوا ؟ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس دنیا میں تمہارا کتنے برس انتظار کیا ہے ؟ " ۔ پرنسپل کی عمر اُس وقت ۴۵ سال تھی اور شاہ صاحب اس سے کوئی تیس برس بڑے تھے ۔

ابھی مشن کالج ڈگری کالج نہیں بنا تھا ۔ ینگسن صاحب پرنسپل تھے ۔ انھوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ کالج کے وقت سے پہلے مجھے عربی پڑھا دیا کیجیے ۔ شاہ صاحب ان کو عربی پڑھانے لگے ۔ چند ابتدائی سبق پڑھانے کے بعد عربی کی انجیل پڑھانے لگے ۔ صاحب بڑا لطیفہ باز تھا ۔ پڑھتے پڑھتے کہیں اذان کا لفظ آگیا تو بولا :"مولوی صاحب ایک بات پوچھتا ہوں ، خفا نہ ہونا ۔ یہ کیا بات ہے کہ آپ کے خدا کو جب تک پانچ مرتبہ نہ پکارا جائے ، وہ سنتا ہی نہیں"۔ شاہ صاحب نے کہا "جی ہاں ہمارا خدا ایسا نہیں کہ ہر آٹھویں دن ٹن ٹن کی آواز سن کر خوش ہو جائے"۔ اس کے بعد اذان کی حکمت اور اس کے معنی کچھ اس انداز سے سمجھائے کہ ینگسن بول اٹھا :"مولوی صاحب آپ گواہ رہیں ۔ میں آج سے مسلمان ہوتا ہوں ۔ لیکن مصلحت یہ ہے کہ اس امر کو اخفا میں رکھا جائے ۔"

جب کے ینگسن فوت ہوا اور شاہ صاحب اس کی کوٹھی پر پہنچے تو صاحب پس ماندگان نے کہا کہ صاحب کی وصیت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب میری میت پر آئیں اُس وقت ان کے ساتھ کوئی نہ ہو ۔ اس کے بعد جب آپ اجازت دیں تو میت اُٹھائی جائے ۔ چناں چہ شاہ صاحب اندر گئے ۔ اس کے لیے دعا کی اور پھر اجازت دے دی کہ میت کو دفن کر دیا جائے ۔

مولانا ابراہیم سیال کوٹی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کالج جاتے وقت ایک بی ٹائم پیس دوپٹے کے پلّو میں باندھ کر ساتھ لے جایا کرتے تھے ۔

ایک مرتبہ سر سید آئے تو گرمیوں کا موسم تھا ۔ لُو چل رہی تھی ۔ شاہ صاحب پاس بیٹھے تھے ۔ سر سید نے کہا کہ کیا یہی پنجاب ہے جسے انتخابِ ہفت کشور کہتے ہیں ؟ شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں اگر 'ہندوستان جنت نشان' ہے تو پنجاب ضرور "انتخابِ ہفت کشور" ہے ۔"

شاہ صاحب کو دال ، آم کا اچار اور کریلے بہت پسند تھے ۔ سفر کی حالت میں صرف کھچڑی کھاتے اور پُرتکلف کھانوں کو بالکل پسند نہ کرتے ۔

میر حامد شاہ حضرت صاحب کے چچیرے بھائی کے بیٹے تھے ۔ یہ احمدی ہو گئے تھے ۔ جب یہ حکم ہوا کہ احمدی غیر احمدی کا جنازہ نہ پڑھے تو کسی نے میر حامد شاہ سے پوچھا "کیا تم اپنے چچا میر حسن کا جنازہ بھی نہ پڑھوگے ؟" انھوں نے مسجد میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ اُٹھائے اور دعا کی الٰہی مجھے شاہ صاحب سے پہلے موت دے ۔ چناں چہ وہ پہلے فوت ہوئے ۔ جب جنازہ تیار ہوا تو شاہ صاحب نے کہا کہ آج ہمارے خاندان سے تقویٰ اور پرہیزگاری رخصت ہو گئی ۔ حامد شاہ میرے بھتیجے تھے ۔ ان کی ساری زندگی میرے سامنے ہے اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں نکل سکتی جس پر انگلی رکھی جا سکے ۔

علامہ اقبال کو سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک میرے اُستادِ محترم کو خطاب شمس العلما نہ دیا جائے گا ، میں کوئی

مرے کالج میر حسن میموریل

خطاب قبول نہ کروں گا ۔ گورنر پنجاب نے پوچھا : "کیا شاہ صاحب کی کوئی تصانیف بھی ہیں ؟" علامہ نے جواب دیا کہ ان کی تصنیف میں خود ہوں ۔

علامہ اقبال نے انگلستان جاتے ہوئے جو نظم حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر پڑھی ، اس میں جہاں اپنے والدین اور اپنے بڑے بھائی کا ذکر کیا ، وہاں شاہ صاحب کے متعلق کہا :

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمیں کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

آخری بیماری کے ایام میں شاہ صاحب کا ہندو شاگرد ہیمراج ملنے آیا ۔ وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھا ۔ اُس وقت شاہ صاحب کے صاحب زادے سید نقی شاہ اور سید ذکی شاہ پاس بیٹھے تھے ۔ ہیمراج کہنے لگا کہ علیحدگی میں بات کرنی ہے ۔ شاہ صاحب نے صاحب زادوں کو اٹھوا دیا ۔ تھوڑی دیر بعد جب ہیمراج چلا گیا تو شاہ صاحب نے صاحب زادوں کو بلا کر کہا کہ اس شخص کا خلوص دیکھو ۔ تین ہزار روپے لا کر میرے قدموں میں رکھ دئے اور کہا "شاید آپ کو اس بیماری میں تکلیف ہو ۔ میں نے یہ روپیہ آپ ہی کی برکت سے کمایا ہے ۔ آپ اس کو قبول کیجیے ۔" میں نے بہت کہہ سن کر روپیہ واپس کیا ۔

شاہ صاحب نے اپنے کفن دفن کے لیے سارا خرچ الگ کر کے بیٹوں کے حوالے کر دیا تھا ۔ اپنے بڑے صاحب زادے سید نقی شاہ کے تانگے میں کچھ مدت کالج جاتے رہے تھے ۔ اس کے کرائے کا حساب کر کے پیسہ پیسہ ادا کر دیا ۔ یعنی وفات سے پیشتر شاگرد اور دوست تو درکنار ان کے بیٹوں کی کوئی رقم بھی ان کے ذمے نہ تھی ۔ اس پر علامہ اقبال کا وہ قصہ مجھے یاد آگیا ۔ جاوید منزل کے سامنے کے تین کمرے علامہ نے اپنے بیٹے جاوید سے
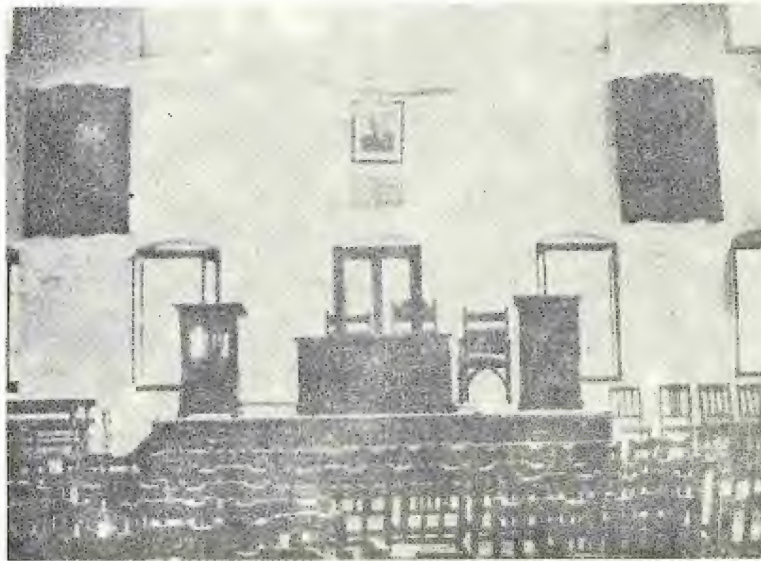
بعوض پچاس روپے ماہوار کرائے پر لے رکھے تھے اور کرائے کی تاریخ ۲۱ تھی - ہر ماہ کا کرایہ پیشگی جاوید کو ادا کر دیا کرتے تھے - خدا کی قدرت عین ۲۱ تاریخ کو انتقال ہوا - ایک دن کا کرایہ بھی چڑھنے نہ پایا -

شاہ صاحب کا ایک شاگرد بہاری لال عربی و فارسی میں ماہر تھا۔ کالج والوں نے تجویز کی کہ شاہ صاحب کی جگہ اس کو پروفیسر بنایا جائے - وہ بے حد ضرورت مند بھی تھا ، لیکن جب اس کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا "پرنسپل صاحب! میں بھوکا مر جاؤں گا لیکن اپنے استاد کی کرسی پر نہ بیٹھوں گا" یہ کہہ کر فوراً چلا گیا -

حضرت سید میر حسن شاہ صاحب ۱۸ اپریل ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے اور ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں سرخرو حاضر ہو گئے - علامہ اقبال نے مادۂ تاریخ نکالا : "ما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین" (۱۳۴۷ ھجری) اللہ تعالیٰ استاد اور شاگرد دونوں کو اعلیٰ علّیین میں جگہ دے ، اور ہم سب کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے - آمین!

ساتواں باب

تصانیفِ اقبال

یوں تو علامہ اقبال ہمارے لیے اتنا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ملّت کے قلوب میں سوز آرزو پیدا کرنے کے لیے صدیوں تک کام دے گا - لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر وہ چند سال اور تندرستی کے ساتھ زندہ رہ جاتے تو چند ایسی بے بہا تصانیف چھوڑ جاتے جو ملّت کے فکر کو صراطِ مستقیم پر لانے اور دینِ اسلام کے لازوال معارف کو دنیا کے سامنے روشن کرنے میں بڑا کام دیتیں - افسوس کہ اجل نے اتنی مہلت نہ دی ، ورنہ وہ تشکیلِ فقہِ جدید ، حاشیۂ قرآن مجید اور سفر نامۂ حجاز کی صورت میں ملّت کے لیے مزید ہدایات و رہنمائی کا سامان مہیّا کر دیتے - ان کے مقالات ، خطبات و بیانات بے شمار ہیں اور بعض کتابوں کی صورت میں منضبط بھی ہو چکے ہیں - ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ کتابیں چراغِ راہ کا کام دیتی رہیں گی * - ان کے خطوط کے چند مجموعے بھی موجود ہیں ، جن سے ان کے خیالات و افکار ، ان کی ذاتی اور قومی مصروفیتوں اور ان کے تعلقات و روابط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے † - جب علامہ لاہور میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد پروفیسر مقرر ہوئے ، اُن دنوں انھوں نے اکنامکس پر اردو میں ایک کتاب لکھی جو "علم الاقتصاد" کے نام سے شائع ہوئی - لیکن چوں کہ وہ ان کی ابتدائی کوشش تھی اور اس کے بعد اقتصادیات کے نظریات و اصطلاحات وغیرہ میں خاصے تغیرات ہو چکے ہیں ، اس لیے وہ اسے دوبارہ چھاپنے کے روادار نہ ہوئے ، بلکہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" کے عنوان سے انھوں نے جو مقالہ اپنی ڈاکٹریٹ کے لیے لکھا تھا ، اس

* مثلاً ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر - مضامینِ اقبال - حرفِ اقبال - خطباتِ اقبال - سپیچز اینڈ سٹیٹمنٹس آف اقبال اور چند منتشر مضامین مختلف رسالوں میں -

† مکاتیبِ اقبال شیخ عطاء اللہ - شاد اقبال - خطوطِ اقبال بنام جناح - کتاب عطیہ فیضی -

کا ترجمہ جب میر حسن الدین (حیدر آباد دکن) نے کیا تو انہیں بے حد تامل کے بعد اس کی اشاعت کی اجازت دی ، اور لکھا کہ ''یہ کتاب اٹھارہ سال قبل لکھی گئی تھی ۔ اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے ۔ جرمن زبان میں غزالی ، طوسی وغیرہ پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں ، جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں ۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ ہے ، جو تنقید کی زد سے بچ سکے''۔

ان سرسری اشارات کے بعد ہم علامہ کی مستقل تصانیف کا تعارف کرائیں گے جو چوتھائی صدی کے دوران میں دو دو چار چار سال کے وقفوں سے شائع ہوتی رہیں ، اور جن سے علامہ اقبال کے فکر کی عظمت کا غلغلہ چار دانگِ عالم میں بلند ہوا ۔

اسرارِ خودی

اس سے قبل لفظ ''خودی'' عام طور پر کبر و غرور کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا اور صرف فلسفہ و تصوف کی کتابوں میں ''نفس'' کے مفہوم پر دلالت کرتا تھا ، اور جس کو دبانے اور مغلوب کرنے پر روحانی ارتقا کی بنیاد رکھی جاتی تھی ۔ علامہ اقبال نے ۱۹۱۳ء کے جلسۂ انجمن حمایت اسلام میں اپنا فلسفۂ خودی پیش کیا اور بتایا کہ ''خودی'' کا حقیقی مفہوم انسان کا ''انا'' ہے ۔ اور ''یہ وحدت وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں'' ۔ اس کتاب کے مختصر سے دیباچے میں علامہ نے اس فلسفے کی تصریح کے لیے چند نکات درج کیے اور بتایا : ''میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی ہو''۔

رموزِ بیخودی

یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی ۔ جس طرح ''اسرارِ خودی'' میں فرد میں احساسِ نفس کے

نشو و نما کی طرف توجہ دلائی گئی تھی ، اسی طرح اس کتاب میں ''قومی وملی انا'' کے تسلسل کو محفوظ و قائم رکھنے کے رموز و اسرار بیان کیے گئے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ ''جس طرح حیات افراد میں جلبِ منفعت ، دفع مضرت ، تعینِ عمل و ذوق ، حقائقِ عالیہ ، احساسِ نفس کے تدریجی نشو و نما ، اس کے تسلسل ، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے ، اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر ''قومی انا'' کی حفاظت ، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے ۔ اور حیاتِ ملیہ کا کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے''۔ اس مثنوی میں علامہ نے ثابت کیا ہے کہ حیاتِ ملی کے لیے بہترین ضابطہ وہ ہے جو اسلام نے مہیا کیا ہے ۔ اور اصول اسلامی پر تبصرہ کر کے اس نظریے کو تقویت دی ہے کہ افراد ایک خاص حد تک انفرادی ''انا'' کو قائم و محفوظ رکھ کر اپنی انفرادیت کو ملت کی فلاح پر قربان کر دیں ۔

پیامِ مشرق

اس کتاب کی اشاعت ۱۹۲۲ء میں ہوئی ۔ دیباچہ حسبِ معمول علامہ نے خود لکھا اور اس میں المانوی ادبیات کی تحریک مشرق پر تبصرہ کر کے بتایا کہ ''پیامِ مشرق'' کی ترتیب کا محرک جرمنی کے حکیم حیات گوئٹے کا ''مغربی دیوان'' ہے ، جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ہائینا لکھتا ہے کہ یہ ایک گلدستہ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے . . . . اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے''۔ علامہ فرماتے ہیں کہ ''اس کتاب کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی ، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے''۔ آپ نے اپنے پیغام میں ثابت کیا ہے کہ مغرب کی مادیت جوش اور زندگی سے معرّا ہے، حالاں کہ

روحانیت کا درس حاصل کیے بغیر زندگی اعلیٰ مدارج پر فائز نہیں ہو سکتی۔

بانگِ درا

اگرچہ علامہ اقبال کی شہرت اردو کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی، لیکن اب تک اُن کی جو تین کتابیں شائع ہوئیں، وہ سب کی سب فارسی میں تھیں۔ ہر طرف سے تقاضا ہوا کہ اردو منظومات کا مجموعہ بھی جلد از جلد چھپنا چاہیے تاکہ اردو داں حضرات مستفید ہوں؛ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں علامہ نے ''بانگِ درا'' نام سے اردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا۔ اس کا دیباچہ سر عبدالقادر نے لکھا جس میں اپنے قدیم تعلقات کی وجہ سے علامہ کی شاعری کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا۔ اس مجموعے میں بعض ایسی طویل نظمیں شامل نہ کی گئیں جو انجمنِ حمایتِ اسلام میں پڑھی جا چکی تھیں، اور بعض کے اکثر حصے قلمزد کر دیئے گئے۔ ایک حصہ ظریفانہ کلام کا بھی شامل کیا گیا۔ اس کتاب سے علامہ اقبال کی رفتارِ فکر اور ان کی شاعری کے ارتقا کا اندازہ بوجہِ احسن کیا جا سکتا ہے۔

زبورِ عجم

یہ فارسی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے دو حصے ہیں، ایک حصے میں تو قطعات و غزلیات ہیں اور دوسرے حصے میں ''گلشنِ رازِ جدید''۔ گویا سید محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشن راز کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ جس میں نو سوال قائم کر کے ان کا جواب دیا گیا ہے اور ماورائیات کے بعض اہم مسائل کو علومِ جدیدہ کی روشنی میں حل کر کے عملی دنیا پر اس کا اثر ظاہر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مثنوی 'بندگی نامہ' ہے، جو گویا غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک مؤثر آواز ہے۔ غلامی پر عمومی اشارات کے اظہار کے بعد غلاموں اور محکوموں کے فنونِ لطیفہ پر تبصرہ کیا گیا ہے، اور مردانِ آزاد کے فنِ تعمیر سے روشناس کرایا گیا ہے۔ ''زبورِ عجم'' میں اقبال کی فارسی غزل عین الکمال کو پہنچ گئی ہے اور انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بلند سے بلند خیالات اور مؤثر سے مؤثر

تلقینات کے لیے بھی غزل سے زیادہ زور دار اور زندہ صنفِ سخن موجود نہیں۔

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ اُن چھ فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ ہے جو علامہ اقبال نے مدراس اور حیدر آباد میں ارشاد فرمائے۔ علم اور روحانی تجربات، روحانی تجربات کا فلسفیانہ معیار، ذاتِ واجب کا تصور اور حقیقت عادت، انائے انسانی اور جبر و اختیار، تمدن اسلامی کی روحیت، نظامِ اسلام میں روح حرکت (یعنی اجتہاد)۔ اس کتاب میں علامہ گویا ایک جدید اسلامی علمِ کلام کے بانی کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں۔ ان مسائل پر اسلام اور فلسفۂ جدید کے رو سے سیر حاصل بحث کر کے مفکرین زمانۂ حاضر کے لیے اسلام پر غور و فکر کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ان خطبات کا اُردو ترجمہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ معلوم ہوا ہے کہ سید نذیر نیازی ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ترجمہ ہونے کے بعد بھی اس کتاب کے دقیق مطالب اردو دانوں کی سمجھ میں آسانی سے نہ آ سکیں گے اور انھیں تدریس کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ شاعری کے علاوہ علامہ اقبال کے منظم فکر پر آگاہی حاصل کرنا ان خطبات کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔

جاوید نامہ

یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اٹلی کے مشہور شاعر دانتے نے اسلام کے عقیدۂ معراج اور نظریۂ جنت و دوزخ کا مطالعہ کر کے ایک طویل نظم ''ڈیوائن کامیڈی'' کے نام سے لکھی تھی۔ علامہ نے اس کا جواب لکھا ہے اور مولانا روم کی رہنمائی میں سیرِ افلاک کر کے مختلف منازل و ''طواسین'' طے کرتے ہوئے علامہ جمال الدین افغانی، سعید حلیم پاشا، مہدی سوڈانی، منصور حلاج، مرزا غالب، قرۃ العین، نیٹشے، سید علی ہمدانی، غنی کاشمیری، بھرتری ہری،

نادر شاہ، ٹیپو سلطان وغیرہ ہم سے ملاقات اور گفت گو کی ہے ۔ آخر میں ''خطاب بہ جاوید،، کے عنوان سے نژادِ نو کو درسِ عمل دیا ہے ۔ یہ کتاب حسنِ تخیّل، حسنِ ترتیب اور حسنِ بیان کے اعتبار سے علامہ کی بلند ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے ۔

بالِ جبریل

اس کتاب کی اشاعت ۱۹۳۵ء میں ہوئی ۔ اس میں رباعیات و قطعات، غزلیات اور چند منظومات جمع کی گئی ہیں ۔ مدتِ دراز کے بعد علامہ نے اردو شعر کی طرف دوبارہ توجہ مبذول کی تو ملک میں ''بالِ جبریل'' کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا ۔ یہ کتاب نقادانِ سخن کے نزدیک علامہ اقبال کی اردو شاعری کی معراج ہے ۔ اس کی تصنیف سے علامہ نے غزل کے دل فریب پیرائے میں وہ تمام حقائق و معارف اور تعلیمات و تلقینات بیان فرما دیں جو اس سے قبل متعدد فارسی تصانیف میں آچکی تھیں ۔ اس میں ملّت کو خلوص و ایقان پیدا کرنے، طلسمِ مغرب سے اجتناب کرنے اور مردِ مومن بننے کی مؤثر نصیحتیں کی ہیں ۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

۱۹۳۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی ۔ یہ فارسی کی مثنوی ہے ۔ اس میں پیر رومی اقبال کو نصیحت کرتے ہیں کہ تم اہلِ مشرق کو دین و سیاست کے معانی و مقاصد سمجھاؤ ۔ چناں چہ علامہ نے حکمتِ کلیمی اور حکمتِ فرعونی کے خصائص بتائے ہیں ۔ پھر توحید، فقر، حرّیت، شریعت و طریقت کے اسرار و رموز اور اتحادِ اقوام کے برکات سمجھائے ہیں ۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور مثنوی ''مسافر'' بھی شامل ہے جو سیاحتِ افغانستان کے متعلق کہی گئی ۔ اس میں بتایا ہے کہ شاعر پہلے اعلیٰ حضرت نادر شاہ شہید کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ پھر بابر، حکیم سنائی، سلطان محمود غزنوی کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوا ۔ قندھار میں خرقۂ مبارک کی زیارت کی، احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری دی ۔ ان تمام مواقع پر اسے جو

پیغامات ملے وہ دنیائے اسلام کو پہنچائے ہیں۔

ضربِ کلیم

یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں فکرِ رنگیں اور شعرِ ترکی خوبیاں کم اور حقائق و معارف کی جولانیاں زیادہ ہیں ۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور فلسفی اپنے فکر کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے، اور اب قلیل الفاظ میں کثیرالمعانی حقائق بیان کرنے پر قادر ہو چکا ہے ۔ اس کے مختلف حصے ہیں: اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات اور فنونِ لطیفہ، سیاسیاتِ مشرق و مغرب، محراب گل افغان کے افکار ۔ نہایت پیچیدہ مباحث پر اس قدر سلاست، سلجھاؤ اور سہولت سے اظہار خیال کرنا بے حد دشوار تھا ۔ لیکن علامہ اس سے خوب عہدہ بر آ ہوئے ہیں اور ''ضرب کلیم،، کے حقائق صرف ملّتِ اسلامیہ ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام و ملل کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں ۔ بقولِ علامہ ''ضربِ کلیم ایک اعلان جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام،،

ارمغانِ حجاز

یہ کتاب جو حضرتِ علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتّب کی، ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ ایک حصہ فارسی کلام پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں اردو کی چند نظمیں شامل ہیں۔ حضورِ حق، حضورِ رسالت، حضورِ ملّت، حضورِ عالمِ انسانی، بہ یارانِ طریق اس کتاب کے مختلف حصے ہیں ۔ اس کے اکثر قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عالمِ تصور میں حجاز کا سفر کر رہا ہے ۔ فکر کی گہرائی اور عشق کی شدت ان قطعات کی خصوصیت ہے ۔ اردو کی نظموں میں بھی زمانۂ حال کے انقلابات اور تحریکاتِ فکری پر فیصلہ کن تنقید کی گئی ہے ۔

ختم شد

پیغامات ملے وہ دنیائے اسلام کو پہنچائے ہیں۔

ضربِ کلیم

یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں فکرِ رنگیں اور شعرِ ترکی خوبیاں کم اور حقائق و معارف کی جولانیاں زیادہ ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور فلسفی اپنے فکر کی بلندیوں پر پہنچ چکا ہے، اور اب قلیل الفاظ میں کثیرالمعانی حقائق بیان کرنے پر قادر ہو چکا ہے۔ اس کے مختلف حصے ہیں: اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات اور فنونِ لطیفہ، سیاسیاتِ مشرق و مغرب، محراب گل افغان کے افکار۔ نہایت پیچیدہ مباحث پر اس قدر سلاست، سلجھاؤ اور سہولت سے اظہار خیال کرنا بے حد دشوار تھا۔ لیکن علامہ اس سے خوب عہدہ بر آ ہوئے ہیں اور ''ضرب کلیم'' کے حقائق صرف ملتِ اسلامیہ ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام و ملل کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ بقولِ علامہ ''ضربِ کلیم ایک اعلان جنگ ہے زمانۂ حاضر کے نام''

ارمغانِ حجاز

یہ کتاب جو حضرتِ علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کی، ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ ایک حصہ فارسی کلام پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں اردو کی چند نظمیں شامل ہیں۔ حضورِ حق، حضورِ رسالت، حضورِ ملت، حضورِ عالمِ انسانی، بہ یارانِ طریق اس کتاب کے مختلف حصے ہیں۔ اس کے اکثر قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عالمِ تصور میں حجاز کا سفر کر رہا ہے۔ فکر کی گہرائی اور عشق کی شدت ان قطعات کی خصوصیت ہے۔ اردو کی نظموں میں بھی زمانۂ حال کے انقلابات اور تحریکاتِ فکری پر فیصلہ کن تنقید کی گئی ہے۔

ختم شد